ساحل رحمت

(ماہ رمضان المبارک کے ہر روز کی دعاؤں کا ترجمہ اور شرح)

تالیف

سید عباس باقری نگری

بسم الله الرحمن الرحیم

کتاب کا تعارف

نام کتاب: ساحل رحمت (ماہ رمضان المبارک کے ہر روز کی دعاؤں کا ترجمہ اور شرح)

مؤلف: سید عباس باقری نگری

ناشر:

پہلا ایڈیشن:

تعداد:

شابک:

قیمت:

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ملنے کا پتہ:

امیل:

فون نمبر:

فہرست مطالب

مقدمہ مؤلف ۲۳
دعا ۲۴
دعا ہر مرض کی دوا اور ہر بلا کے لئے سپر ہے.......... ۲۶
دعا اور ماہِ رمضان ۲۶
دعاؤں کی سند سے متعلق کچھ مطالب.................. ۲۸
کچھ اس کتاب کے بارے میں ۲۹
قدردانی و تشکر ۳۰
پہلی تاریخ کی دعا.. ۳۱
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صِيامِى فِيهِ صِيامَ الصَّائِمِينَ" ۳۲
اقسام روزہ.. ۳۲
دوسرا فقرہ: "وَقِيامِى فِيهِ قِيامَ الْقائِمِينَ" ۳۵
عبادت کے دو اہم شرائط: ۳۶
نماز قبول ہونے کے شرائط: ۳۸
تیسرا فقرہ: "وَنَبِّهْنى فِيهِ عَنْ نَوْمَةِ الْغافِلِينَ" ۴۳
غفلت کے اسباب: ۴۴
غفلت کے منفی نتائج:.................................. ۴۷

غفلت سے بچنے کا طریقہ: ۴۹
چوتھا فقرہ: " وَهَبْ لِی جُرْمِی فِیهِ یَا إلهَ الْعالَمینَ.... " ۵۱
بخشش کے عوامل اور اسباب : ۵۴
دوسری تاریخ کی دعا ۵۷
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ قَرِّبْنی فِیهِ إلی مَرْضاتِكَ" ۵۸
رضائے الٰہی ۵۸
رضائے الٰہی سے قریب ہونے کے اسباب: ۵۸
رضایتِ الٰہی جاننے کا طریقہ ۶۱
دوسرا فقرہ: "وَجَنِّبْنی فِیهِ مِنْ سَخَطِكَ وَنَقِماتِكَ" ۶۴
تیسرا فقرہ: "وَفِّقْنی فِیهِ لِقِرائَةِ آیاتِكَ" ۶۷
تعلیم و تعلّمِ قرآن کی فضیلت........................ ۷۱
تلاوتِ قرآن، گناہوں کا کفارہ ہے ۷۳
قیامت کے دن قرآن کریم کی شکایت ۷۵
تلاوت کے آداب........................ ۷۸
تیسری تاریخ کی دعا:........................ ۸۱
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنی فِیهِ الذِّهْنَ وَالتَّنْبیهَ" ۸۲
رزق اور اس کی قسمیں ۸۲
دنیوی عطا........................۸۲
اُخروی عطا........................ ۸۳

نصیب اور قسمت.......... ۸۳
ذہن اور تنبیہ ۸۳
قوتِ حافظہ کی دعا ۸۴
ذہین و ہوشیار کون ہے؟.......... ۸۵
دوسرا فقرہ: "وَباعِدْنِی فِیهِ مِنَ السَّفاهَةِ وَالتَّمْوِیهِ" ۸۶
سفاہت اور تمویہ میں فرق ۸۷
قرآن و حدیث کی روشنی میں سفیہ و احمق کون ہے؟.......... ۸۷
تیسرا فقرہ: "وَاجْعَلْ لِی نَصِیباً مِنْ کُلِّ خَیْرٍ تُنْزِلُ فِیهِ" ۸۸
خیر و شر کے معنی و مفہوم ۸۸
چوتھی تاریخ کی دعا.......... ۹۶
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ قَوِّنِی فِیهِ عَلَی إقامَةِ أَمْرِكَ" ۹۷
دوسرا فقرہ: "أَذِقْنِی فِیهِ حَلاوَةَ ذِكْرِكَ" ۹۹
ذکر.......... ۹۹
ذکر کے اقسام و مدارج ۹۹
ذکر الٰہی آیات قرآنی کی روشنی میں ۱۰۲
ذکرالٰہی احادیث کی روشنی میں: ۱۰۴
ذکر الٰہی کی شیرینی ۱۰۵
تیسرا فقرہ: "وَأَوْزِعْنِی فِیهِ لِأَدَاءِ شُكْرِكَ بِكَرَمِكَ" ۱۰۸
شکر کے معنی و مفہوم: ۱۰۸

شکرِ خدا کی تعریف: ۱۰۹

شکر کے مراحل ۱۱۱

نماز، اظہارِ شکر کا اعلیٰ ترین مصداق ۱۱۳

شکر کی توفیق........................... ۱۱۳

شکر گذار باایمان ضعیفہ کی داستان........................... ۱۱۵

چوتھا فقرہ: "وَاحْفَظْنی فِیہِ بِحِفْظِكَ وَسَتْرِكَ یَا أَبْصَرَ النَّاظِرِینَ"....۱۱۷

پانچویں تاریخ کی دعا ۱۱۹

پہلا فقرہ:"اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنی فِیہِ مِنَ الْمُسْتَغْفِرِینَ" ۱۲۰

استغفار ۱۲۰

استغفار کے معنیٰ مولا علی علیہ السلام کے کلام کی روشنی میں: ۱۲۱

دوسرا فقرہ: "وَاجْعَلْنی فِیہِ مِنْ عِبادِكَ الصَّالِحِینَ الْقانِتِینَ" ۱۲۸

بندگانِ صالح کی عظمت ۱۲۹

تیسرا فقرہ: "وَاجْعَلْنی فِیہِ مِنْ أَوْلِیائِكَ الْمُقَرَّبِینَ...." ۱۳۰

ولیِّ خدا کی منزل ۱۳۲

حضرت سلمان اور اللہ سے دوستی کا اثر ۱۳۳

چھٹی تاریخ کی دعا ۱۳۵

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ لاَ تَخْذُلْنی فِیہِ لِتَعَرُّضِ مَعْصِیَتِكَ" ۱۳۶

معصیت اور اس کے اقسام: ۱۳۷

گناہ کے عواقب ونتائج: ۱۳۸

دوسرا فقرہ: "وَلاَ تَضْرِبْنِی بِسِیاطِ نَقِمَتِكَ" ۱۴۲
انتقام، قرآن کریم کی روشنی میں ۱۴۳
انتقام الٰہی کے اسباب ۱۴۴
تیسرا فقرہ: "وَزَحْزِحْنِی فِیهِ مِنْ مُوجِباتِ سَخَطِكَ..." ۱۴۵
غضب الٰہی کے اسباب ۱۴۵
قابلِ غور نکتہ ۱۴۶
ساتویں تاریخ کی دعا ۱۴۷
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ أَعِنّی فِیهِ عَلَی صِیامِهِ وَقِیامِهِ" ۱۴۸
آثارِ نماز، قرآن کریم کی روشنی میں: ۱۴۹
دوسرا فقرہ: "وَجَنِّبْنِی فِیهِ مِنْ هَفَواتِهِ وَآثامِهِ" ۱۵۱
ماہِ رمضان کا بہترین عمل ۱۵۱
ورع و تقویٰ کیا ہے ۱۵۲
تیسرا فقرہ: "وَارْزُقْنِی فِیهِ ذِكْرَكَ بِدَوامِهِ" ۱۵۴
ذکر الٰہی کے فوائد: ۱۵۵
آٹھویں تاریخ کی دعا ۱۵۷
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِی فِیهِ رَحْمَةَ الْاَیْتامِ" ۱۵۸
بزمِ رسالت اور یتیم ۱۵۸
قرآنِ کریم اور اکرامِ یتیم: ۱۵۹
یتیم نوازی کی فضیلت احادیث کی روشنی میں ۱۶۱

یتیم نوازی، سیرت معصومین کی علیہم السلام روشنی میں ۱۶۳
دوسرا فقرہ: "وَ إطْعامَ الطَّعامِ" ۱۶۴
تیسرا فقرہ:"وَ إفْشاءَ السَّلامِ" ۱۶۵
آدابِ سلام قرآن کریم کی روشنی میں ۱۶۶
کسے سلام نہ کریں؟ ۱۶۷
چوتھا فقرہ: "وَصُحْبَةَ الْكِرامِ" ۱۶۸
سلمان فارسی ۱۶۸
نویں تاریخ کی دعا ۱۷۱
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِی فِیهِ نَصِیباً مِنْ رَحْمَتِكَ الْواسِعَةِ" ۱۷۲
اقسامِ رحمت ۱۷۳
ماہِ رمضان، ماہ رحمتِ الٰہی ۱۷۵
دوسرا فقرہ: "وَاهْدِنِی فِیهِ لِبَراهِینِكَ السّاطِعَة" ۱۷۶
ہدایت کی اقسام: ۱۷۹
براہینِ ساطعہ سے کیا مراد ہے؟............................ ۱۸۰
خدا کی روشن دلیلوں کی جانب ہدایت ۱۸۱
تیسرا فقرہ: "وَخُذْ بِناصِیَتِی إلی مَرْضاتِكَ الْجامِعَةِ" ۱۸۳
مرضاتِ جامعہ سے مراد کیا ہے؟ ۱۸۴
دسویں تاریخ کی دعا...................................... ۱۸۶
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي فِیهِ مِنَ الْمُتَوَكِّلِینَ" ۱۸۷

توکل کے معنیٰ و مفہوم ۱۸۸

اطلاقِ توکل ۱۸۹

انسان کی زندگی میں اللہ پر توکل کا اثر............................ ۱۹۱

زاہدِ متوکل کا عبرت آموز واقعہ:............................ ۱۹۲

دوسرا فقرہ: "وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْفائِزِينَ لَدَيْكَ" ۱۹۵

سعادت اور کامیابی قرآن کریم کی روشنی میں: ۱۹۶

تیسرا فقرہ: "وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْمُقَرَّبينَ إلَيْكَ" ۱۹۸

واجبات کی انجام دہی اور محرمات سے پرہیز خدا سے قریب ہونے کا ذریعہ ۱۹۹

گیارہویں تاریخ کی دعا............................ ۲۰۱

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إلَيَّ فِيهِ الْاِحْسانَ" ۲۰۲

نیکی اور احسان قرآن کریم کے آئینہ میں: ۲۰۴

نیکی اور احسان امر الٰہی ہے: ۲۰۴

احسان (نیکی) اور عدل میں فرق: ۲۰۴

نیکی کی جزا سے متعلق ایک واقعہ ۲۰۵

نیکی اور احسان کے مصادیق ۲۰۷

نیکی اور احسان کے اچھے آثار و نتائج ۲۰۸

دوسرا فقرہ: "وَكَرِّهْ إلَيَّ فِيهِ الْفُسُوقَ وَالْعِصْيانَ" ۲۱۰

فسق کے مصادیق قرآن کریم کی روشنی: ۲۱۱

فسق اور عصیان میں فرق ۲۱۳

تیسرا فقرہ: "وَحَرِّمْ عَلَيَّ فِيهِ السَّخَطَ وَالنِّيرانَ" ۲۱۴
بارہویں تاریخ کی دعا **۲۱۶**
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ زَيِّنّي فِيهِ بِالسِّتْرِ وَالْعَفافِ" ۲۱۷
عفت کی قسمیں ۲۲۰
حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا عفت کا نمونہ ۲۲۲
عفت آیات و روایات کی روشنی میں ۲۲۲
صاحبانِ عفت کے اوصاف قرآن کریم کی روشنی میں: ۲۲۳
۲۔مالدار عفیف ۲۲۴
دوسرا فقرہ: "وَاسْتُرْنی فِيهِ بِلِباسِ الْقُنُوعِ وَالْكَفافِ" ۲۲۶
قناعت ۲۲۶
کفاف ۲۲۶
ہم کس طرح قانع بنیں؟ ۲۲۷
قناعت اور کفاف کے آثار و برکات ۲۲۸
حضرت ابوذر کی قناعت پسندی ۲۳۰
تیسرا فقرہ: "وَاحْمِلْنی فِيهِ عَلَى الْعَدْلِ وَالْاِنْصافِ" ۲۳۱
عدل و انصاف ۲۳۱
چوتھا فقرہ: "وَآمِنّي فِيهِ مِنْ كُلِّ ما أَخافُ بِعِصْمَتِكَ..." ۲۳۵
امن و امان................................ ۲۳۵
مولائے کائنات اور طلبِ امن و امان کی دعا ۲۳۵

تیرہویں تاریخ کی دعا ۲۳۷

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ طَھِّرْنی فِیهِ مِنَ الدَّنَسِ وَالْاَقْذارِ" ۲۳۸

طہارت کی دو قسمیں ۲۳۸

دنس اور قذر کے معنی ۲۳۹

دوسرا فقرہ: "وَصَبِّرْنی فِیهِ عَلَی کائِناتِ الْاَقْدارِ"............ ۲۴۱

قضا وقدر الٰہی.................................. ۲۴۱

صبر ۲۴۳

۱۔معصیت پر صبر ۲۴۵

۲۔اطاعت پر صبر ۲۴۶

۳۔مصیبت پر صبر........................ ۲۴۶

تیسرا فقرہ: "وَوَفِّقْنی فِیهِ لِلتُّقی وَصُحْبَةِ الْاَبْرارِ" ۲۴۷

تقویٰ کیا ہے؟ ۲۴۷

تقویٰ کے نتائج........................۲۴۹

نیک لوگوں کی ہمنشینی ۲۵۳

نیک لوگوں کی خصوصیتیں قرآن کریم کی روشنی میں ۲۵۴

۳۔اہلِ عبادت و اطاعت ۲۵۵

چودھویں تاریخ کی دعا........................ ۲۵۶

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ لاَ تُؤاخِذْنی فِیهِ بِالْعَثَراتِ" ۲۵۷

مقاماتِ لغزش ۲۵۸

دوسرا فقرہ: "وَأَقِلْنِی فِیهِ مِنَ الْخَطایا وَالْهَفَواتِ" ۲۵۹
اقالہ کے معنیٰ: ۲۵۹
تیسرا فقرہ: "وَلاَ تَجْعَلْنِی فِیهِ غَرَضاً لِلْبَلایا وَالأَفاتِ" ۲۶۱
پندرھویں تاریخ کی دعا ۲۶۴
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِی فِیهِ طاعَةَ الْخاشِعِینَ" ۲۶۴
خضوع و خشوع ۲۶۵
خضوع و خشوع اور اولیائے الٰہی ۲۶۶
نماز میں خضوع و خشوع ۲۶۷
آثارِ خشوع ۲۷۰
دوسرا فقرہ: "وَاشْرَحْ فِیهِ صَدْرِی بِإنابَةِ الْمُخْبِتِینَ" ۲۷۱
شرح صدر ۲۷۱
شرح صدر، آیات و روایات کی روشنی میں ۲۷۲
شرح صدر، خاصان خدا کی نشانی ۲۷۳
اِنابہ کیا ہے؟ ۲۷۴
"مُخبتین" کون ہیں؟ ۲۷۵
تواضع کی علامتیں ۲۷۶
امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے تواضع کی مثال ۲۷۷
سولھویں تاریخ کی دعا ۲۷۹
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِی فِیهِ لِمُوافَقَةِ الْأَبْرارِ" ۲۸۰

موافقت.. ۲۸۰
ابونصر بزنطی کا امام رضاؑ کی ہمراہی پر افتخار کرنا اور امام کی نصیحت ۲۸۱
ابرار کا مقام و منزلت قرآن کریم کی روشنی میں ۲۸۳
"بر" و نیکی کی برکاتیں ۲۸۴
ابرار (نیک افراد) کی نشانیاں ۲۸۴
دوسرا فقرہ: "وَجَنِّبْنِی فِیهِ مُرافَقَةَ الْاَشْرارِ" ۲۸۶
اشرار ۲۸۷
اشرار کی علامتیں ۲۸۸
اشرار سے دوستی کا نتیجہ ۲۸۹
تیسرا فقرہ: "وَآوِنی فِیهِ بِرَحْمَتِكَ إلی دارِ الْقَرارِ" ۲۹۱
سترہویں تاریخ کی دعا.................................. ۲۹۳
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ اهْدِنِی فِیهِ لِصالِحِ الْاَعْمالِ"...................۲۹۴
ہدایت اور اس کے اقسام ۲۹۴
عملِ صالح کا مفہوم ۲۹۶
عملِ صالح کے اثرات..................................۲۹۸
۳۔حیاتِ طیّبہ ۲۹۹
دوسرا فقرہ: "وَاقْضِ لِی فِیهِ الْحَوائِجَ وَالْآمالَ" ۳۰۰
تیسرا فقرہ: "یَا مَنْ لا یَحْتاجُ إلَی التَّفْسِیرِ وَالسُّؤالِ، یا عالِماً..." .. ۳۰۴
اٹھارویں تاریخ کی دعا ۳۰۶

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ نَبِّهْنی فِيهِ لِبَرَكاتِ أَسْحارِهِ" ۳۰۷
دوسر فقرہ: "وَنَوِّرْ فِيهِ قَلْبی بِضِياءِ أَنْوارِهِ" ۳۱۲
نور کی تفسیر ۳۱۲
قلب کی نورانیت ۳۱۵
قلب کی مختلف حالتیں قرآن اور احادیث کی روشنی میں ۳۱۷
تیسرا فقرہ: "وَخُذْ بِكُلِّ أَعْضائی إِلَى اتِّباعِ آثارِهِ" ۳۲۰
انیسویں تاریخ کی دعا ۳۲۳
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ وَفِّرْ فِيهِ حَظّی مِنْ بَرَكاتِهِ" ۳۲۴
الف: افرادِ بابرکت ۳۲۴
ب: بابرکت چیزیں ۳۲۶
دوسرا فقرہ: "وَسَهِّلْ سَبِيلی إِلى خَيْراتِهِ" ۳۲۹
خیر کی تعریف ۳۲۹
شبِ قدر، خیر وبرکت کی شب ۳۳۲
تیسرا فقرہ: "وَلاَ تَحْرِمْنی قَبُولَ حَسَناتِهِ" ۳۳۴
حسنات (نیکیاں) قبول ہونے کے شرائط ۳۳۶
بیسویں تاریخ کی دعا ۳۳۸
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لی فِيهِ أَبْوابَ الْجِنانِ" ۳۳۹
حصولِ جنت کے اسباب: ۳۴۰
دوسرا فقرہ: "وَأَغْلِقْ عَنّی فِيهِ أَبْوابَ النِّيرانِ" ۳۴۳

خود پر جہنم کے دروازوں کو بند کرنے کے اسباب ۳۴۵
دخول جہنم کے اسباب: ۳۴۷
تیسرا فقرہ: "وَوَفِّقْنی فِیهِ لِتِلاوَةِ الْقُرْآنِ، یا مُنْزِلَ السَّکِینَةِ..." ۳۴۸
اکیسویں تاریخ کی دعا ۳۵۴
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِی فِیهِ إلی مَرْضاتِكَ دَلِیلاً" ۳۵۵
دوسرا فقرہ: "وَلاَ تَجْعَلْ لِلشَّیْطانِ فِیهِ عَلَیَّ سَبِیلاً" ۳۵۷
شیطان کے لغوی اور اصطلاحی معنی ۳۵۷
شیطان کے صفات قرآن کریم کی روشنی میں ۳۵۹
شیطان کا انسان کے دل میں رسوخ کرنے کے اسباب ۳۶۳
وسوسۂ شیطان اور شیخ انصاریؒ ۳۶۵
شیطان سے مقابلہ کی راہیں ۳۶۷
تیسرا فقرہ: "وَاجْعَلِ الْجَنَّةَ لِی مَنْزِلاً وَمَقِیلاً" ۳۶۹
اہل جنت کے صفات ۳۷۰
حضرت یوسفؑ اور امام کاظم علیہ السلام کی داستان عصمت ۳۷۲
بائیسویں تاریخ کی دعا ۳۷۶
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِی فِیهِ أبْوابَ فَضْلِكَ" ۳۷۷
دوسرا فقرہ: "وَأنْزِلْ عَلَیَّ فِیهِ بَرَکاتِكَ" ۳۷۸
برکت کی تعریف ۳۷۸
تیسرا فقرہ: "وَوَفِّقْنی فِیهِ لِمُوجِباتِ مَرْضاتِكَ" ۳۸۰

توفیق کیا ہے؟ ۳۸۱
توفیق الٰہی امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث مبارک کی روشنی میں ۳۸۱
چوتھا فقرہ: "وَ أَسْكِنّي فِيهِ بُحْبُوحاتِ جَنَّاتِكَ" ۳۸۳
جنتی ہونے کے شرائط ۳۸۳
تیئسویں تاریخ کی دعا ۳۸۵
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ اغْسِلْنِي فِيهِ مِنَ الذُّنُوبِ" ۳۸۶
گناہ سے پاک ہونے کی راہیں ۳۸۶
دوسرا فقرہ: "وَطَهِّرْنِي فِيهِ مِنَ الْعُيُوبِ" ۳۸۹
تیسرا فقرہ: "وَامْتَحِنْ قَلْبِي فِيهِ بِتَقْوَى الْقُلُوبِ" ۳۹۱
مفہومِ تقویٰ ۳۹۱
قلب کا تقویٰ کیا ہے؟ ۳۹۲
چوبیسویں تاریخ کی دعا ۳۹۴
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ فِيهِ مَا يُرْضِيكَ" ۳۹۵
رضائے الٰہی امام محمد باقر علیہ السلام کی نظر میں ۳۹۵
رضائے الٰہی کا ادراک ۳۹۶
محبت اہلبیت علیہم السلام اور رضائے الٰہی ۳۹۷
دوسرا فقرہ: "وَأَعُوذُ بِكَ مِمَّا يُؤْذِيكَ" ۳۹۸
خدا کو اذیت پہونچانے سے مراد کیا ہے؟ ۳۹۸
تیسرا فقرہ: "وَأَسْأَلُكَ التَّوْفِيقَ فِيهِ لِأَنْ أُطِيعَكَ وَلَا أَعْصِيكَ" ۴۰۰

توفیق کیا ہے؟ ۴۰۰
پچیسویں تاریخ کی دعا ۴۰۲
پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنی فِیهِ مُحِبّاً لاَوْلِیائِكَ وَمُعادِیاً لاَعْدائِكَ" ۴۰۳
دوستی اور دشمنی کا معیار ۴۰۴
اہل بیت علیہم السلام اولیائے الٰہی کے واضح مصداق ۴۰۵
دوسرا فقرہ: "مُسْتَنّاً بِسُنَّةِ خاتَمِ اَنْبیائِكَ" ۴۰۶
تعریف سنت ۴۰۶
سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے حجت ہے؟ ۴۰۸
سنتِ معصومینؑ سنتِ رسولؐ ہے ۴۰۹
چھبیسویں تاریخ کی دعا ۴۱۱
پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ سَعْیِی فِیهِ مَشْكُوراً" ۴۱۲
سعی و کوشش ۴۱۲
سعی و کوشش قرآن کریم کی نگاہ میں ۴۱۳
اقسام شکر ۴۱۴
خدا اور بندہ کا شکر ۴۱۵
دوسرا فقرہ: "وَذَنْبِی فِیهِ مَغْفُوراً" ۴۱۶
غافر، غفّار اور غفور صرف خدا کی ذات ہے ۴۱۶
تیسرا فقرہ: "وَعَمَلِی فِیهِ مَقْبُولاً" ۴۱۸
اعمال قبول ہونے کے شرائط: ۴۱۸

چوتھا فقرہ: "وَعَیْبِی فِیهِ مَسْتُوراً" ۴۲۰
غفاریت، ستاریت کا سرچشمہ ۴۲۱
ستائیسویں تاریخ کی دعا ۴۲۳
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِی فِیهِ فَضْلَ لَیْلَةِ الْقَدْرِ" ۴۲۴
ستائیسویں تاریخ میں شبِ قدر کا تذکرہ کیوں؟ ۴۲۴
دوسرا فقرہ: "وَصَیِّرْ أُمُورِی فِیهِ مِنَ الْعُسْرِ إِلَی الْیُسْرِ" ۴۲۸
مصیبتوں اور سختیوں کے اسباب: ۴۲۸
سختیوں سے نکلنے کا واحد راستہ ۴۳۰
تیسرا فقرہ: "وَاقْبَلْ مَعاذِیری، وَحُطَّ عَنِّی الذَّنْبَ وَالْوِزْرَ" ۴۳۰
اٹھائیسویں تاریخ کی دعا ۴۳۲
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ وَفِّرْحَظِّی فِیهِ مِنَ النَّوافِلِ" ۴۳۳
نوافل سے مراد کیا ہے؟ ۴۳۳
قرآن کریم میں نوافل کا ذکر ۴۳۴
نماز شب کی فضیلت ۴۳۵
نماز شب اور عزت و شرافت ۴۳۷
نماز شب زینتِ آخرت ۴۳۸
دوسرا فقرہ "وَأَکْرِمْنِی فِیهِ بِإِحْضارِ الْمَسائِلِ" ۴۳۹
احضارِ مسائل ۴۳۹
تیسرا فقرہ: "وَقَرِّبْ فِیهِ وَسِیلَتِی إِلَیْكَ مِنْ بَیْنِ الْوَسائِلِ" ۴۴۰

وسیلہ کیا ہے؟ ۴۴۰
وسیلہ کے مصداق ۴۴۲
انتیسویں تاریخ کی دعا ۴۴۵
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ غَشِّنِی فِیهِ بِالرَّحْمَةِ" ۴۴۶
حصول رحمت کے شرائط: ۴۴۸
دوسرا فقرہ: "وَارْزُقْنِی فِیهِ التَّوْفِیقَ وَالْعِصْمَةَ" ۴۵۱
توفیق سے مراد کیا ہے؟ ۴۵۱
توفیق الٰہی کی کرشمہ سازی، استاد محسن قرائتی کی زبانی ۴۵۱
توفیقِ عصمت ۴۵۳
تیسرا فقرہ: "وَطَهِّرْ قَلْبِی مِنْ غَیاهِبِ التُّهَمَةِ" ۴۵۶
غیبت اور تہمت، امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث کی روشنی میں ۴۵۶
تیسویں تاریخ کی دعا ۴۵۸
پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صِیامِی فِیهِ بِالشُّكْرِ وَالْقَبُولِ...." ۴۵۹
عمل کے قبول ہونے کی شرطیں: ۴۶۱
وہ روزہ جس سے خدا و رسول راضی ہوں ۴۶۲
دوسرا فقرہ: "مُحْكَمَةً فُرُوعُهُ بِالأُصُولِ" ۴۶۲
محمد و آل محمد علیہم السلام کا حق کیا ہے؟ ۴۶۴
فہرست منابع ۴۶۷

مقدمہ مؤلف

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ الْحَمْدُ للهِ الَّذِي أَنزَلَ عَلَي عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجَا وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَي الرَّسُولِ الكَرِيمِ مُحَمّدٍ وَ آلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِين.

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾[1] ماہِ مبارک رمضان وہ مہینہ ہے جس میں اللہ نے اپنی کتاب قرآن کریم کو نازل فرمایا، یہی وہ برکتوں اور رحمتوں والا مہینہ ہے جو اللہ کے نزدیک تمام مہینوں سے افضل و برتر ہے، اس کے دن تمام دنوں سے افضل اور اس کی راتیں تمام راتوں سے بہتر ہیں۔ یہ مہینہ تمام مہینوں کا سردار ہے، روزہ کا وجوب، قرآن کریم کا نزول، لیلۃ القدر اور دیگر مناسبتیں اسی مہینہ سے متعلق ہیں۔

یہ مہینہ آتشِ جہنم سے نجات پانے کا مہینہ ہے۔ اس مہینہ میں جنت کے دروازے اللہ کے مخلص بندوں کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں اور اس مہینے میں ہر شب مُنادی یہ ندا دیتا ہے "هَل مِن تَائب؟ هَل مِن سَائل؟ هَل مِن مُستَغفِر"[2] "کیا کوئی توبہ کرنے والا ہے کیا کوئی سوال کرنے والا ہے؟ کیا کوئی استغفار کرنے والا ہے؟"

---

[1]۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۸۵.

[2]۔ من لایحضرہ الفقیہ، ج ۲، ص ۵۹.

ماہ رمضان، کردار سازی کے لئے بہترین مہینہ ہے جس میں انسان اپنی فکری اور عملی انحرافات سے کنارہ کشی کرکے اپنے ربِّ کریم کی بارگاہ میں لوٹ سکتا ہے اسی لئے اس مہینے کو ''ضیافت الٰہی'' کا مہینہ بھی کہا جاتا ہے۔اس مہینے میں ہمیں زیادہ سے زیادہ اطاعت و عبادتِ الٰہی میں مشغول رہنا اور معصیتِ خدا سے دور رہنا چاہیے اور ان چیزوں کے ذریعہ اس کی قربت اور رضایت کی تلاش کرتے رہنا چاہیے۔

اس مہینے میں دعا، مناجات، تلاوت قرآن، عبادات، تسبیح و تہلیل کا مزہ ہی کچھ اور ہے؛ کیونکہ یہ عبادت و اطاعت الٰہی کی بہار کا مہینہ ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"نَوْمُ الصَّائِمِ عِبَادَةٌ وَ نَفَسُهُ تَسْبِيحٌ"[۱]

''اس مہینے میں روزہ دار کا سونا عبادت ہے اور اس کا سانس لینا تسبیح ہے''

وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو اس مہینے میں روز و شب نماز، دعا، عبادت اور تلاوتِ قرآن وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں۔

دعا

دعا در حقیقت عبد و معبود کے درمیان رابطہ کا نام ہے جہاں ایک عاجز اور مجبور بندہ اپنے قادر اور بے نیاز معبود حقیقی کے سامنے اپنی حاجتوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ناچیز ہونے کا بھی اقرار کرتا ہے۔ خداوند عالم نے قرآن مجید میں متعدد مقامات

۱۔ کافی، ج ۴، ص ۶۴.

پر اپنے بندہ کو دعا کرنے کی جانب ترغیب دلائی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾[1] ”مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کردوں گا“

قرآن مجید اور احادیث میں بعض نبیوں کی دعاؤں کا ذکر ہے، جب بھی انھیں کوئی حاجت یا مشکل پیش آتی تو وہ دعا کا سہارا لیتے تھے۔ قرآن کریم میں حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں کا ذکر ہے جنھوں نے اللہ کی اطاعت اور تبلیغ دین کے علاوہ خداوند کریم کی بارگاہ میں دعا، مناجات اور اللہ سے راز و نیاز کو اپنا وظیفہ بنالیا تھا۔ اس کے علاوہ معصومین علیہم السلام کی احادیث میں بھی دعا پر خاص توجہ دی گئی ہے، رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"أَفْضَلُ الْعِبَادَةِ الدُّعَاءُ وَ إِذَا أَذِنَ اللَّهُ لِعَبْدٍ فِي الدُّعَاءِ فَتَحَ لَهُ أَبْوَابَ الرَّحْمَةِ إِنَّهُ لَنْ يَهْلِكَ مَعَ الدُّعَاءِ أَحَدٌ".[2]

”بہترین عبادت، دعا ہے اور جب خداوند کریم کسی کو دعا کی توفیق دیتا ہے تو اُس پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے اور کوئی بھی دعا کرنے والا کبھی ہلاک نہیں ہو سکتا“

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ فِي الْأَرْضِ الدُّعَاءُ"[3]

”خداوند عالم کے نزدیک روئے زمین پر سب سے پسندیدہ عمل دعا ہے“

---

[1]۔ سورۂ غافر، آیت ۶۰.

[2]۔ وسائل الشیعہ: ج ۲، ص ۳۱.

[3]۔ کافی، ج ۲، ص ۴۶۷.

دعا ہر مرض کی دوا اور ہر بلا کے لئے سپر ہے

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

" عَلَيْكُمْ بِالدُّعَاءِ فَإِنَّهُ شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ دَاءٍ".[۱]

”دعا کرو؛ کیونکہ دعا ہر مرض کی شفا ہے“

دعا ہر مرض کی دوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مرض خواہ جسمانی ہو یا روحانی، ظاہری ہو یا باطنی، ہر بلا و مصیبت اور ہر مرض کے لئے دعا، شفا اور سپر ہے۔ دعا ہی سے نعمتوں کا نزول ہوتا ہے اور بلائیں دور ہوتی ہیں۔ ایک مقام پر خود امام جعفر صادق علیہ السلام اس طرح دعا فرماتے ہیں:

"اللّهُمَّ اشْفِنِي بِشِفَائِكَ وَ دَاوِنِي بِدَوَائِكَ وَ عَافِنِي مِنْ بَلَائِكَ...."[۲]

”بارِ الٰہا! تو مجھے اپنی مخصوص شفا کے ذریعے شفا عنایت فرما، اپنی دوا کے ذریعہ میرا علاج فرما اور مجھے ہر بلا و مصیبت سے نجات عطا فرما“

اُن کے علاوہ معصومین علیہم السلام سے بے شمار احادیث ہیں جن میں دعا کی فضیلت اور اہمیت کا ذکر ہے۔

دعا اور ماہِ رمضان

یوں تو دعا کرنے کا کوئی خاص وقت معین نہیں ہے، انسان جب چاہے اپنے خدا سے راز و نیاز کر سکتا ہے اور اپنی حاجت کو اس کی بارگاہ میں بیان کر سکتا ہے؛ کیونکہ وہ

۱۔ بحار الانوار، ج ۹۰، ص ۳۱۲.

۲۔ کافی، ج ۲، ص ۵۶۵.

ہمیشہ ہمارے ساتھ ہے، بلکہ وہ ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ جیسا کہ وہ خود قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾[۱]

"ہم اُس سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں"

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾[۲]

"اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی رہو وہ تمہارے اعمال پر ناظر ہے"

مذکورہ آیتوں سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ خدا سے رابطہ قائم کرنے اور اُس سے دعا مانگنے کے لئے کسی خاص وقت یا خاص جگہ کی کوئی قید نہیں ہے مگر بعض احادیث سے ثابت ہے کہ کچھ خاص اوقات اور خاص مقامات ایسے ہیں جن میں دعا کرنے کی بہت زیادہ تاکید ہے؛ کیونکہ اُن خاص اوقات اور خاص مقامات پر دعائیں جلد مستجاب ہوتی ہیں۔ اُن خاص مقات میں سے مسجد الحرام، خانۂ کعبہ کے قریب، مسجد نبوی، ائمہ معصومین علیہم السلام کے قبور مطہرہ اور دیگر مقامات ہیں اور اسی طرح اُن خاص اوقات میں سے واجب نمازوں کے بعد، شب جمعہ، روزِ جمعہ وغیرہ ہیں اور اسی طرح ماہِ مبارک رمضان میں بھی دعاؤں کی خاص تاکید کی گئی ہے۔ احادیث معصومین علیہم السلام میں ماہِ رمضان کو دعاؤں کے مستجاب ہونے کا مہینہ قرار دیا گیا ہے؛ کیونکہ یہ رحمت و مغفرت کا مہینہ ہے، لہٰذا اس مہینے سے متعلق صبح و شام کی دعاؤں کا

۱۔ سورۂ ق، آیت ۱۶.

۲۔ سورۂ حدید، آیت ۴.

ذکر دعاؤں کی مختلف کتابوں میں موجود ہے۔ اگر انسان اِن دعاؤں کو ترجمہ اور شرح کے ساتھ پڑھے تو اس کا مزہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

دعاؤں کی سند سے متعلق کچھ مطالب

ماہِ رمضان میں پڑھی جانے ولی اکثر دعائیں شیخ طوسیؒ کی "مصباح المتہجد" کفعمیؒ کی "المصباح"، سید ابن طاؤسؒ کی "اقبال الاعمال" شیخ عباس قمیؒ کی "مفاتیح الجنان" اور دیگر دعاؤں کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس کتاب میں ذکر ہونے والی ماہ رمضان کی ہر دن سے مخصوص دعاؤں کا ذکر بھی سید ابن طاؤس نے اپنی کتاب "اقبال الاعمال" میں کیا ہے اور ابن طاؤسؒ کی یہ کتاب اہل علم کے درمیان خاص اہمیت کی حامل ہے اسی لئے ابن طاؤس کے بعد کے علماء نے اِن دعاؤں کو اپنی اپنی کتابوں میں "اقبال الاعمال" ہی سے نقل کیا ہے، اگرچہ اِن دعاؤں کو سید ابن طاؤسؒ کا اپنی کتاب میں ذکر کرنا خود اپنی جگہ اِن دعاؤں کے معتبر ہونے کے لئے کافی ہے، اس کے باوجود ان دعاؤں کے معتبر اور مستند ہونے پر کسی معصومؑ سے کوئی روایت یا کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ لیکن دعاؤں کے جملوں کی ساخت اور اُن میں موجود بلند و بالا مفاہیم اور اعلیٰ مطالب سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ بہت ممکن ہے کہ یہ دعائیں کسی نہ کسی معصومؑ ہی کی تعلیم دی ہوئی ہے؛ کیونکہ مختلف عبارتوں میں موجود اکثر مطالب اور مفاہیم، معصومین علیہم السلام کی احادیث میں بھی موجود ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے فقہائے عظام نے معصومین علیہم السلام کی بعض احادیث کی روشنی میں "اخبار من بلغ" کے عنوان سے ایک فقہی قاعدہ قائم کیا ہے، اس قاعدہ

کی روشنی میں اللہ سے قربت اور ثواب حاصل کرنے کی نیت سے اُن تمام زیارتوں اور دعاؤں کا پڑھنا مستحب ہے جو معتبر کتابوں میں مذکور ہیں اس شرط کے ساتھ کہ ان کی مخالفت میں کوئی خاص دلیل موجود نہ ہو۔

ماہِ رمضان کی ہر دن سے مخصوص ان دعاؤں میں وہ بلند و بالا معارف اور اعلیٰ مفاہیم پوشیدہ ہیں جن کی شرح آیات اور احادیث کی روشنی میں کی جاسکتی ہے اور اِن دعاؤں کے ہمراہ ان کی شرح کا جاننا نہ صرف روح و دل کے لئے لذت بخش ہے، بلکہ اس کے سایہ میں بندۂ مومن اسلامی معارف سے آشنائی کے ساتھ ساتھ اپنے کردار کو آراستہ کرکے آخرت کے لئے نجات کی راہ ہموار کرسکتا ہے۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

گذشتہ چند سال پہلے ماہِ مبارک رمضان میں اپنے وطن عزیز نگرم میں اسلامی دروس کا انعقاد کیا تھا جن میں ہر روز کی مخصوص دعا پڑھ کر اس کی مختصر شرح کرتا رہا، جب احباب سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے اُس شرح کو تحریری قالب میں ڈھالنے کا مشورہ دیا اور جب اس بات پر اصرار بڑھا تو میں بھی سنجیدگی سے سوچنے لگا بالآخر قلم کو جنبش دی اور خدا کی توفیق و عنایت سے لکھنے میں مشغول ہوگیا اور اسے زیور تحریر سے آراستہ کرنے کے لئے میں نے مختلف فارسی شرحوں سے بھی استفادہ کیا جن میں قابل ذکر ''زمزمۂ روزہ داران'' مؤلف: روح اللہ بیدارم، ''احیاء دل'' مؤلف علی نریمانی، ''صبح رضوان'' مولف ذبیح اللہ آخوندی اور دیگر کتابیں ہیں

امید ہے کہ بہت ہی سادہ اور عام فہم زبان میں میری یہ کوشش عوام اور خواص دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگی بالخصوص محترم مبلّغین، ماہ مبارک رمضان میں مجالس اور دورس کے لئے اس کتاب کے مطالب سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ پوری احتیاط کے باوجود ممکن ہے کہ اس کتاب میں کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو۔ امید ہے کہ محترم قارئین اس سے صرف نظر فرماتے ہوئے ناچیز کو غلطیوں سے آگاہ اور اپنے مفید مشوروں سے مستفید فرمائیں گے۔

قدردانی وتشکر

میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ میں اُن تمام حضرات کا فرداً فرداً شکریہ ادا کروں جنھوں نے اس کتاب کی ابتداء سے لیکر زیورِ طبع سے آراستہ ہونے تک میری ہر ممکن مدد کی ہے۔ خداوند کریم ان تمام حضرات کی توفیقات میں اضافہ فرمائے بالخصوص حجۃالاسلام والمسلمین مولانا اخلاق حسین پکھناوری صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود، حقیر کی خواہش پر اس کتاب کی تصحیح اور نظر ثانی فرمائی، بارگاہِ ربّ العزت میں دعا گو ہوں کہ موصوف کو صحت وسلامتی عطا کرے۔ اور اسی طرح حجۃالاسلام والمسلمین مولانا رجب علی حیدری مظفرنگری صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے حُسنِ سلیقہ سے کتاب کی کمپوزنگ اور تزئین فرمائی۔

السعی منّا والتوفیق من اللہ

والسلام

سید عباس باقری نگری

۱۳رجب المرجب ۱۴۳۷ھ ق

پہلی تاریخ کی دعا

«اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ صِیامِی فِیهِ صِیامَ الصَّائِمِینَ وَقِیامِی فِیهِ قِیامَ الْقائِمِینَ وَنَبِّھْنِی فِیهِ عَنْ نَوْمَةِ الْغافِلِینَ، وَھَبْ لِی جُرْمِی فِیهِ یَا إِلٰهَ الْعالَمِینَ، وَاعْفُ عَنِّی یَا عافِیاً عَنِ الْمُجْرِمِینَ».

”اے الٰہا! اس ماہ میں میرے روزہ کو (حقیقی) روزہ داروں کے روزہ کی طرح قرار دے اور میری نماز کو (حقیقی) نماز گزاروں کی نماز کی طرح قرار دے اور مجھ کو آج کے دن غفلت کی نیند سے بیدار کر دے اور میری خطاؤں کو بخش دے اے عالمین کے معبود اور مجھ کو معاف کر دے اے مجرموں اور گناہگاروں کو معاف کرنے والے“

اہم مطالب:

آج کے دن کی اس دعا میں چار اہم چیزوں کی درخواست کی گئی ہے:

۱۔ حقیقی روزہ داروں کا روزہ

۲۔ حقیقی نماز گذاروں کی نماز

۳۔ خوابِ غفلت سے بیداری

۴۔ جرائم اور گناہوں سے عفو و بخشش

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ صِیامِی فِیهِ صِیامَ الصَّائِمِینَ"

عربی میں روزہ کو ”صوم“ کہتے ہیں اور اس کی جمع ”صیام“ ہے جس کے لغوی معنیٰ ”ہر چیز سے پرہیز کرنے“ کے ہیں[1] مگر فقہی اصطلاح میں خوشنودی اور قربتِ الٰہی کی نیت کے ساتھ طلوعِ فجر کے وقت سے لے کر اذانِ مغرب تک ان تمام چیزوں سے پرہیز کرنا ہے جن سے روزہ باطل ہو جاتا ہے۔

اقسام روزہ

روزہ کی تین قسم ہیں:

۱۔ عام روزہ ۲۔ خاص روزہ ۳۔ خاص الخاص روزہ

۱۔ عام روزہ

یہ وہی عمومی روزہ ہے جس میں روزہ دار روزہ کی نیت کے ساتھ صرف روزہ کو باطل کرنے والی چیزوں سے اجتناب کرتا ہے، اس روزہ کو حقیقی روزہ نہیں، بلکہ ظاہری روزہ کہتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُوعُ وَ الظَّمَأُ.[2]

”بہت سے ایسے روزہ دار ہیں جن کا روزہ سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ نہیں“

۱۔ مفردات راغب، ص۵۰۰۔

۲۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۵۔

۲۔ خاص روزہ

جس میں روزہ دار عام روزہ کے تمام شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے تمام اعضاء وجوارح کا بھی روزہ رکھتا ہے یعنی آنکھ، کان، زبان اور تمام اعضائے بدن کو گناہوں سے محفوظ رکھے، نہ غیبت کرے، نہ جھوٹ بولے، نہ زبان سے کسی کو تکلیف پہنچائے اور نہ غیبت سنے غرض کہ اپنے تمام اعضائے بدن کو محرّمات سے محفوظ رکھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

إِذَا صُمْتَ فَلْيَصُمْ سَمْعُكَ وَ بَصَرُكَ وَ شَعْرُكَ وَ جِلْدُكَ وَ عَدَّدَ أَشْيَاءَ غَيْرَ هَذَا وَ قَالَ لَا يَكُونُ يَوْمُ صَوْمِكَ كَيَوْمِ فِطْرِكَ.[۱]

"جب تم روزہ رکھو تو تمہارے کان، آنکھ، بال، پوست اور ان کے علاوہ دیگر اعضاء بھی روزہ رکھیں اور خبر دار کہیں تمہارا روزِ صیام روزِ افطار کی طرح نہ ہو جائے"

۳۔ خاص الخاص روزہ

جس میں روزہ دار، روزۂ عام اور روزۂ خاص کے شرائط کے ساتھ ساتھ قلب و دل کا بھی روزہ رکھے یعنی روزہ دار کا دل صرف اور صرف خدا کے لئے خالص ہو، دنیا کی ہر چیز سے قطعِ تعلق کرتے ہوئے ہر کام کو صرف اور صرف خدا کی خوشنودی کے لئے انجام دے۔

۱۔ کافی، ج۴، ص۸۷.

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلْقَلْبُ حَرَمُ اللّٰهِ فَلَا تُسْكِنْ حَرَمَ اللّٰهِ غَيْرَ اللّٰهِ.[۱]

"قلب، خدا کا حرم ہے لہٰذا اس میں خدا کے علاوہ کسی اور کو جگہ نہ دو"

حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

صَوْمُ الْقَلْبِ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ اللِّسَانِ وَ صَوْمُ اللِّسَانِ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ الْبَطْنِ.[۲]

"قلب کا روزہ زبان کے روزے سے بہتر ہے اور زبان کا روزہ پیٹ کے روزے سے بہتر ہے"

روزۂ خاص الخاص ہی حقیقی روزہ ہے اور بندہ مذکورہ دعا میں اسی روزہ کی درخواست کررہا ہے جو تزکیہ و تہذیبِ نفس کے لئے بہترین اور بلند ترین عبادت ہے اور اسی روزہ کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آتشِ جہنم کے لئے سپر قرار دیا ہے، چنانچہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ مِنَ النَّارِ[۳]

"روزہ آتش جہنم کے لئے سپر ہے"

اور یہی وہ روزہ ہے جس کا ہدف اور نتیجہ تقوا و پرہیزگاری ہے جیسا کہ خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

۱۔ بحارالانوار، ج۷۰، ص۲۵.

۲۔ غرر الحکم، حرف صاد، ص۴۲۳.

۳۔ بحارالانوار، ج۹۶، ص۲۹۳.

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَي الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾[۱]

''اے ایمان والو! تم پر روزے اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کئے گئے ہیں تاکہ تم تقوااختیار کرو''

اور اسی روزے کے لئے خالق کائنات حدیثِ قدسی میں ارشاد فرماتا ہے:

الصَّوْمُ لِي، وَ أَنَا أَجْزِي عَلَيْهِ.[۲]

''روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا''

مذکورہ احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ حقیقی روزہ ہی بندہ کو خدا سے قریب کرتا ہے۔ ماہِ رمضان کی پہلی تاریخ ہی میں بندہ اپنے رب کریم کی بارگاہ میں مذکورہ دعا کی شکل میں یہ عہد کرے کہ بارالٰہا! میں حقیقی روزہ داروں کے روزہ کی طرح روزہ رکھنا چاہتا ہوں اور تو مجھے اس عمل کے لئے توفیق واستقامت عطافرما، حقیقی روزہ داروں کے روشن مصداق اہل بیت علیہم السلام کی ذوات مقدسہ ہیں لہٰذا ہمیں طرزِ بندگی میں ان کی پیروی کرنی چاہیے۔

دوسرا فقرہ: "وَقِيَامِی فِيهِ قِيَامَ الْقَائِمِينَ"

دعا کے اس فقرے میں قیام سے مراد نماز ہے۔ روزہ کی طرح نماز کی بھی تین قسمیں ہیں:

۱۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۳.

۲۔ من لایحضرہ الفقیہ، باب الصیام، وسائل الشیعہ، ج۷، ص ۲۲۳.

۱۔ نمازِ عام ۲۔ نمازِ خاص ۳۔ نماز خاص الخاص

حقیقی نماز وہی نمازِ خاص الخاص ہے جس میں نماز گزار تمام ظاہری شرائط کے ساتھ ساتھ قلبی طور سے خود کو خدا کی بارگاہ میں پاتا ہے اور دل کی آنکھوں سے اپنے خالق کا مشاہدہ کرتا ہے، جب نماز اس کیفیت کی حامل ہو تو وہ ﴿الصَّلاَةَ تَنْهَي عَنْ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾[1] (نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکتی ہے) کا مصداق بن جاتی ہے، ورنہ بہت سے ایسے نمازی ہیں جو پابندی سے نماز تو پڑھتے ہیں اور برائیوں میں بھی ملوث رہتے ہیں ان کی نماز ظاہری شرائط کے ساتھ تو ادا ہو جاتی ہے مگر حقیقی شرائط سے خالی رہتی ہے۔

یہ بات صرف نماز اور روزہ ہی سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر عبادت کا یہی حال ہے کوئی بھی عبادت ہو جب تک اس میں معنویت نہ ہو وہ عبادت حقیقی عبادت نہیں ہو سکتی، عبادت کے حقیقی ہونے کے لئے ظاہری شرائط کے ساتھ اس کے باطنی اور حقیقی شرائط کا بھی پایا جانا ضروری ہے۔

عبادت کے دو اہم شرائط:

وہی شخص حقیقی عبادت گذار ہے جس میں یہ دونوں شرطیں پائی جاتی ہیں:

۱۔ شرطِ صحت ۲۔ شرط قبولیت

---

[1] سورۂ عنکبوت، آیت ۴۰.

۱۔ شرط صحت

یعنی عبادت کے تمام اجزاء و شرائط کا بغیر کسی کمی اور زیادتی کے پایا جانا اور صحیح طریقہ سے اس کو انجام دینا ہے۔

۲۔ شرطِ قبولیت

عبادت کو قبول کرنا اللہ کے اختیار میں ہے اور قبولیت کی ضمانت، عبادت گزار کے ایمان، اخلاص، تقویٰ اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی ولایت سے وابستہ ہے لہٰذا بندہ پر عبادت کی قبولیت کے عام شرائط کو فراہم کرنا ضروری ہے اور خصوصی طور پر نماز کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ تمام عبادتوں کی قبولیت کی ضمانت اس کے قبول ہونے پر ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"إِنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ الصَّلَاةُ فَإِنْ قُبِلَتْ قُبِلَ مَا سِوَاهَا"[1]

"(روز قیامت) بندے سے نماز کے بارے میں محاسبہ کیا جائے گا، اگر نماز قبول ہو گی تو دوسرے اعمال بھی قبول کر لئے جائیں گے"

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

أَوَّلُ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ عَلَى الصَّلَاةِ فَإِذَا قُبِلَتْ قُبِلَ مِنْهُ سَائِرُ عَمَلِهِ وَ إِذَا رُدَّتْ عَلَيْهِ رُدَّ عَلَيْهِ سَائِرُ عَمَلِهِ.[2]

---

[1]۔ تہذیب الاسلام، ج۲، ص۲۳۹.

[2]۔ شیخ صدوقؒ، من لایحضرہ الفقیہ، ج۱، ص۲۰۸.

”(روز قیامت) بندہ سے سب سے پہلے نماز کے بارے میں محاسبہ کیا جائے گا، اگر نماز قبول ہو گی تو دوسرے اعمال بھی قبول کر لئے جائیں گے، اگر نماز رد کر دی گئی تو دوسرے اعمال بھی رد کر دیئے جائیں گے“

نماز قبول ہونے کے شرائط:

جیسا کہ ابھی اجمالی طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ نماز کی قبولیت، نماز گزار کے ایمان، اخلاص و.... سے وابستہ ہے یہاں پر ہم آیات و روایات کی روشنی میں چند شرائط ذکر رہے ہیں جو بارگاہ الٰہی میں نماز کے قبول ہونے کے لئے ضروری ہیں:

ا۔ایمان

جب تک نماز ایمان کے ساتھ ادا نہ ہو اس وقت تک اس کا بارگاہ خداوندی میں قبول ہونا ناممکن ہے اگر نماز گزار خدا، رسول، قیامت وغیرہ پر ایمان نہیں رکھتا ہے تو اس کی نماز، نماز ہی نہیں ہے اور ہر عبادت کی صحت کی پہلی شرط ایمان ہے۔

﴿إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللهِ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلاَةَ﴾[۱]

”اللہ کی مسجدوں کو صرف (اور صرف) وہ لوگ تعمیر کرتے ہیں جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جنھوں نے نماز قائم کی ہے“

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

۱۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۸.

إِنَّ أَفْضَلَ مَا تَوَسَّلَ بِهِ الْمُتَوَسِّلُونَ إِلَى اللَّهِ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى الْإِيمَانُ بِهِ وَ بِرَسُولِهِ.....وَ إِقَامُ الصَّلَاة[1]

"بیشک سب سے زیادہ بافضیلت شیٔ جس کے ذریعہ خدا سے متوسل ہونے والے توسل کرتے ہیں وہ خدااور رسول پر ایمان رکھنااور نماز قائم کرنا ہے"

۲۔ اخلاص

اگر عمل میں اخلاص نہ ہو تو وہ عمل خداوند کریم کی بارگاہ میں قابلِ قبول نہیں ہے۔

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلاَّ لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ.....﴾[2]

"انھیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ خدا کی عبادت کریں، اس کے لئے عبادت کو خالص رکھیں"

﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلا صَالِحاً وَلاَ يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَداً﴾[3]

"ہر وہ شخص جو اپنے پروردگار سے ملاقات کا امیدوار ہے اُسے چاہیئے کہ خدا کی عبادت میں کسی بھی ذات کو شریک قرار نہ دے"

---

[1]۔ نہج البلاغہ، خ۱۱۰۔
[2]۔ سورۂ بیّنہ، آیت ۵۔
[3]۔ سورۂ کہف، آیت ۱۱۰۔

۳۔ خضوع و خشوع

نماز گزار کے لئے نماز کی حالت میں اپنے دل و دماغ کو معبود کی طرف متوجہ رکھنا ضروری ہے اور خوف و خشیت الٰہی کے ساتھ نماز ادا کرے، مولائے کائنات علیہ السلام جب بھی نماز کے لئے وضو فرماتے تھے تو آپ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا اور جب آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا: "حان وقت الصلاۃ" "نماز کا وقت آ پہنچا"[۱] یہی حال دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کا بھی تھا۔

رسول اکرم ارشاد فرماتے ہیں:

وَ لَا يَقْبَلُ اللَّهُ صَلَاةَ عَبْدٍ لَا يَحْضُرُ قَلْبُهُ مَعَ بَدَنِهِ.[۲]

"اللہ سبحانہ بندہ کی اس نماز کو قبول نہیں کرتا جس میں بدن کے ساتھ قلب حاضر نہ ہو"

مذکورہ احادیث سے یہ بات واضح ہے کہ قبولیتِ نماز کے شرائط میں سے حضور قلب اور خضوع الٰہی کا پایا جانا ضروری ہے، نگاہِ قدرت میں وہی لوگ کامیاب ہیں جو خضوع و خشوع کی عالم میں نماز پڑھتے ہیں جیسا کہ ارشاد رب العزّت ہو رہا ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ، الَّذِينَ هُمْ فِي صَلاَتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾[۳]

"یقیناً صاحبان ایمان کامیاب ہوگئے جو اپنی نمازوں میں خشوع اور حضور قلب رکھتے ہیں"

۱۔ مجمع البحرین مادۃ "امن"، مستدرک الوسائل، ج ۴، ص ۹۳.

۲۔ محاسن برقی، ج ۱، ص ۲۶۰.

۳۔ سورۂ مومنون، آیت ۱۔۲.

۴۔ تقویٰ

نماز کی قبولیت کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ نماز گزار برائیوں سے پرہیز کرے، اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے اور گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے تو یقیناً اس کی نماز بارگاہ خداوندی سے سند قبولیت نہیں پا سکتی ہے۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

لَا دِينَ لِمَنْ لَا وَرَعَ لَهُ وَ لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا تَقِيَّةَ لَهُ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَعْمَلُكُمْ بِالتَّقِيَّة[1]

"جو شخص زہد وورع اور تقویٰ نہ رکھتا ہو وہ دین بھی نہیں رکھتا ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرّم وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ صاحب تقویٰ ہے"

۵۔ ولایت

نماز قبول ہونے کی اہم شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ نماز گزار کا دل محبت وولایت محمد وآل محمد علیہم السلام سے سرشار ہو۔ عبادتیں اُسی وقت فائدہ مند واقع ہو سکتی ہیں جب وہ محمدؐ و آل محمدؐ کی محبت و معرفت اور ان کی ولایت واطاعت کے ساتھ انجام دی جائیں۔

ایک شخص نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے سوال کیا: وہ کونسی چیز ہے جو بارگاہ ربّ العزّت میں نماز کے قبول ہونے کا سبب واقع ہوتی ہے تو آپ نے فرمایا: "وِلَايَتُنَا وَ الْبَرَائَةُ مِن اَعدَائِنَا؛ ہماری ولایت اور ہمارے دشمنوں سے نفرت وبیزاری"[2]

---

[1]۔ کمال الدین وتمام النعمہ، ص ۳۷۱.

[2]۔ مناقب، آل ابی طالب، ج ۳، ص ۲۷۴.

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

فَمَنْ لَمْ يَتوَلَّنا لَمْ يَرْفَعِ اللَّهُ لَهُ عَمَلًا.[۱]

"پس جو شخص ہماری ولایت کو قبول نہیں کرتا تو خداوندعالم اس کے کسی بھی عمل کو قبول نہیں کرتا"

ابن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ صَلَّى صَلَاةً لَمْ يُصَلِّ فِيهَا عَلَيَّ وَ عَلَى أَهْلِ بَيْتِي لَمْ تُقْبَلْ مِنْهُ.[۲]

"جو شخص نماز پڑھے اور مجھ اور میرے اہل بیت علیہم السلام پر درود نہ بھیجے، اس کی نماز قبول نہیں ہے"

جب نماز ان تمام شرائط کے ساتھ ادا ہو تو وہ خدا، رسول اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی نگاہِ اقدس میں مومنین کی معراج، محسنین کے لئے رحمت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں کی ٹھنڈک، جنت کی کنجی اور شیطان کے دام فریب سے بچنے کا ذریعہ ہے اور دیگر تمام اعمال کے قبول ہونے کا ضامن بھی ہے اور یہی حقیقی نماز گزاروں کی نماز ہے لہٰذا ماہ مبارک رمضان کی پہلی تاریخ کی دعا میں بندہ اپنے معبود کی بارگاہ میں دست بدعا ہے:

خدایا! اس دن میں میری نماز کو حقیقی نماز گزاروں کی نماز قرار دے۔

---

[۱]۔ کافی، ج۱، ص ۱۸۳.

[۲]۔ الغدیر (علامہ امینی)، ج۲، ص ۳۰۴.

تیسرا فقرہ: "وَنَبِّهْنِی فِيهِ عَنْ نَوْمَةِ الْغافِلِينَ"

جو چیزیں انسان کو نیک اعمال بجالانے سے روکتی ہیں، ان میں سے ایک غفلت بھی ہے۔ لہٰذا ماہ رمضان کے پہلے دن ہی اپنے پروردگار کی بارگاہ میں دعا کرے کہ خدایا! مجھے غفلت کی نیند سے بیدار کردے تاکہ میں اس ماہِ رحمت میں تیری اطاعت و عبادت سے محروم نہ رہ جاؤں۔

دعا کے اس جملہ میں بندہ اپنے خدا سے ''نبهني'' کہہ کر درخواست کررہا ہے، ''نبهني'' تنبیہ سے ہے جس کے معنی چونکنے اور بیدار ہونے کے ہیں جسے ''یقظہ'' بھی کہاجاتاہے اور یہ لفظ ''غفلت'' کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: " الْيَقَظَةُ نُورٌ[1] " ''غفلت سے بیداری نور ہے''۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ كَانَ لَهُ فِي نَفْسِهِ يَقَظَةٌ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ اللَّهِ حَفَظَةٌ.[2]

''جس شخص کو غفلت سے بیداری حاصل ہو جائے تو پھر اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ پر ہے''

۱۔ غرر الحکم ودرر الکلم، ص۴۳۱.

۲۔ بحار الانوار، ج۱۰، ص۱۱.

غفلت

اس لفظ کا مفہوم بہت وسیع و عریض ہے، کلی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے: غفلت یعنی اُن تمام امور سے بے خبر ہو جانا اور آنکھیں بند کر لینا ہے جو انسان کو کمال وسعادت کی منزل تک پہنچاتے ہیں جیسے خدا اور قیامت کی یاد سے غفلت اور شیطان کے مکر و فریب سے غفلت۔[۱]

غفلت کے اسباب:

خدا اور آخرت کی یاد سے غفلت برتنے کے مختلف اور متعدد اسباب و عوامل ہو سکتے ہیں مگر اختصار کے پیش نظر قرآنی آیات و روایاتِ معصومین علیہم السلام کی روشنی میں صرف مندرجہ ذیل چند عوامل کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے:

۱۔ جہل و نادانی

دینی معلومات، حقائق و معارف الٰہی اور دنیا کی بے ثباتی سے ناآگاہی اور جہالت کی بناپر انسان امور آخرت سے غفلت برتتا ہے لہٰذا اس بارے میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

إِنَّ مَنْ عَرَفَ الْأَيَّامَ لَنْ يَغْفُلَ عَنِ الِاسْتِعْدَادِ[۲]

”اگر کسی کو دینا کی بے ثباتی کی شناخت ہو جائے تو وہ آخرت کی آمادگی سے غافل و بے خبر نہ رہے گا“

۱۔ شہر رمضان، زمزہ روزہ داران، ج۱، ص ۳۴۔

۲۔ میزان الحکمہ، ج۲، ح۱۵۹، باب النفقہ۔

۲۔ مال اور اولاد

کبھی کبھی انسان کو مال اور اولاد سے بے جا محبت آخرت سے غافل کر دیتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں خالق کائنات ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلاَ أَوْلاَدُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ﴾[1]

"اے صاحبان ایمان! تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں یاد خدا سے غافل نہ کردے"

۳۔ دنیاداری

بسا اوقات انسان دنیاوی کاموں میں اس قدر الجھ جاتا ہے کہ آخرت سے بے خبر ہو جاتا ہے، خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَأَعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّي عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلاَّ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾[2]

"(اے رسول) پس جو شخص بھی ہمارے ذکر سے منہ پھیرے اور زندگانیٔ دنیا کے علاوہ کچھ نہ چاہے (تو) آپ بھی اس سے کنارہ کش ہو جائیں"

۴۔ کسب و تجارت

رزقِ حلال کی تلاش اور بچوں کی پرورش کے لئے کسب و تجارت ضروری ہے اور اسلام نے اس عمل کی تائید بھی کی ہے، لیکن انسان کبھی کبھی ان امور میں اس قدر مصروف

---

[1] سورۂ منافقون، آیت ۹.

[2] سورۂ نجم، آیت ۲۹.

ہو جاتا ہے کہ جس کے سبب یادِ خدا سے بھی غافل ہو جاتا ہے، ہاں جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں وہ کسب و تجارت کے باوجود بھی یادِ خدا سے غافل نہیں رہتے۔

﴿رِجَالٌ لاَ تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلاَ بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ﴾[1]

"وہ مرد جنہیں کاروبار یا دیگر خرید و فروخت ذکرِ خدا سے غافل نہیں کر سکتی"

۵۔ آرزوؤں کا طولانی ہونا

یہ بات حق بجانب ہے کہ انسان کی خواہشیں کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتی ہیں مرتے دم تک کچھ نہ کچھ کسر باقی رہ جاتی ہے بقولِ غالب:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ان آرزوؤں کے حصول کی فکر میں انسان یادِ خدا سے غافل ہو جاتا ہے امیرِ بیان حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

وَ اعْلَمُوا عِبَادَ اللَّهِ أَنَّ الْأَمَلَ.... يَحُثُّ عَلَى الْغَفْلَةِ[2]

"اے اللہ کے بندو جان لو! آرزوئیں انسان کو غفلت کی ترغیب دلاتی ہیں"

ان کے علاوہ اور بھی مختلف عوامل و اسباب ہیں جن کی بناپر انسان امورِ آخرت سے غافل ہو سکتا ہے لہٰذا بندۂ مومن کی ذمہ داری ہے کہ وہ مذکورہ غفلت کے عوامل و

---

[1] سورۂ نور، آیت ۳۶۔
[2] بحار الانوار، ج ۷۴، ص ۲۹۳۔

اسباب پر غور و فکر کرے اور خود کو غفلت کی نیند سے بیدار رکھے مولائے کائناتؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"عَجِبْتُ لِغَفْلَةِ ذَوِي الْأَلْبَابِ"[۱]

"مجھے صاحبان عقول کی غفلت پر تعجب ہے"

بقول میر انیسؒ:

عالم پیری میں یہ غفلت انیسؒ
رات بھر جاگے سحر کو سوگئے

غفلت کے منفی نتائج:

ا۔ سنگدلی اور مردہ دلی

جب انسان خدا اور قیامت کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے تو پھر وہ سخت دل ہو جاتا ہے اور اُس پر کسی بھی وعظ و نصیحت کا اثر نہیں ہوتا اور دوسروں کے لئے بے رحم ہو جاتا ہے اگر غفلت کی نیند طولانی ہو جائے تو وہ سنگدل ہی نہیں بلکہ مردہ دل بھی ہو جاتا ہے۔

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

''إِيَّاكَ وَ الْغَفْلَةَ فَفِيهَا تَكُونُ قَسَاوَةُ الْقَلْبِ''[۲]

"غفلت سے بچو، اس لئے کہ اس میں سنگدلی ہے"

۱۔ غرر الحکم و درر الکلم، ح ۲۷۴۷

۲۔ غرر الحکم و درر الکلم، ح ۶۲۶۳.

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ غَلَبَتْ عَلَيْهِ الْغَفْلَةُ مَاتَ قَلْبُه[1]

"جس شخص پر غفلت کا غلبہ ہو جائے اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے"

۲۔ اعمال کا فاسد ہونا

غفلت کا نتیجہ اعمال کا فاسد ہونا ہے؛ کیونکہ غافل انسان نیک اعمال انجام نہیں دے سکتا بلکہ برائیوں میں ملوث رہتا ہے جس کی بناپر اگر کبھی کوئی نیک عمل انجام بھی دے دیا ہے تو اس کے فاسد ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

إِنَّ الْغَفْلَةَ تُفْسِدُ الْأَعْمَالَ[2]

"غفلت، انسان کے اعمال کو خراب کر دیتی ہے"

۳۔ بصیرت کا ختم ہو جانا

حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

دَوَامُ الْغَفْلَةِ يُعْمِي الْبَصِيرَةَ.[3]

"غفلت کے طول پکڑنے سے انسان کی بصیرت ختم ہو جاتی ہے"۔ یعنی انسان میں حقائق کو سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

ان کے علاوہ احادیث معصومین علیہم السلام میں غفلت کے اور بھی موارد موجود ہیں۔

---

[1]۔ غرر الحکم و درر الکلم، ح ۲۷۶۵

[2]۔ بحار الانوار، ج ۲، ص ۳۱۲.

[3]۔ غرر الحکم، ج ۲، ص ۳۱۲.

غفلت سے بچنے کا طریقہ:

۱۔ گذشتگان کی تاریخ سے عبرت

انسان کو تاریخِ بشریت سے عبرت حاصل کرنا چاہیے، نہ جانے کتنے بڑے بڑے بادشاہ اس دنیا میں آئے اور انہوں نے اپنی عیش و عشرت کے لئے روئے زمین پر فلک بُوس عمارتوں کو بنایا، مال وزر کی طاقت کی بنیاد پر نہ جانے کتنے فتوحات حاصل کئے مگر آج وہ شہر خموشاں میں اپنی شکستہ قبروں سے دنیا کی بے ثباتی کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

أَغْفَلُ النَّاسِ مَنْ لَمْ يَتَّعِظْ بِتَغَيُّرِ الدُّنْيَا مِنْ حَالٍ إِلَى حَالٍ[1]

سب سے زیادہ غافل وہ انسان ہے جو دنیا کی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تغییر و تبدیلی سے وعظ و نصیحت حاصل نہ کرے۔

لہٰذا انسان کو گزشتگان کی تاریخ سے درسِ عبرت حاصل کرنا چاہیے، اس امر کے لئے خود قرآن مجید بہترین تاریخ ہے جس میں انبیاء کے واقعات اور ان کے دشمنوں کا حشر کہیں تفصیل سے اور کہیں اجمال کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے اس سلسلہ میں کیا خوب کہا:

جا گورِ غریباں پہ نظر ڈال بہ عبرت　　کُھل جائے گی تجھ پہ تیری دنیا کی حقیقت
عبرت کے لئے ڈھونڈ کسی شاہ کی تربت　　اور پوچھ کہاں ہے وہ تیری شانِ حکومت
کل تجھ میں دَھرا تھا وہ غرور آج کہاں ہے
اے کاسۂ سر بول تیرا تاج کہاں ہے

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۴، ص ۱۱۲۔

۲۔ ذکر الٰہی

غفلت کی نیند سے بیدار رہنے کے لئے انسان کو ہمیشہ یادالٰہی میں مصروف رہنا چاہئے چنانچہ حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"بِدَوَامِ ذِكْرِ اللَّهِ تَنْجَابُ الْغَفْلَةُ"[۱]

"یادِ خدا کے استمرار سے غفلت دور ہو جاتی ہے"

لہٰذا انسان ہمیشہ خدا کی یاد میں خود کو مصروف رکھے اور واجبات کو وقت پر انجام دے خصوصاً نماز کو اوّل وقت میں حضور قلب کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرے، اس بارے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

" أَيُّمَا مُؤْمِنٍ حَافَظَ عَلَى صَلَاةِ الْفَرِيضَةِ فَصَلَّاهَا لِوَقْتِهَا فَلَيْسَ هُوَ مِنَ الْغَافِلِينَ"[۲]

"اگر مومن بندہ اپنی واجب نمازوں کو بروقت پڑھے تو وہ غافلین میں سے نہیں ہوگا"

غفلت کے ایسے ایسے ضرر رساں اثرات کے جاننے کے بعد خالق کائنات کی بارگاہ میں ایک بندۂ مومن کی یہی دعا ہونی چاہئے کہ خدایا! مجھے خواب غفلت سے بیدار کر تاکہ میں اس ماہِ رحمت وضیافت میں تیری نعمتوں سے فیضیاب ہوتا رہوں۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۴، ص ۱۱۲.

۲۔ فروع کافی، ج ۳، ص ۲۷۰.

ماہ مبارک رمضان غفلت سے بیداری اور آخرت کی یاد آوری کے لئے بہترین زمانہ ہے جیسا کہ رسول اسلام ﷺ خطبۂ شعبانیہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وَ اذْكُرُوا بِجُوعِكُمْ وَ عَطَشِكُمْ فِيهِ جُوعَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَ عَطَشَه"[۱]

"(اس ماہِ مبارک میں) اپنی بھوک اور پیاس سے قیامت کے دن کی بھوک اور پیاس کو یاد کرو"

چوتھا فقرہ: "وَهَبْ لِی جُرْمِی فِیهِ یَا إِلهَ الْعالَمِینَ، واعْفُ عَنِّی یَا عافِیاً عَنِ الْمُجْرِمِینَ"

جب انسان غفلت کی نیند سے چونک جائے تو اس کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے معبود کی بارگاہِ رحمت و مغفرت میں اپنے گناہوں کی بخشش کی دعا مانگے، کیونکہ گناہوں کی وجہ سے عبد و معبود کے درمیان حجابات حائل ہوجاتے ہیں اور فاصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں جس کی بناپر بندہ اپنے خدا کی قربت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے، کیونکہ جب انسان گناہ کرتا ہے تو وہ شیطان کا پیرو اور خدا کا سرکش ہو جاتا ہے یعنی انسان الٰہی ولایت و سرپرستی کے حدود سے نکل کر شیطان کی ولایت و سرپرستی کے دائرے میں آجاتا ہے، لہٰذا بندۂ مومن کو چاہئے کہ وہ غفلت کی نیند سے بیدار ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے توبہ کرے اور دعا مانگے تاکہ وہ دوبارہ ولایتِ الٰہی کے دائرہ میں آسکے۔

۱۔ خطبۂ شعبانیہ، مفاتیح الجنان.

توبہ کا مطلب صرف زبان سے استغفار کرنا نہیں ہے، مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"التَّوْبَةُ عَلَى أَرْبَعَةِ دَعَائِمَ نَدَمٍ بِالْقَلْبِ وَ اسْتِغْفَارٍ بِاللِّسَانِ وَ عَمَلٍ بِالْجَوَارِحِ وَ عَزْمٍ أَنْ لَا يَعُودَ"[1]

''توبہ چار ستون پر قائم ہے: ۱۔دل سے گناہ پر نادم ہونا، ۲۔زبان سے ''استغفر اللہ ربی و اتوب الیہ'' کہنا، ۳۔اعضاء و جوارح سے اُس گناہ کی تلافی کرنا، ۴۔اس گناہ کی طرف نہ لوٹنے کا مصمم ارادہ کرنا''

اگر کوئی ذکر شدہ شرطوں کے مطابق سچے دل سے توبہ کرے گا تو اس کا لازمہ خدا کی طرف سے عفو و بخشش اور نزول رحمت ہے؛ کیونکہ خدا کے علاوہ کوئی اور معاف کر ہی نہیں کرسکتا، متعدد قرآنی آیات اور معصومین علیہم السلام کی روایات اس بات پر گواہ ہیں کہ گناہ کو معاف کرنے کا حق صرف خدا کو ہے۔

خداوند کریم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿مَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلاَّ اللهُ﴾[2]

''اللہ کے علاوہ گناہوں کا بخشنے والا کون ہے''۔

﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلاَنَا فَانصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾[3]

---

[1]۔ بحار الانوار، ج۷۵، ص۸.

[2]۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۵.

[3]۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۶.

''(پروردگارا!) ہمیں معاف کر دینا، ہمیں بخش دینا، ہم پر رحم کرنا تو ہمارا مولا و مالک ہے اب کافروں کے مقابل ہماری مدد فرما''

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اپنی مناجات میں بارگاہِ ربّ العزّت میں اس طرح دعا کرتے ہیں:

''أَنْتَ الَّذِي فَتَحْتَ لِعِبَادِكَ بَاباً إِلَى عَفْوِكَ وَ سَمَّيْتَهُ التَّوْبَةَ''[۱]

''بارالٰہا! تو ہی وہ ہے جس نے اپنے بندوں کے لئے معافی کا دروازہ کھولا ہے جس کا نام تو نے توبہ رکھا ہے''

ظاہر ہے انسان اسی دنیا میں اپنے گناہوں سے نجات حاصل کرے تاکہ آخرت کے دردناک عذاب سے محفوظ رہ سکے اور نجات کا واحد راستہ توبہ ہے اور ماہِ مبارک رمضان ماہِ توبہ بھی ہے جس میں رحمتِ الٰہی کے دروازے کھُلے ہوئے ہیں، رحمت کی گھٹائیں اس مہینے میں بندۂ عاصی پر جھوم کر برسنے کے لئے صرف بہانہ چاہتی ہے اور وہ بہانہ مذکورہ شرائط کے ساتھ توبہ کرنا ہے، وہ شقی ترین ہوگا جو اس مہینے میں بخشا نہ جائے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"مَنْ لَمْ يُغْفَرْ لَهُ فِي رَمَضَانَ فَفِي أَيِ شَهْرٍ يُغْفَرُ لَهُ"[۲]

''جو شخص اس مبارک مہینے میں بخشا نہ جائے تو پھر وہ کس مہینے میں بخشا جائے گا؟''

---

[۱] ۔ مناجات الطائبین، مفاتیح الجنان، ص۱۱۸ (مناجات خمس عشر)

[۲] ۔ ثواب الاعمال، ص۱۲.

بخشش کے عوامل اور اسباب:

گزشتہ بیان سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ پروردگار عالم نے اپنے نیک بندوں کی مغفرت، رحمت اور بخشش کے لئے ہمیشہ توبہ کے دروازوں کو کھُلا رکھا ہے تاکہ بندہ اپنے گناہوں پر شرمندہ ہو کر، آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزمِ مصمم کرتے ہوئے محمد و آل محمد علیہم السلام کے وسیلہ سے توبہ کرے تو خدا اس کے گناہوں کو معاف کردیتا ہے، معصومین علیہم السلام کی احادیث میں بعض ایسے عوامل و اسباب کا ذکر ہے کہ جن کی بناپر مومن بندہ کے گناہ کی تلافی ممکن ہے جن میں سے بعض درج ذیل ہیں:

ا۔ دنیاوی عقوبت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اشاد فرماتے ہیں:

"جب مومن گناہ کرتا ہے تو خداوند عالم اسے فقر و تنگدستی میں مبتلا کردیتا ہے اور یہ چیز اس کے گناہ کا کفارہ قرار پاتی ہے یا اس گنہگار مومن کو کسی بیماری میں مبتلا کردیتا ہے یا جاں کنی کے عالم کو اس کے لئے سخت کردیتا ہے"[۱]

۲۔ بیماری

جیسا کہ گزشتہ حدیثِ شریف سے بھی یہ بات ظاہر ہے کہ بسا اوقات خداوند کریم مومن کی بیماری کو اس کے گناہوں کا کفارہ قرار دیتا ہے، حدیث قدسی میں بھی اس کا ذکر ہوا ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

---

[۱] بحارالانوار، ج۸۱، ص۱۹۹.

''میں اہل معصیت کو اپنی رحمت سے مایوس نہیں کروں گا اگر وہ توبہ کریں اور میری بارگاہ میں لوٹ آئیں تو ان کی توبہ قبول کروں گا، سختیوں اور مصیبتوں سے اُن کے گناہوں کی تلافی کروں گا تاکہ وہ اپنے گناہوں سے پاک ہوجائیں''[1]

۳۔ نیک اعمال

اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے بندۂ مومن کے نیک اعمال کو اس کے گناہوں کا کفارہ قرار دیا ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ﴾[2]

جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے ہم یقیناً ان کے گناہوں کی پردہ پوشی کریں گے

۴۔ کثرتِ سجدہ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: ایک شخص رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں بہت زیادہ گناہگار ہوں اور میرے نیک اعمال بھی بہت کم ہیں، رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا:

''أَكْثِرِ السُّجُودَ فَإِنَّهُ يَحُطُّ الذُّنُوبَ كَمَا تَحُطُّ الرِّيحُ وَرَقَ الشَّجَرِ''.[3]

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۴۲.

۲۔ سورۂ عنکبوت، آیت ۷.

۳۔ بحار الانوار، ج ۸۵، ص ۱۶۲.

"بکثرت سجدہ کیا کرو؛ کیونکہ یہ گناہوں کو اس طرح ختم کردیتے ہیں جس طرح ہوا پتّوں کو اڑا لے جاتی ہے"

۵۔ محمد وآل محمد علیہم السلام پر کثرت سے صلوات پڑھنا:

حضرت امام علی رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"اگر کوئی شخص گناہوں کا کفارہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو اُسے کثرت سے محمد وآل محمد علیہم السلام پر صلوات پڑھنا چاہیے تا کہ اُس کے گناہ ختم ہو جائیں"[1]

اس ماہِ رحمت و مغفرت میں بارگاہِ ربّ العزّت میں آج ہماری یہی دعا ہے:

''وَ هَبْ لِي جُرْمِي فِيهِ يَا إِلَهَ الْعَالَمِينَ وَ اعْفُ عَنِّي يَا عَافِياً عَنِ الْمُجْرِمِينَ''

"میرے جرم و گناہ کو بخش دے اے عالمین کے معبود اور مجھ کو معاف کردے اے مجرموں اور گناہگاروں کو معاف کرنے والے"

---

[1] بحارالانوار، ج ۹۴، ص ۴۷۔

دوسری تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ قَرِّبْنی فِیهِ إلی مَرْضاتِكَ وَجَنِّبْنی فِیهِ مِنْ سَخَطِكَ وَنَقِماتِكَ وَوَفِّقْنی فِیهِ لِقِرائَةِ آیاتِكَ، بِرَحْمَتِكَ یَا أَرْحَمَ الرّاحِمِینَ».

"خدایا! مجھ کو اس دن میں اپنی رضا و خوشنودی سے قریب کر اور اس دن میں مجھ کو اپنے غضب اور عذاب سے بچا اور مجھ کو آج کے دن تیرے قرآنی آیتوں کو پڑھنے کی توفیق عطا فرما تجھے تیری رحمت کا واسطہ اے سب سے بڑے رحم کرنے والے"

اہم مطالب:

آج کی اس دعا میں تین اہم باتوں کا ذکر ہے:

۱۔ رضائے الٰہی کی درخواست

۲۔ غضب اور عذاب الٰہی سے دوری

۳۔ تلاوت قرآن کریم کی توفیق

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ قَرِّبْنی فِیهِ إلی مَرْضاتِكَ"

رضائے الٰہی

خداوند کریم نے اس دنیا میں اپنے فیض و کرم کو بندوں تک پہنچانے کے لئے مختلف چیزوں کو سبب قرار دیا ہے، جس طرح رزق کو بندوں تک پہنچانے کے لئے مختلف امور کو واسطہ قرار دیا۔ جیسے تجارت، زراعت وغیرہ۔ اسی طرح خداوند کریم نے اپنے بندے سے رضایت و خوشنودی کے لئے بھی چند امور کو سبب قرار دیا ہے اب اگر بندہ اپنے معبود کی رضا سے قریب ہونا چاہتا ہے تو اسے ان اسباب کا حاصل کرنا ضروری ہے جب کی بدولت معبود کی رضا و خوشنودی سے قربت ممکن ہے، قرآنی آیات اور احادیث معصومین علیہم السلام میں ان اسباب کا ذکر موجود ہے جن کے ذریعہ بندہ اپنے معبود کی رضا و خوشنودی سے قریب ہو سکتا ہے۔

رضائے الٰہی سے قریب ہونے کے اسباب:

ا۔ خوف خدا

خالق کائنات قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَداً رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ﴾[1]

---

[1] سورۂ بیّنہ، آیت ۸.

”ان کے پروردگار کے یہاں اُن کی جزا وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ انھیں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، خدااُن سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں اور یہ سب اس کے لئے ہے جس کے دل میں خوف خدا ہے“

اس آیۂ کریمہ سے یہ بات واضح ہے کہ اللہ اس بندہ سے راضی ہے جس کے دل میں خوف و خشیت الٰہی ہے۔ جب کسی بندہ کے دل میں اللہ کا خوف ہوتا ہے تو پھر وہ مرضئ معبود کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا، لہٰذا اللہ کی رضا سے قریب ہونے کے لئے دل کی گہرائیوں میں خدا کا خوف ہونا ضروری ہے۔

۲، ۳، ۴۔ کثرت سے استغفار کرنا، انکساری اور کثرت سے صدقہ دینا

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"ثَلَاثٌ يَبْلُغْنَ بِالْعَبْدِ رِضْوَانَ اللَّهِ: كَثْرَةُ الِاسْتِغْفَارِ وَ خَفْضُ الْجَانِبِ وَ كَثْرَةُ الصَّدَقَةِ"[1]

تین چیزیں بندہ کو خدا کی رضا و خوشنودی تک پہنچاتی ہیں:

۱۔ کثرت سے استغفار کرنا

۲۔ خاکساری وانکساری

۳۔ کثرت سے صدقہ دینا۔

---

[1] بحار الانوار، ج۷۵، ص۸۱.

۵۔ ہوائے نفس کی پیروی سے پرہیز

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا:

"یَا بُنَيَّ مَنْ یُرِدْ رِضْوَانَ اللَّهِ یَسْخَطْ نَفْسَهُ کَثِیراً وَ مَنْ لَا یَسْخَطْ نَفْسَهُ لَا یَرْضَی رَبَّهُ"[۱]

"اے میرے فرزند! اگر کوئی خدا کی مرضی چاہتا ہے تو اُسے چاہئے کہ اپنے نفس کو ناراض رکھے جس نے اپنے نفس کو ناراض نہیں رکھا اس نے خدا کو راضی نہیں کیا"

حضرت لقمان کا یہ حکیمانہ کلام اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ہمیشہ نفسانی خواہشات کی پیروی اطاعتِ الٰہی کی راہ میں رُکاوٹیں پیدا کرتی ہیں، لہٰذا جب تک بندہ نفسانی خواہشات کی سرکوبی نہ کرے گا وہ اطاعتِ الٰہی کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکتا اور جب اطاعت سے دور ہو جائے گا تو خود بخود رضائے الٰہی سے دور ہوتا چلا جائے گا۔

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"إِنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَی أَخْفَی أَرْبَعَةً فِي أَرْبَعَةٍ أَخْفَی رِضَاهُ فِي طَاعَتِهِ فَلَا تَسْتَصْغِرَنَّ شَیْئاً مِنْ طَاعَتِهِ...."[۲]

"خدائے بلند و برتر نے اپنی رضا و خوشنودی کو اپنی اطاعت میں مخفی رکھا ہے لہٰذا کسی بھی اطاعت کو چھوٹا نہ سمجھو"

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۷۸.

۲۔ خصال، صدوق، ص ۲۰۹.

"رِضَا اللَّهِ سُبْحَانَهُ مَقْرُونٌ بِطَاعَتِهِ".[۱]

"رضائے الٰہی اس کی اطاعت سے ملی ہوئی ہے"

روایت میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام جب بھی گھر سے مسجد کے لئے نکلتے تھے تو راستے میں یہ دعا پڑھتے تھے:

"خَرَجْتُ ابْتِغَاءَ رِضْوَانِكَ وَ اجْتِنَابَ سَخَطِكَ"[۲]

"میں نکلا ہوں تیری رضا کے حصول کے لئے اور تیری ناراضگی سے بچنے کے لئے"

۶۔ تقویٰ

حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"وَ أَوْصَاكُمْ بِالتَّقْوَى وَ جَعَلَهَا مُنْتَهَى رِضَاهُ[۳]"

"خدا نے تمہیں تقویٰ و پرہیزگاری کی تاکید کی ہے اور اس کو اپنی رضا کی انتہا قرار دیا"

رضایتِ الٰہی جاننے کا طریقہ

ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: اے فرزندِ رسول! ہم کیسے سمجھیں کہ خدا ہم کو دوست رکھتا ہے اور ہمارے کاموں سے راضی ہے؟

۱۔ غرر الحکم، ص۵۴۱.

۲۔ مستدرک الوسائل، ج۳، ص۴۳۷.

۳۔ نہج البلاغہ، خ۱۸۳.

امام علیہ السلام نے فرمایا: اپنے دل کی طرف رجوع کرو اور دیکھو کیا تمھارے دل میں خدا کے محبوب بندوں کے لئے محبت ہے یا نہیں؟ اگر محبت ہے تو سمجھو خدا تم سے راضی ہے اور تمھیں دوست رکھتا ہے۔[1]

اللہ کے محبوب ترین بندے خود ائمہ معصومین علیہم السلام ہیں اگر کوئی ان کی محبت کے بغیر لاکھ زہد و تقویٰ اختیار کرلے اور پوری عمر عبادتیں کرتا رہے اور لوگ اس کے لئے رضی اللہ عنہ کی لاکھ دعا کرتے رہیں، خدا اُن سے راضی نہیں ہو سکتا ہے؛ کیونکہ اس کے دل میں ائمہ معصومین علیہم السلام کی محبت نہیں ہے اور اگر ائمہ معصومین علیہم السلام کی حقیقی محبت کسی کے دل میں آجائے تو پھر وہ انسان خود بخود ان اسباب کو فراہم کرتا چلا جائے گا جن سے رضائے معبود کا حصول ممکن ہے۔

اہلبیت علیہم السلام سے حقیقی محبت کا مفہوم یہی ہے کہ اُن کے نقوشِ عصمت کو اپنے لئے مشعلِ راہ اور زندگی کا نمونہ قرار دے کیونکہ ان کی راہ اطاعت و عبادت کی راہ ہے جس کا نتیجہ رضائے الٰہی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خدا کی بارگاہ میں التجا کی:

" يَا رَبِّ أَخْبِرْنِي عَنْ آيَةِ رِضَاكَ عَنْ عَبْدِكَ "

”اے پروردگار! مجھے اس چیز کی نشاندہی فرما جس کے ذریعہ تو اپنے بندہ سے راضی ہو جاتا ہے“

---

[1] اصول کافی، ج ۲، باب حب اللہ تعالیٰ، ص ۱۲۶.

"فَأَوْحَى اللَّهُ تَعَالَى إِلَيْهِ إِذَا رَأَيْتَنِي أُهَيِّئُ عَبْدِي لِطَاعَتِي وَ اَصْرِفُهُ عَنْ مَعْصِيَتِي فَذَلِكَ آيَةُ رِضَاي"

"پس اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی: (اے موسیٰ!) اے میرے بندے جب بھی تو نے دیکھا کہ میں نے تجھے اپنی اطاعت کے لئے آمادہ کیا ہے اور اپنی نافرمانی سے دور کر دیا تو سمجھ لے کہ میری رضا و خوشنودی کی نشانی ہے"[1]

اس حدیث قدسی میں اللہ نے بندہ کے اطاعت پر آمادگی اور معصیت سے روگردانی کو اپنی طرف نسبت دی ہے یعنی یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اطاعت پر آمادہ ہونا اور معصیت سے منہ موڑنا یہ دونوں چیزیں توفیق الٰہی کے بغیر ناممکن ہے، لہٰذا بندہ کو خدا کی بارگاہ میں دعا کرنا چاہیے: بارالٰہا! تو مجھے یہ توفیق عطا کر کہ میں تیری اطاعت کر سکوں اور معصیت سے دور رہ سکوں تاکہ تیری رضا و خوشنودی سے نزدیک ہو جاؤں آج کے دن اس دعا میں بندہ کی اپنے معبود کی بارگاہ میں یہی التجا ہے:

"اَللَّهُمَّ قَرِّبْنِي فِيهِ إِلَى مَرْضَاتِكَ وَ جَنِّبْنِي فِيهِ سَخَطَك"

بارالٰہا! اس دن میں مجھ کو اپنی رضا سے نزدیک کر اور مجھے اپنی ناراضگی و عذاب سے دور رکھ۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۲۶.

دوسرا فقرہ: "وَجَنِّبْنِی فِیهِ مِنْ سَخَطِكَ وَنَقِماتِكَ"

عربی میں "سخط" اُس شدت غضب کو کہتے ہیں جو عذاب و عقوبت کا سبب بنے[1] اور "نقمہ" عقوبت اور عذاب کو کہتے ہیں[2]

قرآن کریم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ﴾[3]

"یہ اس لئے کہ جنہوں نے ان باتوں کا اتباع کیا ہے جو خدا کو ناراض کرنے والی ہیں اور اس کی مرضی کو ناپسند کیا ہے تو خدا نے ان کے اعمال کو نابود کرکے رکھ دیا ہے"

مذکورہ آیۂ کریمہ سے یہ بات واضح ہے کہ اگر انسان اللہ کو ناراض کرنے والی چیزوں کا اتباع کرے تو اللہ اُس کے اعمال کو حبط اور برباد کردیتا ہے اور پھر اس پر عذاب نازل کرتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ہم ان چیزوں کو پہچانیں جن کے انجام دینے سے خدا ناراض ہو جاتا ہے تاکہ خود کو اس قسم کے غیظ و غضب سے محفوظ رکھ سکیں۔

دعائے کمیل میں مولی الموحدین امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اپنے رب کی بارگاہ میں اس طرح التجا کرتے ہیں:

۱۔ مفردات راغب، ص ۴۰۲ مادۂ سخط۔
۲۔ مفردات راغب، مادۂ نقم۔
۳۔ سورۂ محمد، آیت ۲۸

يَا رَبِّ وَ أَنْتَ تَعْلَمُ ضَعْفِي عَنْ قَلِيلٍ مِنْ بَلَاءِ الدُّنْيَا وَ عُقُوبَاتِهَا وَ مَا يَجْرِي فِيهَا مِنَ الْمَكَارِهِ عَلَى أَهْلِهَا عَلَى أَنَّ ذَلِكَ بَلَاءٌ وَ مَكْرُوهٌ قَلِيلٌ مَكْثُهُ يَسِيرٌ بَقَاؤُهُ قَصِيرٌ مُدَّتُهُ فَكَيْفَ احْتِمَالِي لِبَلَاءِ الْآخِرَةِ وَ جَلِيل وُقُوعِ الْمَكَارِهِ فِيهَا وَ هُوَ بَلَاءٌ تَطُولُ مُدَّتُهُ وَ يَدُومُ مَقَامُهُ وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْ أَهْلِهِ لِأَنَّهُ لَا يَكُونُ إِلَّا عَنْ غَضَبِكَ وَ انْتِقَامِكَ وَ سَخَطِكَ[۱]

”پروردگارا تو جانتا ہے کہ میں دنیا کی معمولی بلاؤں اور ادنی سی سختیوں کو برداشت نہیں کرسکتا اور میرے لئے اس کی ناگواریاں قابلِ تحمل نہیں ہیں جبکہ یہ بلائیں قلیل اور ان کی مدت مختصر ہے تو میں اُن آخرت کی بلاؤں کو کس طرح برداشت کروں گا جن کی سختیاں عظیم، جن کی مدت طویل اور جن کا قیام دائمی ہے، جن میں تخفیف کا بھی کوئی امکان نہیں ہے اس لئے کہ یہ بلائیں تیرے غضب اور انتقام کا نتیجہ ہیں اور ان کی تاب زمین وآسمان بھی نہیں لاسکتے“

دعاکے ان جملوں کو ملاحظہ فرمائیں، اللہ کے غضب اور ناراضگی کو نہ زمین برداشت کرسکتی ہے اور نہ آسمان تو پھر آخرت کا یہ دردناک عذاب جو اللہ کی ناراضگی کی بناپر نازل ہونے والا ہے اس عذاب کو ہم کیسے برداشت کرسکیں گے، جبکہ ہم دنیا کی معمولی سختیوں کے مقابل کمزور و ناتواں ہیں، آخرت کا دردناک اور طولانی و دائمی عذاب اُن لوگوں کے لئے ہے جو مسلسل گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

۱۔ مفاتیح الجنان، ص ۱۱۲.

﴿بَلَي مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُوْلَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾[۱]

"ہاں جس نے کوئی برائی کی اور اس کی غلطی نے اس کے وجود کو گھیر لیا وہ لوگ اہل جہنم ہیں اور وہیں ہمیشہ رہنے والے ہیں"

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُوْلَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾[۲]

"جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلا دیا وہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ وہیں رہنے والے ہیں"

گناہ، صغیرہ ہو یا کبیرہ ابتداء میں ایک بُرے عمل کی حیثیت رکھتا ہے جب اس کی تکرار ہوتی ہے یعنی بار بار اس بُرے عمل کو انجام دیا جاتا ہے تو پھر وہ عمل، ایک حالت اور ملکہ کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ پورے وجود کو ایسے گھیر لیتا ہے کہ پھر اس پر کسی بھی وعظ و نصیحت کا اثر نہیں ہوتا در حقیقت ایسی صورت میں انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی عبدیت کی شناخت کو کھو دیتا ہے۔[۳]

آج کی دعا میں خالق کی بارگاہ میں ہماری یہی التجا ہے: اے ہمارے مالک! ہم کو اپنے غیض و غضب اور ناراضگی سے دور رکھ، کیونکہ جو عذاب تیری ناراضگی کی بنا پر

۱۔ سورۂ بقرہ، آیت ۸۱.

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۸۱.

۳۔ تفسیر المیزان، ج ۱، ص ۳۲۵.

ہوگا وہ بہت دردناک اور دائمی ہے، اے پروردگار! ہمارے ناتواں بدن کہاں اور تیرا دردناک عذاب کہاں۔

تیسرا فقرہ: "وَفِّقْنِی فِیهِ لِقِرائَةَ آیاتِكَ"

قرآنی آیات اور معصومین علیہم السلام کی احادیث سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ ہر مسلمان پر قرآن کی نسبت تین اہم ذمہ داریاں ہیں:

۱۔ قرآن کی تلاوت کرنا ۲۔ قرآن کا سمجھنا ۳۔ قرآن پر عمل کرنا، لیکن آج کی اس دعا میں صرف قرآن کریم کی تلاوت کرنے کی توفیق کا ذکر ہے، اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ باقی دو ذمہ داریاں یعنی قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق کی التجا ہماری دعا سے باہر ہے۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ تلاوتِ قرآن مقدمہ ہے فہم قرآن اور اس پر عمل کرنے کے لئے، انسان جب تک قرآن نہیں پڑھے گا اس وقت اسے نہیں سمجھ پائے گا اور جب تک نہیں سمجھے گا اس پر عمل کرنا اس کے لئے ناممکن ہے، لہٰذا قرآن کریم کا صرف پڑھنا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو سمجھنا اور سمجھ کر اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ "رُبَّ تَالِ الْقُرْآنِ وَ الْقُرْآنُ یَلْعَنُهُ"[۱] (بہت سے ایسے لوگ ہیں جو قرآن کی تلاوت کرتے ہیں مگر قرآن ان پر لعنت کرتا ہے) یہ ایسا کیوں ہے؟ کیونکہ کچھ لوگ قرآن کریم کی تلاوت تو کرتے ہیں، مگر اس پر عمل نہیں کرتے، لہٰذا قرآن ان پر لعنت کرتا ہے۔

۱۔ بحار الانوار، ج۸۹، باب ۱۹ فضل حامل القرآن...، ص ۱۸۴.

معصومین علیہم السلام کی احادیث سے یہ بات بھی مسلّم ہے کہ اگر کوئی بندہ قرآن سمجھے بغیر بھی تلاوت کرے یا سنے یا اس کے الفاظ پر نگاہ کرے تب بھی اس کے لئے ثواب ہے اس لئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، قرآن کی تلاوت یعنی اللہ سے گفتگو کرنا ہے، رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"إِذَا أَحَبَّ أَحَدُكُم أن يَحدثَ رَبَّهُ فَلِيَقرؤُا القُرآنَ"[۱]

''جب بھی تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب سے گفتگو کرے تو اسے قرآن پڑھنا چاہیے''

قرآنِ کریم میں خداوند عالم اپنے بندوں سے محو گفتگو اور مخاطِب ہے اور ہم مخاطَب ہیں، وہ بول رہا ہے اور ہم سن رہے ہیں۔

دعا اور قرآن میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ قرآن کریم میں وہ خود بول رہا ہے اور ہم سن رہے ہیں اور دعا میں ہم بولتے ہیں اور وہ سنتا ہے۔

آج کی دعا میں اہم بات یہی ہے کہ ہم اپنے معبود سے تلاوتِ قرآن کی توفیق کی التجا کر رہے ہیں گویا اُس سے ہم یہ بول رہے ہیں کہ وہ بھی ہم سے ہمکلام ہو، بات صرف گفتگو کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ خدا قرآن میں اپنے بندوں کے لئے اپنی عظمت کی نشانیوں کے ساتھ متجلّی بھی ہوتا ہے، مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فَتَجَلّى لَهُمْ سُبْحَانَهُ فِي كِتَابِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونُوا رَأَوْهُ"[۲]

۱۔ کنزالعمال، خبر: ۲۲۵۷۔

۲۔ نہج البلاغہ، خ ۱۴۷۔

"پروردگار! اپنی عظمت کی نشاندہی کے ذریعہ اپنی کتاب میں بغیر دکھائی دیئے جلوہ نما ہے"

قرآن میں الٰہی عظمت کی نشانیوں کو دیکھنے کے لئے بصارت کی نہیں، بلکہ بصیرت کی ضرورت ہے یعنی قرآن میں آیاتِ الٰہی کی عظمت کو دیکھنے کے لئے دل کی آنکھوں کی ضرورت ہے، قرآن کے نور کا ادراک صرف دل کی آنکھیں ہی کر سکتی ہیں۔

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ بہجت اعلی اللہ مقامہ و نَوَّرَ اللہ مَضجعَہٗ بِنورِ القرآن فرماتے ہیں:

"ہماری جوانی کے زمانے میں ایک نابینا شخص تھا لیکن وہ بڑا ہی متقی و پرہیزگار تھا اور ہمیشہ تلاوتِ قرآن میں مصروف رہتا تھا، جب بھی قرآن پڑھنے کا ارادہ کرتا تھا، قرآن کھول کر جس آیت کو پڑھنا چاہتا تھا اسی آیت کے نیچے اپنی انگشتِ شہادت رکھتا تھا، ایک دن ہم نے مزاح کے طور پر اس سے معلوم کیا کہ بتاؤ فلاں آیت کہاں ہے؟ اس نے اوراق پلٹنا شروع کئے تو جس آیت کے بارے میں ہم نے پوچھا تھا اس آیت کے نیچے انگلی رکھ کر کہا یہی وہ آیت ہے، ہم نے کہا: یہ آیت وہ نہیں ہے یہ تو کوئی دوسری آیت ہے، اس نے بڑے اعتماد سے سر اٹھا کر مجھ سے کہا: کیا تو اندھا ہے جو تجھے دکھائی نہیں دیتا"[1]

گویا اس نے یہ ثابت کر دیا کہ جس کے پاس بصارت نہ ہو وہ اندھا نہیں ہوتا ہے، بلکہ جس کے پاس بصیرت نہ ہو وہ اندھا ہوتا ہے۔

---

[1] نقل از کتاب: شہر رمضان، زمزہ روزہ داران، ج ۱، ص ۵۴.

یہ تو قرآن صامت کی بات تھی، لیکن قرآن ناطق کی بھی یہی عظمت ہے، ابو بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے نابینا صحابی تھے مگر وہ نورِ بصیرت کی بنا پر اپنے امام کو دیکھتے اور محسوس کرتے تھے۔

قرآن کی تلاوت یعنی خدا سے گفتگو کرنا ہے جس مومن کا ایمانی ذوق کلامِ الٰہی کی لذت و شیرینی سے آشنا ہو جائے پھر وہ کسی اور ذوق کی تلاش میں نہیں رہتا، مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"مَنْ أَنسَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ لَمْ يُوحِشْهُ مُفَارَقَةُ الْإِخْوَانِ"[1]

"جس کو بھی قرآن کی تلاوت سے انسیت و محبت ہو جائے اسے بھائیوں اور دوستوں کی جدائی وحشت زدہ نہیں کر سکتی"

امام زین العابدین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

" لَوْ مَاتَ مِنْ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَمَا اسْتَوْحَشْتُ بَعْدَ أَنْ يَكُونَ الْقُرْآنُ مَعِي"[2]

"اگر مشرق سے مغرب تک سب مر جائیں (اور کوئی بھی زندہ نہ رہے) پھر بھی میں وحشت زدہ نہیں ہو سکتا، جب تک قرآن میرے ساتھ ہے"

جو شخص قرآن کو زندگی کا رفیق، شریک اور تنہائی کا مونس بنالیتا ہے تو اسے تنہائی کا کوئی غم نہیں ہوگا، اگر قرآن ساتھ ہے تو کسی کی جدائی کا غم نہیں ہوگا، قرآن ساتھ

---

[1] غرر الحکم و درر الکلم، ح۷۵۷۵، ص۳۶۸.

[2] مستدرک الوسائل، ج۳، ص۴۶۳؛ وافی، ج۲، ص۲۶۲.

ہے یعنی خدا ساتھ ہے لہٰذا ہر مسلمان پر قرآن کی تعلیم حاصل کرنا اور دوسروں کو تعلیم دینا ضروری ہے، احادیث معصومین علیہم السلام میں اس کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔

تعلیم و تعلّمِ قرآن کی فضیلت

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"أَلَا مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهُ وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ فَأَنَا لَهُ سَائِقٌ فِي الجَنَّةِ"[1]

"آگاہ ہو جاؤ اگر کوئی شخص قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے اور اس میں موجود آیات پر عمل کرے تو میں خود جنت کی طرف اس کی رہنمائی کروں گا"

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

«يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ لَايَمُوتَ حَتّى يَتَعَلَّمَ الْقُرْآنَ، أَوْ يَكُونَ فِي تَعْلِيمِهِ»[2]

"مومن کے لئے سزاوار اور مناسب یہی ہے کہ اس کو اس وقت تک موت نہ آئے جب تک وہ قرآن نہ سیکھ لے یا سیکھ رہا ہو"

اس کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن کو جلد سے جلد قرآن پڑھنا سیکھ لینا چاہیے؛ کیونکہ پتہ نہیں کہ داعی اجل کب دروازۂ حیات پر دستک دیدے۔

ایک اور مقام پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] کنز العمال، ح ۲۳۷۵.

[2] بحار الانوار، ج ۲۹، ص ۱۸۹.

"حَامِلُ رَأيةِ القُرآن حَاملُ رأيةِ الأسلام مَن أكرمَهُ فَقد أكرَمَ الله وَمَن أهانَ فَعَليهِ لَعنَةُ الله"

"حامل قرآن (یعنی قرآن کو سیکھنے، دوسروں کو اس کی تعلیم دینے اور اس پر عمل کرنے والا) اسلام کا علمبردار ہے جس نے اس کی تعظیم کی گویا اُس نے خدا کی تعظیم کی اور جس نے اس کی اہانت کی اس پر خدا کی لعنت ہے"

مادی علوم سکھانے والے اساتذہ کی کتنی قدر ہوتی ہے اور اُن پر کس قدر مال و متاع نچھاور کیا جاتا ہے اور قرآنی علوم سکھانے والے اساتذہ کی کتنی قدر ہوتی ہے؟ یہ بات ہمارے معاشرے میں قابل غور ہے، مادی علوم سیکھنے کے لئے بے دریغ دولت بہائی جاتی ہے، لیکن علومِ قرآن کی تعلیم کسی اجرت کے بغیر بھی دی جاتی ہے تو بعض لوگوں کے پاس اسے سیکھنے کے لئے وقت نہیں ہے جبکہ والدین کے لئے حکمِ پیغمبر ہے کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

" أَدِّبُوا أَوْلَادَكُمْ عَلَى ثلثَ خِصَالٍ حُبّ نَبِيِّكُم وَ حُبّ اَهل بَيتِهِ وَ تِلَاوَةِ القُرآن"[1]

"اپنی اولاد کو تین خصلتوں کے لئے تادیب کرو: ۱۔اپنے نبیؐ سے محبت ۲۔اہلبیتِ رسولؐ سے محبت ۳۔قرآن کریم کی تلاوت"

ایک اور مقام پر رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"نَوِّرُوا بُيُوتَكُمْ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ"[2]

---

[1] صبح رضوان، ج۱، ص۷۳.
[2] کافی، ج۲، ص۶۱۰.

"اپنے گھروں کو تلاوت قرآن سے نورانی کرو"

تلاوت قرآن سے نہ صرف گھر منور ہوتے ہیں بلکہ دل بھی منور اور زندہ ہوتے ہیں۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

" يَا بُنَيَّ لَا تَغفَل عَن قَرَائَةِ الْقُرْآنَ فَإِنَ الْقُرْآن يُحي القَلب"[1]

"اے بیٹا! تلاوتِ قرآن سے غافل نہ رہو، کیونکہ یہ مردہ دل کو زندہ کرتی ہے"

تلاوتِ قرآن، گناہوں کا کفارہ ہے

خالق کائنات ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرّاً وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَنْ تَبُورَ، لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُمْ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ﴾[2]

"یقیناً جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور انہوں نے نماز قائم کی ہے اور جو کچھ ہم نے انھیں بطور رزق دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں پوشیدہ اور آشکارا طور پر خرچ کیا ہے یہ لوگ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس میں کسی طرح کی تباہی نہیں ہے تاکہ خدا اُن کا پورا پورا اجر دے اور

---

[1]۔ میزان الحکمہ، مادہ

[2]۔ سورۂ فاطر، آیت ۲۹۔۳۰.

اپنے فضل و کرم سے اضافہ بھی کردے یقیناً وہ بہت بخشنے والااور قدر کرنے والا ہے"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"عَلَيْكَ بِقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ فَإِنَّ قِرَاءَتَهُ كَفَّارَةٌ لِلذُّنُوب"[۱]

"تم پر قرآن کی تلاوت ضروری ہے؛ کیونکہ یہ گناہوں کا کفارہ ہے"

اور ایک مقام پر رشاد فرماتے ہیں:

"لَا يُعَذِّبُ اللَّهُ قَلْباً وَعَى الْقُرْآنَ"[۲]

"جو دل قرآن کے لئے ظرف بن جائے اس پر خدا کا عذاب نہیں ہوتا"

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَ هُوَ شَابٌ مُؤْمِنٌ اخْتَلَطَ الْقُرْآنُ بِلَحْمِهِ وَ دَمِهِ"[۳]

"اگر کوئی قرآن کی تلاوت کرے اس حال میں کہ وہ جوان ہو تو قرآن اس کے گوشت اور خون میں مخلوط ہو جاتا ہے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر باایمان جوان قرآن کو پڑھے اور سمجھے تو پھر قرآن عملی طور پر اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے اور جس کے خون اور گوشت میں قرآن عملی طور پر ہو تو اس کو آتش جہنم نہیں جلا سکتی ہے۔ لہٰذا قرآن سے غفلت کسی بھی

۱۔ بحار الانوار، ج ۹۲، ص ۱۷۔

۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۴، ص ۸۲۵.

۳۔ کافی، ج ۲، باب حامل قرآن، ص ۳۰۲.

صورت میں نا قابل قبول ہے، کیونکہ قرآن ﴿وَهُدي وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾[۱] ''اور قرآن مومنین کے لئے ہدایت اور رحمت ہے''۔ ﴿هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾[۲] ''وہ مومنین کے لئے شفااور رحمت ہے''۔

قیامت کے دن قرآن کریم کی شکایت

خداوند عالم نے قرآن کو متقین کی ہدایت کے لئے نازل کیا ہے﴿هُدي لِلْمُتَّقِينَ﴾ اگر کوئی اس سے استفادہ نہ کرے تو پھر قرآن روز قیامت خدا کی بارگاہ میں شکایت کرے گا:

﴿وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوراً﴾[۳]

''اور قیامت کے دن رسول آواز دے گا کہ پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا''

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"يَجِيءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَلَاثَةٌ يَشْكُونَ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ الْمُصْحَفُ وَ الْمَسْجِدُ وَ الْعِتْرَةُ"[٤]

''قیامت کے دن تین گروہ خدا کی بارگاہ میں شکایت کریں گے: ۱۔قرآن ۲۔مسجدیں ۳۔اہلبیت اطہار علیہم السلام''۔

۱۔ سورۂ یونس، آیت ۵۷.

۲۔ سورۂ اسراء، آیت ۸۲.

۳۔ سورۂ فرقان، آیت ۳۰.

۴۔ خصال، ج۱، ص ۱۷۵.

ممکن ہے قرآن کریم کی شکایت خداوند کریم کی بارگاہ میں کئی جہت سے ہو شاید یہ کہہ کر شکایت کرے:

★ . خدایا! بعض لوگوں نے میری آیات عبادی وفردی پر تو عمل کیا مگر سیاسی اور اجتماعی امور سے متعلق اور ایثار وقربانی سے متعلق آیتوں پر عمل نہیں کیا۔

★ . خدایا! بعض لوگوں نے مجھے منشورِ زندگی ماننے کے بجائے صرف مُردوں کو ایصال ثواب کا ذریعہ بنا کر رکھ دیا۔

★ . خدایا! بعض لوگوں نے مجھے تیرا قانون سمجھ کر میری آیتوں کے مطابق عمل کرنے کے بجائے انھیں رٹ کر حافظ کہلائے اور مجھے تجارت اور آمدنی کا ذریعہ بنالیا۔

★ . خدایا! تیرے بعض بندوں نے میری تفسیر، حقیقی اور واقعی مفسر اہلبیت اطہار علیہم السلام کی احادیث کی روشنی میں کرنے کے بجائے اپنی رائے اور نامربوط لوگوں کے اقوال کے سہارے کیا۔

★ . خدایا! بعض لوگوں نے مجھے بڑے احترام سے اپنے گھروں میں سجا کر تو رکھا مگر تلاوت کرنے کے لئے نہیں، بلکہ سسرال سے ملی جہیز کی حیثیت سے۔

★ . خدایا! بعض لوگوں نے مجھے پڑھا ضرور مگر میری آیتوں پر کبھی عمل نہیں کیا۔

آج مسلمانوں میں اختلاف، ذلت وخواری اور پریشانی صرف اس لئے ہے کہ مسلمان قرآن کی تعلیمات سے دور ہوگئے ہیں، یا پھر قرآن کی تفسیر اپنی رائے کے مطابق کرنے لگے ہیں، غیروں کی بات چھوڑیئے ہم نے اپنی قوم میں بھی بسااوقات یہ

محسوس کیا ہے کہ بعض لوگ اپنے قلبی رجحانات کو ''عقیدہ'' کا لبادہ اڑھا کر صاف یہ فیصلہ سنادیتے ہیں کہ ہمارا تو بس یہی عقیدہ ہے۔ یا پھر نادانستہ طور پر عمل کو عقیدہ کہہ کر اس کے صحت پر کسی بھی مجتہد کے رائے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی غور کرنا گوارا نہیں کرتے کہ ہمارا یہ عقیدہ یا عمل، قرآنی تعلیمات کے مطابق ہے یا نہیں؟ یہ تو ہم گنہگاروں کی بات تھی، حضرت امام علی رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"إِذَا كَانَتِ الرِّوَايَاتُ مُخَالِفَةً لِلْقُرْآنِ كَذَّبْتُ بِهَا"[1]

''جب بھی روایات، قرآن کے مخالف ہوں تو ان کی تکذیب کی جائے''

یعنی امام معصوم علیہ السلام سے منسوب حدیث بھی اگر قرآن کریم کے خلاف ہو تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا اور اُس حدیث کو جھٹلایا جائے گا، معاذ اللہ اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ امام معصوم کا قول قرآن کے خلاف ہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا؛ کیونکہ ائمہ اطہار علیہم السلام خود قرآن ناطق ہیں، بلکہ امام گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے اقوال کبھی قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتے لہٰذا جو قول قرآن کی مخالفت کرے وہ ہمارا قول ہی نہیں ہے، بلکہ کسی نے اُس قول کو ہمارے نام سے منسوب کر دیا ہے۔

اگر قرآن اللہ کا کلام صامت ہے تو ائمہ اطہار علیہم السلام کلام ناطق ہے، خلاصۂ مطلب یہ کہ قرآن کریم تلاوت کرنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے ہے۔ تلاوتِ قرآن

---

[1] توحید، شیخ صدوق، ص ۱۳۸؛ الاحتجاج، ص ۴۰۷۔

یعنی خدا سے گفتگو کرنا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اس سے گفتگو کے لئے خود کو پہلے اس کے لائق بنائیں۔

تلاوت کے آداب

آیات و روایات میں تلاوتِ قرآن کے ظاہری اور باطنی آداب جُدا جُدا بیان کئے گئے ہیں، مگر ہم اختصار کو مدّ نظر رکھتے ہوئے بطور نمونہ چند چیزیں ذیل میں بیان کررہے ہیں:

۱۔ منھ اور دہن کو پاک و پاکیزہ کرنا

رسول اسلام صلى الله عليه وآله وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"طَيِّبُوا أفوَاهَكُم فَاِنَّ أفوَاهكُم طَرِيقُ القَرآن"[۱]

''اپنے دہنوں کو پاک و پاکیزہ رکھو؛ کیونکہ تمھارے دہن قرآن کی راہ ہیں''

۲۔ استعاذہ: (یعنی تلاوت شروع کرتے وقت ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' کہنا)

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ مِنْ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾[۲]

'' لہٰذا جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطانِ رجیم کے مقابلہ کے لئے اللہ سے پناہ طلب کریں''

۳۔ ترتیل: (قرآن کو صحیح تلفظ سے ادا کرنا)

﴿وَرَتِّلْ الْقُرْآنَ تَرْتِيلاً﴾[۱]

۱۔ کنزل العمال، خبر ۲۷۵۲.

۲۔ سورۂ نحل، آیت ۹۸.

”اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر باقاعدہ پڑھو“

۴۔تدبّر: (قرآن کی تلاوت کے ساتھ اس میں غور و فکر کرنا)

﴿أَفَلاَ يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَي قُلُوب أَقْفَالُهَا﴾[۲]

”تو کیا یہ لوگ قرآن میں ذرا بھی غور نہیں کرتے ہیں یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں“

۵۔ خضوع و خشوع

﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ الله﴾[۳]

”ان کے دل ذکرِ خدا اور اس کی طرف سے نازل ہونے والے حق کے لئے نرم ہو جائیں“

۶۔اچھی آواز سے پڑھنا

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"حَسِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ فَإِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ يَزِيدُ الْقُرْآنَ حُسْناً"[۴]

”قرآن کو اچھی آواز سے پڑھا کرو؛ کیونکہ اچھی آواز کے ساتھ پڑھنا حُسن قرآن میں اضافہ کا سبب ہے“

۱۔ سورۂ مزمل، آیت ۴.

۲۔ سورۂ محمد، آیت ۲۴.

۳۔ سورۂ حدید، آیت ۱۶.

۴۔ کنز العمال، خبر: ۲۷۶۵.

ہم نے آج کی دعا کی شرح میں جو کچھ بیان کیا ہے صرف اور صرف تلاوتِ قرآن سے متعلق ہے، عظمت و جلالت قرآن، قرآن کے دیگر صفات اور فضائل انشاء اللہ آنے والی دعاؤں کے ذیل میں بیان کئے جائیں گے۔

آخر میں خالق کائنات کی بارگاہ میں یہی دعا ہے: بارالٰہا! تو ہمیں اس بابرکت ماہِ قرآن میں جیساکہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے: «لِكُلِّ شَيْءٍ رَبِيعٌ، وَ رَبِيعُ الْقُرْآنِ شَهْرُ رَمَضَانَ» [1] "ہر چیز کے لئے بہار ہوتی ہے اور بہار قرآن کا مہینہ ماہ رمضان ہے"

ہمیں زیادہ سے زیادہ تلاوت کرنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما کیونکہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے:

"مَنْ قَرَأَ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ آيَةً مِنْ كِتَابِ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ كَانَ كَمَنْ خَتَمَ الْقُرْآنَ فِي غَيْرِهِ مِنَ الشُّهُورِ" [2]

جو شخص ماہ رمضان میں خدائے عزّوجل کی کتاب (قرآن مجید) کی کسی ایک آیت کی تلاوت کرے تو (اس کا ثواب) دیگر مہینوں میں قرآن ختم کرنے کے برابر ہے۔

---

[1] ۔ کافی، ج۲، ص۶۳۰.

[2] ۔ بحارالانوار، ۹۶، ص۳۴۱.

تیسری تاریخ کی دعا:

«اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنى فِيهِ الذِّهْنَ وَالتَّنْبيه، وَباعِدْنى فِيهِ مِنَ السَّفاهَةِ وَالتَّمْوِيهِ، وَاجْعَلْ لِى نَصِيباً مِنْ كُلِّ خَيْرٍ تُنْزِلُ فِيهِ، بِجُودِكَ يَا أَجْوَدَ الْاَجْوَدِين»

"بارالٰہا! اس دن مجھ کو ذہن اور بیداری عطا کر اور مجھ کو اس دن بے وقوفی اور جہالت سے دور رکھ اور میرے لئے ہر اس نیکی میں جو اس روز نازل کرے گا حصّہ دار فرما، تجھے تیری بخشش کا واسطہ اے بڑے جود و بخشش والے"

اہم مطالب:

آج کی اس دعا میں خداوند کریم کی بارگاہ میں تین اہم چیزوں کی درخواست ہے:

۱. ذہانت و بیداری کی

۲. بے وقوفی اور جہالت و گمراہی سے دوری کی

۳. آج کے دن نازل ہونے والی تمام نیکیوں میں حصّہ داری کی

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی فِیہِ الذِّھْنَ وَالتَّنْبِیہَ"

رزق اور اس کی قسمیں

عام طور سے جو چیزیں انسان کے کھانے اور پینے سے متعلق ہوتی ہیں اُنہی کو رزق کہا جاتا ہے، لیکن عربی میں رزق کے معنیٰ عام ہے، کبھی نعمتوں کے عطائے جاری کو رزق کہا جاتا ہے اور یہ کبھی دنیوی ہوتی ہے تو کبھی اُخروی اور کبھی نصیب کو بھی رزق کہا جاتا ہے۔[۱]

دنیوی عطا

آیات و روایات اور دعاؤں میں ذکر شدہ تمام معنوں میں رزق کے لفظ کا استعمال ہوا ہے

﴿یَا أَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا کُلُوا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاکُمْ﴾[۲]

"اے صاحبان ایمان ہم نے جو پاک و پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اُسے کھاؤ"

اس آیۂ کریمہ میں رزق سے مراد وہ دنیاوی نعمتیں ہیں جن کا تعلق خورد و نوش سے ہے اور خالق کائنات جنھیں اپنی مخلوقات کو مسلسل عطا کرتا رہتا ہے۔

۱۔ مفرداتِ راغب، مادۂ رزق، ص ۳۵۰.

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۲.

اُخروی عطا

﴿ وَلاَ تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتاً بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴾[1]

"اور خبر دار راہ خدا میں قتل ہونے والے کو ہر گز مردہ خیال نہ کرنا وہ زندہ ہیں اور اپنے پرور دگار کے یہاں سے رزق پاتے ہیں"

اس آیۂ کریمہ میں رزق سے مراد اُن نعمتوں کی عطا ہے جن کا تعلق آخرت سے ہے۔

نصیب اور قسمت

ماہ مبارک رمضان کی معتدد دعاؤں میں یہ جملہ موجود ہے:

"اللَّهُمَّ ارْزُقْنِي حَجَ بَيْتِكَ الْحَرَامِ"

"خدایا! مجھ کو اپنے بیتِ حرام کے حج کی توفیق عطا فرما"

یعنی حجِ بیت اللہ مجھے نصیب فرما، در حقیقت حجِ بیت اللہ وہ عظیم نعمت ہے جو اس ماہِ مبارک کی شبہائے قدر میں بندہ کی قسمت و تقدیر میں لکھی جاتی ہے۔

ذہن اور تنبیہ

ذہن و تنبیہ، خالق کی وہ نعمت ہے جسے بندہ آج کے دن اپنے لئے نصیب ہونے کی دعا مانگ رہا ہے۔ ذہن، فہم وادراک کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ انسان مطالب کو سمجھتا

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۱۶۹.

اور یاد رکھتا ہے[1]۔ اور تنبیہ سے مراد (جیسا کہ پہلی تاریخ کی دعا میں جس کا ذکر ہو چکا ہے) قلبی بیداری ہے اور اس کی ضد "غفلت" ہے اور تنبیہ کو "یقظہ" بھی کہا جاتا ہے۔

خداوند کریم کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت "ذہن" ہے اور جس انسان کا قوتِ حافظہ و ادراک تیز ہوتا ہے اُسے "ذہین" کہتے ہیں۔ خداوند کریم، معصیت اور گناہوں کی وجہ سے جس طرح دیگر نعمتیں چھین لیتا ہے اُسی طرح بسا اوقات اس نعمت کو بھی چھین لیتا ہے، شاید اسی لئے فارسی میں ضرب المثل (کہاوت) مشہور ہے: **"دروغگو حافظہ ندارد"** (جھوٹے انسان کا حافظہ نہیں ہوتا ہے)۔ لہٰذا مومن بندہ کو چاہیئے کہ وہ نہ صرف نعمتِ فہم و ادراک اور قلبی بیداری کے حصول کی دعا کرے، بلکہ اس نعمت کے حصول اور حفاظت کے لئے بھی کافی اہتمام کرے یعنی خود کو گناہوں سے دور رکھے اور روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ قرآن کریم کی بکثرت تلاوت کرنے سے حافظہ تیز ہوتا ہے، لہٰذا ہر روز نماز صبح کے بعد کم از کم چالیس یا پچاس آیتوں کی تلاوت کرنا چاہیے۔

قوتِ حافظہ کی دعا

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حافظہ کی قوت کے لئے ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھے:

---

[1]۔ فرہنگ صبا، محمد بہشتی، ۴۹۰.

"سُبْحَانَ مَنْ لاَ يَعْتَدِي عَلى أَهْلِ مَمْلَكَتِهِ، سُبْحانَ مَنْ لاَ يَأْخُذُ أَهْلَ الْاَرْضِ بِألْوانِ الْعَذَابِ سُبْحانَ الرَّؤُوفِ الرَّحِيمِ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِي فِي قَلْبِي نُوراً وَبَصَراً وَفَهْماً وَعِلْماً إِنَّكَ عَلى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ[۱] "

"پاک ہے وہ خدا جو اپنی مملکت میں رہنے والوں پر زیادتی نہیں کرتا، پاک ہے وہ خدا جو اہل زمین کی طرح طرح کے عذاب سے گرفت نہیں کرتا۔ پاک ہے وہ خدا جو مہربان رحم کرنے والا ہے۔اے معبود! میرے قلب میں نور، بصیرت، فہم اور علم کو جگہ دے بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے"

ذہین و ہوشیار کون ہے؟

ذہین و فہیم کو عربی میں "کَیِّس" بھی کہتے ہیں اور یہ لفظ متعدد روایات میں آیا ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلْكَيِّسُ مَنْ أَحْيَا فَضَائِلَهُ وَ أَمَاتَ رَذَائِلَهُ بِقَمْعِهِ شَهْوَتَهُ وَ هَوَاهُ"[۲]

"چالاک اور ہوشیار وہ ہے جس نے اپنی فضیلتوں کو زندہ رکھا اور اپنی بُری صفتوں کو شہوت اور خواہشاتِ نفس کے قلع قمع کے ذریعہ ختم کردیا"

حقیقت میں وہی انسان چالاک و ہوشیار ہے جس نے اپنے اندر موجود فضیلتوں کو زندہ رکھا، اوّل وقت نماز پڑھنے کی اچھی صفت (اگر کسی میں ہے تو وہ) اُسے باقی رکھے یعنی

۱۔ مفاتیح الجنان، تعقیبات مشترکۂ نماز.

۲۔ غرر الحکم، ص۴۸۱.

ہمیشہ کوشش کرے کہ یہ اچھی صفت باقی رہے اور اس سے ختم نہ ہونے پائے اور اس کے برخلاف اگر کوئی بُری صفت ہے تو اُسے ختم کرنے کی کوشش کرے اور اکثر بُری صفتوں کی جڑ نفسانی خواہشات کے اتباع سے وجود میں آتی ہیں، لہٰذا جو شخص نفسانی خواہشات کی پیروی نہیں کرتا وہ دنیا و آخرت میں سرخرو اور سرافراز ہے۔

دوسرا فقرہ: "وَباعِدْنی فِیهِ مِنَ السَّفاهَةِ وَالتَّمْوِیه"

سفاہت، حماقت اور بے وقوفی کو کہتے ہیں اور اس کی ضد ''حکمت'' ہے۔ ''تمویہ'' یعنی کسی بھی چیز کو اس کی حقیقت کے برخلاف دکھانا[1]۔ گویا حق کو باطل کا لباس پہنانا۔ یعنی حقیقت سے بھٹک جانا اور گمراہ ہو جانا ہے۔

آج کی اس دعا میں خالقِ کائنات کی بارگاہ میں بندۂ مومن کی درخواست ہے: بارالٰہا! آج مجھے حماقت اور گمراہی و جہالت سے دور رکھ، جتنی چیزیں خلافِ حکمت و حقیقت ہیں وہ سب کے سب حماقت و گمراہی پر مبنی ہیں۔ فضول گفتگو کرنا حماقت ہے، غیبت کرنا حماقت ہے اور فضول کاموں میں خود کو مصروف رکھنا حماقت ہے۔ ان تمام چیزوں سے انسان یادِ خدا و آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اور نیک کاموں کو انجام دینے سے محروم ہو جاتا ہے۔ فرمانِ رسولؐ کے مطابق ''الدنیا مزرعة الآخرة[2]''؛ ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔ لہٰذا اس دنیا میں اُن ہی امور کو انجام دے جو آخرت میں کام آنے والے ہیں جو ایسا کرے وہی شخص چالاک ہے اور جو ایسا نہ کرے وہ احمق و بے وقوف ہے۔

---

[1]۔ فرہنگ صبا، ص ۳۰۰.

[2]۔ بحارالانوار، ج ۶۷، ص ۲۲۵.

سفاہت اور تمویہ میں فرق

جو شخص سفاہت کے مرض میں مبتلا ہے وہ اپنے بُرے کاموں سے بے خبر ہے؛ کیونکہ وہ احمق اور بے وقوف ہے لیکن جو شخص تمویہ کے مرض میں مبتلا ہے وہ اپنے بُرے کاموں کی حقیقت سے آگاہ اور باخبر ہے اس کے باوجود اُنھیں اچھا اور نیک بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے یعنی باطل امور پر حق کا لبادہ اڑھاتا ہے۔[1]

قرآن وحدیث کی روشنی میں سفیہ واحمق کون ہے؟

جو لوگ سوچے سمجھے بغیر بیہودہ گفتگو کرتے ہیں خداوندعالم نے قرآن کریم میں اُنھیں ''سفہاء'' کہا ہے:

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنْ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمْ﴾[2]

''عنقریب احمق لوگ یہ کہیں گے کہ ان مسلمانوں کو اس قبلہ سے کس نے موڑ دیا''

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان، بیت المقدس کی طرف منھ کرکے نماز پڑھتے تھے جس پر یہودی مسلمانوں پر طنز کیا کرتے تھے ہجرت کے دوسرے سال مدینہ میں نماز کی حالت میں رسول پر وحی نازل ہوئی کہ اے رسول! اب اپنے چہرہ کو کعبہ کی طرف کرلو تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وقت نماز کی حالت میں اپنا منہ کعبہ کی سمت کرلیا، جہاں پر یہ واقعہ پیش آیا اس مسجد کو ''مسجد ذوالقبلتین'' کہتے ہیں، نماز کے بعد مسلمانوں

۱۔ شہر رمضان زمزمہ روزہ داران، ج۱، ص۶۱.

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۴۲.

میں اس واقعہ کو لے کرچہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور اسلام لے آنے کے باوجود بھی خدا کے فیصلہ پر بیہودہ گفتگو کرنے لگے جس کا جواب خدا نے یہ کہہ کر دیا: ''سیقول السفہاء''۔

آج ہمارے معاشرے میں اس قسم کے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو شریعت کے مسلّم احکام پر نکتہ چینی کرتے نظر آتے ہیں اور خود کو دین و شریعت کے قالب میں ڈھالنے کے بجائے، دین و شریعت کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، ایسے لوگ قرآن کریم کی نظر میں احمق ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"أَحْمَقُ الْحُمَقَاءِ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهُ"[1]

''سب سے بڑا احمق وہ شخص ہے جس نے اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کی ہے''

تیسرا فقرہ: "وَاجْعَلْ لِی نَصِیباً مِنْ کُلِّ خَیْرٍ تُنْزِلُ فِیهِ"

خیر و شر کے معنی و مفہوم

عربی میں ''خیر'' اس چیز کو کہتے ہیں جسے ہر کوئی پسند کرتا اور اپنے لئے طلب کرتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس کی طلب، سچی ہو یعنی طلب فطری ہو؛ کیونکہ کبھی کبھی

[1] بحار الانوار، ج۷۰، ص۶۹.

انسان جھوٹی اور غیر فطری طلب کی بناپر سراب کو چشمہ سمجھ کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔[1]

ابو علی سینا نے بھی اپنی کتاب شفاء میں ''خیر'' کی یہی تعریف کی ہے، خیر یعنی وہ چیز جس میں ہر کسی کی رغبت ہوتی ہے[2]۔ جیسے عقل، عدالت، عزّت، شرافت وغیرہ وغیرہ۔ خیر کے مدّمقابل ''شر'' ہے۔ ''شر'' یعنی کسی بھی چیز میں اس کے ذاتی کمال کا نہ ہونا۔ ایسی صورت میں شر ایک عدمی امر ہے[3]۔ اسی لئے علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں: ''لیس الشر الّا عدم الخیر؛ شر، ایک وجود کا نام نہیں ہے، بلکہ خیر کا نہ ہونا ہی شر ہے''[4]۔ ہاں اُس خیر کا نہ ہونا شر ہے جس کے ہونے کی اُس میں صلاحیت اور استعداد موجود ہو، یعنی مطلقِ خیر کا نہ ہونا شر نہیں ہے لہٰذا علامہ دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''انّ النسبةَ بینهما نسبة العدم والملکة؛ خیر و شر کے درمیان ملکہ اور عدم ملکہ کی نسبت ہے''۔ یعنی ایک جانب وجود ہے تو دوسری جانب اُسی وجود کا نہ ہونا ہے، جبکہ اس میں اس وجود کے ہونے کی ظرفیت وصلاحیت پائی جاتی ہو جیسے علم و جہل، بینائی و نابینائی، نابینا ہونا انسان کے حق میں شر تو ہوسکتا ہے مگر دیوار و در کے لئے شر نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں یہ صلاحیت فطرتاً موجود ہی نہیں ہے۔

---

[1]۔ اسفار اربعہ، ملا صدرا، ج۷، ص۵۷.

[2]۔ الحیات، شفا، ص۳۵۵.

[3]۔ اسفار اربعہ، ملا صدرا، ج۷، ص۵۸.

[4]۔ تفسیر المیزان، ج۳، ص۱۳۴.

اسی طرح خیر بھی کبھی مطلق ہوتا ہے تو کبھی مقید ہوتا ہے۔ خیرِ مطلق خود ذات اقدس الٰہی ہے جس سے ہر کوئی فطری طور پر قریب ہونا چاہتا ہے یا اس کی نعمتوں میں جنت اور اس کی دائمی نعمتیں، ہر انسان کے لئے خیر مطلق ہیں؛ کیونکہ ہر شخص (خواہ وہ کسی بھی مذہب اور مسلک سے تعلق رکھتا ہو) جنت کا مشتاق ہے۔ کبھی خیر مقید ہوتا ہے یعنی ایک چیز ایک وقت کسی ایک انسان کے لئے خیر کا مصداق ہوتی ہے تو وہی چیز کسی دوسرے کے لئے شر کا مصداق ہوتی ہے جیسے مال و دولت۔

اسی لئے خالق کائنات نے قرآن کریم میں مال کو کہیں خیر کہا ہے:

﴿إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمْ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْراً الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ﴾[۱]

”تمہارے اوپر لکھ دیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت سامنے آجائے اور اگر کوئی مال چھوڑا ہے تو اپنے ماں باپ اور قرابتداروں کے لئے وصیت کرے“

اس آیۂ کریمہ میں خداوند عالم نے مال کو خیر قرار دیا ہے لہٰذا مفسرین نے مذکورہ آیہ کریمہ میں خیر کا ترجمہ مال سے کیا ہے، لیکن یہی مال و دولت ظالموں اور مستکبروں کے لئے شر کا باعث بھی ہے۔

خیر کے برخلاف شر ہمیشہ امر عدم، مضاف و مقید ہے یعنی کوئی چیز دنیا میں مطلق شر نہیں ہے، اسی لئے مرحوم فیض کاشانی آیۂ مبارکہ ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَي كُلِّ

۱۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۰.

شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾[۱] کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ خداوند کریم تمام خیرات کا خالق ہےاور شرور امور عدمی ہیں لہٰذا انھیں خالق کی ضرورت نہیں ہے[۲]۔ خداوند کریم خیر محض ہے، لہٰذا خالق شر نہیں ہو سکتا اور یوں بھی شر ایک امر عدمی ہے تو پھر اس کی تخلیق کی بحث ہی بیکار ہے۔

افلاطون نے شرور کے بارے میں کہا کہ: بعض شرور خود انسان کی کوتاہی کی بناپر ہے جیسے جہل و ذلت وغیرہ اور کبھی شرور خود عالم طبیعت میں ہیں جیسے زلزلہ، یہ زلزلہ ایک امر وجودی نہیں ہے بلکہ زمین کے کمالِ استقامت کا فقدان ہے، فلسفۂ خیر و شر کی بحث کے ذیل میں فلسفیوں، حکیموں اور دانشوروں نے اپنی اپنی کتابوں میں بڑی طویل و عریض گفتگو کی ہے اور اس کی مختلف تقسیم کی ہے جن کا ذکر یہاں پر ممکن نہیں ہے، مختصر یہ ہے کہ ہر انسان فطری طور پر اپنے لئے خیر چاہتا ہے اور شر سے خود کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ ذاتِ اقدس الٰہی خیر مطلق ہے لہٰذا بندہ کا اس کے بتائی ہوئی راہ پر چل کر اس کی معنوی قربت کا حاصل کرنا خیر ہے۔ اور ہر وہ چیز جو بندہ کو اللہ سے دور کردیتی ہے وہ شر ہے، انسان نیک اعمال کے انجام دہی سے قربت الٰہی حاصل کرسکتا ہے، لہٰذا تمام نیکیاں خیر کے مصادیق میں ہیں اس کے برخلاف بُرے اعمال کی بناپر بندہ اپنے خدا سے دور ہوتا چلا جاتا ہے لہٰذا تمام برائیاں شر کے مصادیق میں ہیں۔

۱۔ سورۂ آل عمران، آیت ۲۶.
۲۔ تفسیر صافی، ج ۷، ص

شہید مطہریؒ فرماتے ہیں: ''اگر نیکیوں اور برائیوں کے درمیان تقابل نہ ہوتا تو نہ نیکی، نیکی کہلاتی اور نہ برائی برائی کہلاتی؛ کیونکہ ہر چیز اپنے مدّمقابل سے پہچانی جاتی ہے''[۱]

اسی لئے خالق کائنات قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿كُلُّ نَفْس ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ﴾[۲]

''ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور ہم تو اچھائی اور برائی کے ذریعہ تم سب کو آزمائیں گے اور تم سب پلٹ کر ہماری ہی بارگاہ میں لائے جاؤگے''

اس آیۂ کریمہ سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ خداوند کریم کبھی انسان کو نعمتیں عطا کرکے آزماتا ہے تو کبھی نعمتوں کو روک کر آزماتا ہے۔ نعمتوں کا روکنا ہی بندہ کے حق میں شر ہے۔

آج کی دعا میں بندہ کی درخواست بارگاہ ربّ العزّت میں یہی ہے: مالک! جتنی نعمتیں تو آج کی شب نازل کرنے والا ہے، اُن تمام نعمتوں میں مجھے حصّہ دار فرما اور اہلبیت اطہار علیہم السلام وہ ذوات مقدسہ ہیں جنھوں نے اللہ کے ہر فیصلہ کو اپنے لئے خیر تصور کیا اور اس سے اپنی رضامندی کا اعلان کیا ہے، لہٰذا ہر مصیبت پر اُن کے لبوں پر یہی جملہ رہا: ''رضا بقضائه و تسليماً لامره''۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نے شب

۱۔ عدل الٰہی، شہید مطہری، ص۱۶۵.

۲۔ سورۂ انبیاء، آیت ۳۵.

ہجرت، وقت مصیبت بھی سجدۂ شکر کرکے یہ ثابت کردیا کہ یہ مصیبت اگر قضاو قدر الٰہی کے تحت ہے تو پھر مصیبت نہیں ہے، بلکہ خیر ہے اور اسی طرح اُسی علی بن ابی طالب علیہ السلام کی تربیت یافتہ شیر دل بیٹی زینب کبریٰ علیہا السلام نے دربارِ کوفہ میں جب ابن زیاد ملعون نے پوچھا کہ اے زینب تم نے کربلا میں کیا دیکھا تو جواب میں فرمایا: ”ما رأیتُ الّا جمیلا؛ سوائے شان خدا کے میں نے کچھ نہیں دیکھا“۔ قضاو قدر الٰہی خیر ہے اور خیر، جمیل و خوبصورت ہوتا ہے، لہٰذا نمازِ عیدین کی قنوت میں ہمیں یہ کہنے کا حکم ہے ”اللّٰهم ادخلنی فی کلِّ خیر ادخلتَ فیه محمداً و آل محمد؛ خدایا! مجھے ہر اس خیر میں داخل فرما جس میں تو نے محمدؐ وآل محمدؐ کو داخل کیا ہے“ اور قرآن کریم کا بھی یہی حکم ہے:

﴿وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾[۱]

”اور تم صادقین کے ساتھ ہو جاؤ“

صادقین کے ساتھ ہونے کا مطلب ان کے راستے کو اپنانا ہے اور اُن کی راہ ”الی اللہ“ ہے یعنی اُن کی راہ کی منزل، مقامِ قربت الٰہی ہے اور اُن کی راہ کو اپنانے کا مطلب اُن کی سیرت و کردار کو اپنے لئے نمونۂ عمل قرار دینا ہے۔ اُن کی سیرت شجاعت، ایثار اور عبادت و اطاعت الٰہی ہے۔ لہٰذا اُن کی راہ، راہِ عبادت، راہِ سخاوت، راہِ شہادت، راہِ ایثار و قربانی، راہ صدق و صفا اور راہِ سعادت و کمال ہے جس کی انتہا پر ”فزت و ربّ الکعبہ“ کی مہرِ عصمت ہے۔

۱۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۱۹

ان کی راہ پر چلنے کی آرزو انسانیت کی فطری اور اجتماعی آرزو ہے اسی لئے قرآن کریم میں خداوند عالم نے ہماری اس اجتماعی وفطری آروز کو لفظوں کا لباس عطا کرکے سورۂ حمد میں یوں نقل کیا ہے: ”اهْدِنَا الصِّرَٰطَ الْمُسْتَقِيمَ“ ”صراط مستقیم پر ہماری ہدایت فرما“۔ اگر یہ کسی ایک انسان کی انفرادی آرزو ہوتی تو ”اهدنا“ نہ کہتا، بلکہ ”اهدی“ کہتا۔ ”اهدنا“ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کسی ایک یا چند انسانوں کی تمنّا نہیں، بلکہ یہ فطرتِ انسان کی سچی طلب ہے جسے اللہ نے سورۂ حمد میں بتادیا کہ صراط مستقیم انسان کی فطری آرزو ہے ”صِرَٰطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ صراط مستقیم اُن کی راہ ہے جن پر تونے اپنی نعمتوں کو نازل فرمایا اور اہلبیت اطہار علیہم السلام اُن ذوات مقدسہ میں سے ہیں جن پر اللہ نے اپنی نعمتوں کو نازل فرمایا ہے۔

اس دعا کے آخر میں اللہ کو اس کے جود و کرم کا واسطہ دیا جارہا ہے ” يَا أَجْوَدَ الْاَجْوَدِين “ تجھے تیرے جود و بخشش کا واسطہ اے بڑے جود و بخشش والے۔ چونکہ دعا میں طلبِ خیر کی درخواست ہے۔ یعنی اس کی نعمتوں کی بخشش سے متعلق دعا ہے، لہٰذا واسطہ کے لئے صفتِ جود کا انتخاب بھی اسی مناسبت سے ہے، حقیقی جواد خود خالقِ کائنات کی ذات اقدس ہے اگر کوئی دنیا میں صاحبِ جود و کرم ہے تو وہ ذاتی اور مستقل طور پر نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی عنایت اور اجازت سے صاحبِ جود و کرم ہے۔ خدا کی جود و سخا اس قدر وسیع ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبۂ شعبانیہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"إِلَهِي جُودُكَ بَسَطَ أَمَلِي"

”بارالٰہا! تیرے جُود و سخاوت نے میری امید کو بڑھادیا ہے“

اور یہی جملہ دعائے ابو حمزہ میں بھی موجود ہے، امام سجاد علیہ السلام اس دعا میں اس طرح فرما رہے ہیں:

"يَا خَيْرَ مَنْ سُئِلَ، وَ أَجْوَدَ مَنْ أَعْطَى"

"اے بہترین ذات جس سے سوال کیا جائے اور بہترین عطا کرنے والے"

دعائے ابو حمزہ میں اس کے علاوہ اور بھی جملے موجود ہیں جن سے خالق کائنات کی صفتِ جود و کرم کی شرح و تفسیر ہو سکتی ہے۔

چوتھی تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ قَوِّنی فِيهِ عَلَى إقامَةِ أَمْرِكَ وَأَذِقْنی فِيهِ حَلاوَةَ ذِكْرِكَ وَأَوْزِعْنی فِيهِ لِاَدَاءِ شُكْرِكَ بِكَرَمِكَ وَاحْفَظْنی فِيهِ بِحِفْظِكَ وَسَتْرِكَ يَا أَبْصَرَ النَّاظِرِينَ».

"خدایا! تو مجھے اس دن میں اپنے امر کے بجالانے کی قوت عطا کر، مجھے اس دن میں اپنی یاد اور ذکر کی شیرینی چکھادے، مجھے اس دن میں اپنے شکرادا کرنے پر آمادہ کر اور مجھے اپنی حفاظت اور اپنی پردہ پوشی کے ذریعہ محفوظ کر، اے سب سے زیادہ دیکھنے والے"

اہم مطالب:

آج کے دن کی دعامیں خالق کائنات کی بارگاہ میں چار اہم چیزوں کی درخواست ہے:

۱۔ واجبات اور فرائض الٰہی کے ادائیگی کے لئے قوت وطاقت کی

۲۔ ذکرِ خدا کے حصول کی

۳۔ ادائے شکرِ خدا کے لئے توفیق وآمادگی کی

۴۔ ہر خطا ومصیبت سے اپنی حفاظت کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ قَوِّنِی فِیهِ عَلَى إقامَةِ أَمْرِكَ"

جس انسان پر اللہ کے احکام واجب ہوجاتے ہیں اُسے شرعی اصطلاح میں "مُکلَّف" کہتے ہیں یعنی اس پر تکلیف واجب ہوجاتی ہے اور تکلیف کے معنی حکم الٰہی کے ہیں، شرائطِ تکلیف تین ہیں: ا۔ بلوغ ۲۔ عقل ۳۔ قدرت

جب تک لڑکا یا لڑکی بالغ نہیں ہوجاتے ان پر شرعی احکام پر عمل کرنا واجب نہیں ہے، بلوغ کے بعد دوسری شرط عقل ہے یعنی وہ دیوانہ نہ ہو؛ کیونکہ دیوانے پر کوئی چیز واجب نہیں ہے اور تیسری شرط قدرت ہے یعنی انسان عمل کے انجام دینے پر قدرت رکھتا ہو، لہٰذا اگر کوئی شخص ماہِ مبارک رمضان میں بیمار ہے تو اُس پر روزہ رکھنا واجب نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں روزہ رکھنے کی طاقت نہیں ہے، مگر جب وہ شفا پا جائے اور طاقت لوٹ آئے تو اس پر روزہ کی قضا واجب ہے۔ تمام احکامِ شرعی کے انجام دینے کے لئے یہ تین عام شرطیں ہیں، ان کے علاوہ ہر حکم کے بجالانے کے لئے اس کے اپنے مخصوص شرائط ہیں جیسے نماز کے لئے طہارت، حج کے لئے استطاعت اور جہاد کے لئے امامِ وقت کی اجازت۔ مگر آج کی اس دعا میں احکام و اوامرِ الٰہی کی بجاآوری کے لئے خداوند کریم سے جس قوت و طاقت کی درخواست کی جارہی ہے شاید اُس قوت و طاقت کے علاوہ بھی ہے جس کا تعلق شرائط تکلیف سے ہے، بسا اوقات انسان سستی و کاہلی کی بناپر یا نفسانی خواہشات کے غلبہ کی بناپر دستوراتِ الٰہی پر عمل کرنے سے کوتاہی برتتا ہے اور صبح کی اذان سن کر بھی بستر چھوڑنے سے کتراتا ہے، اس کی یہ کوتاہی قدرت کے نہ ہونے کی بناپر نہیں ہے بلکہ جہل، سستی یا شیطانی وسوسوں کی بناپر ہے۔ لہٰذا آج

کی اس دعا میں خداوند کریم کی بارگاہ میں ایک بندہ کی یہی درخواست ہے خدایا! آج مجھ میں وہ طاقت عطا فرما جس کے ہوتے ہوئے میں تیرے کسی حکم سے روگردانی نہ کرسکوں، یہ قوت دراصل توفیق الٰہی ہے۔

دعائے کمیل میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"يَا رَبِ قَوِّ عَلَى خِدْمَتِكَ جَوَارِحِي وَ اشْدُدْ عَلَى الْعَزِيمَةِ جَوَانِحِي"

"پروردگارا! میرے اعضاء و جوارح کو اپنی خدمت (عبادت) کے لئے قوی و مضبوط کردے اور اس ارادہ کے لئے میرے قلب کو توانا کردے"

دعا کے اس جملہ میں خدمت سے مراد عبادت ہے اور اس عبادت کا فائدہ بھی خود بندہ کے لئے ہے۔

عبادتِ الٰہی کے لئے جس طرح جسم کو قوت کی ضرورت ہے اسی طرح قلب و روح کو بھی قوت کی ضرورت ہے؛ کیونکہ جسم کی حرکت عبادت کے لئے روح کی قوت پر مبنی ہے، لہٰذا روح کی بیماری جسم کی بیماری سے زیادہ سخت ہے۔

یہ قوت ایک الٰہی توفیق ہے، اس توفیق کے حصول کے لئے بندہ پر خود ہی مقدمات کو فراہم کرنا ضروری ہے، اگر بندہ خدا کی عبادت کے لئے ایک قدم آگے بڑھاتا ہے تو خدا خود اس کا سہارا بن جاتا ہے۔ حدیث قدسی میں آیا ہے:

"مَنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ شِبْراً تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعاً"[1]

"جو بھی مجھ سے ایک بالشت قرب ہوگا میں اس سے ایک ذراع (ایک ہاتھ) قریب ہوجاؤں گا"

---

[1] بحار الانوار، ج ۸۷، ص ۱۹۰۔

البتہ وجب اور ذراع، سے مراد قربت مکانی نہیں ہے؛ کیونکہ خدا کے لئے قربتِ مکانی کا تصور محال ہے بلکہ معنوی قربت مراد ہے۔

دوسرا فقرہ: "أَذِقْنِی فِیهِ حَلاوَةَ ذِكْرِكَ"

ذکر

ذکر یعنی کسی بھی شئ کی یادآوری ہے اور یہ کبھی زبان کے ذیعہ ہوتی ہے تو کبھی قلب سے۔[1] یعنی اگر انسان دل ہی دل میں کسی چیز کو یاد کرے اور اس کو زبان پر جاری نہ کرے تو اُسے بھی "ذکر" کہا جاتا ہے۔

"منازل السائرین" میں ذکر کے معنی اس طرح بیان ہوئے ہیں:

"الذّكرُ هُوَ التَّخَلُّصُ مِنَ الغَفلَةِ وَ النّسيَانِ"[2]

"ذکر یعنی غفلت اور فراموشی سے چھٹکارا" ذکر الٰہی سے مراد یادِ الٰہی ہے۔

علماء نے ذکر کی مختلف تقسیم اور درجات کو بیان کیا ہے۔

ذکر کے اقسام ومدارج

راغب اصفہانی نے اس کی دو قسمیں بیان کی ہیں:

۱۔ ذکرِ لسان یعنی زبان کے ذریعہ کسی کو یاد کرنا یا یاد رکھنا

۲۔ ذکرِ قلب یعنی زبان پر جاری نہ کرتے ہوئے بھی دل ہی دل میں کسی کو یاد کرنا۔

---

[1]۔ مفردات راغب، مادۂ ذکر، ص ۳۲۸.

[2]۔ شرح منازل السائرین، (خواجہ عبداللہ انصاری) شارح: علی شیروانی، ص ۱۶۳.

یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ ذکر کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ انسان کسی بھی چیز کو پہلے بھول جائے پھر اس کو وہ چیز یاد آجائے، بلکہ مسلسل کسی بھی چیز کو بغیر فراموشی اور غفلت کے یاد رکھنے کو بھی ذکر کہتے ہیں۔

امام معصوم علیہ السلام مدارج ذکر سے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"ذِكرُ اللّسَان الْحَمْدُ وَ الثَّنَاءُ وَ ذِكْرُ النَّفْسِ الْجَهْدُ وَ الْعَنَاءُ وَ ذِكْرُ الرُّوحِ الْخَوْفُ وَ الرَّجَاءُ وَ ذِكْرُ الْقَلْبِ الصِّدْقُ وَ الصَّفَاءُ وَ ذِكْرُ الْعَقْلِ التَّعْظِيمُ وَ الْحَيَاءُ وَ ذِكْرُ الْمَعْرِفَةِ التَّسْلِيمُ وَ الرِّضَا وَ ذِكْرُ السِّرِّ عَلَى رُؤْيَةِ اللّقَاء"

"ذکر لسان، حمد و ثنا ہے۔ ذکر نفس، کوشش و تحمل ہے۔ ذکر روح، خوف و امید ہے۔ ذکر دل، صدق و صفا ہے۔ ذکر عقل، تعظیم و حیا ہے۔ ذکر معرفت، تسلیم و رضا ہے۔ ذکر باطن، مشاہدہ وملاقات ہے"

علمائے اخلاق و عرفان نے بھی ذکر الٰہی کے مختلف درجات بیان کئے ہیں۔ ابن عربی نے اپنی تفسیر میں ذکرِ الٰہی کے چار درجے بیان کئے ہیں: ۱۔ ذکر لفظی ۲۔ ذکرِ قلبی ۳۔ ذکرِ سرّی ۴۔ ذکر روحی۔[1]

۱۔ ذکر لفظی: یعنی زبان سے تذکرہ کرتے ہوئے اللہ کی نعمتوں میں غور وفکر کرنا۔

۲۔ ذکر قلبی: یعنی صفات الٰہی کے مطالعہ کے ہمراہ عالمِ ملکوت میں غور و فکر کرنا۔

---

[1] تفسیر ابن عربی، ج، ص.

۳۔ ذکر سرّی: یعنی تنہائی میں زیر لب یا دل ہی دل میں دعا و مناجات کے ذریعہ خدا سے رابطہ قائم کرنا۔

۴۔ ذکر روحی: یعنی چشم و دل سے شہود کے منازل کو طے کرتے ہوئے اللہ کو یاد کرنا۔

خواجہ عبد اللہ انصاری نے "منازل السائرین" میں "ذکر الٰہی" کے تین مدارج کو ذکر کیا ہے: ۱۔ ذکر ظاہر ۲۔ ذکر خفی ۳۔ ذکر حقیقی۔[۱]

۱۔ ذکر ظاہر: یعنی حضورِ قلب کے ساتھ زبان سے اللہ کی حمد و ثنا کرنا۔

۲۔ ذکر خفی: یعنی دنیا کی ہر چیز سے قطعِ رابطہ کرکے قلبی توجہ کے ساتھ عالم شہود میں خدا سے راز و نیاز کرنا۔

۳۔ ذکر حقیقی: در حقیقت یہ فناء فی اللہ کی منزل ہے یعنی خود کو یادِ الٰہی میں اس طرح غرق کر دینا کہ دنیا کی کوئی چیز اس کی توجہ کو یادِ الٰہی سے ہٹا نہ سکے، اگر دنیا میں اس ذکرِ حقیقی کی زندہ مثال دیکھنا ہے تو مولی الموحّدین حضرت علی علیہ السلام کی نماز کو دیکھے جہاں پیر سے تیر نکال لی جاتی ہے اور مولا کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

عرفاء نے اس منزل کو "اتحادِ ذاکر و مذکور و ذکر" کا نام دیا ہے یعنی ذاکر کا مذکور میں فنا ہو جانا اور خود مذکور کا ذکر ہو جانا۔ شاید مرزا غالب نے اسی منزلِ ذکر سے متعلق یہ کہا ہے:

۱۔ شرح منازل السائرین، ص ۱۶۵.

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ذکرالٰہی آیات قرآنی کی روشنی میں

﴿أَلاَ بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾[1]

"آگاہ ہو جاؤ کہ یادِ خدا سے دلوں کو سکون ملتا ہے"

انسان چونکہ مختلف اسباب و علل کی بناپر بے چین وپریشان رہتا ہے کبھی اپنی باقی زندگی کو تاریک تصور کرکے مضطرب وپریشان رہتا ہے تو کبھی گذشتہ زندگی کی تلخیوں کی بناپر، تو کبھی بے ہدف زندگی سے پریشان رہتا ہے یا پھر بے انتہا زحمت و مشقت کے باوجود بھی اس کو وہ نتیجہ نہیں ملتا ہے جس کی اُسے توقع رہتی ہے۔ یا پھر آپسی رنجشوں کی بناپر یا اور بھی مختلف مسائل کی بناپر انسان مضطرب وپریشان رہتا ہے ایسے عالم میں صرف یادِ الٰہی ہی ہے جو اس کے دل کو اطمینان بخشتی ہے۔

یہاں پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مذکورہ آیۂ شریفہ میں تو اللہ نے اپنے ذکر کو دلوں کے سکون و اطمینان کا سبب قرار دیا مگر ایک دوسری آیت میں اللہ نے اپنے ذکر کو باعث خوف قرار دیا ہے جیسے: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ﴾[2] "صاحبان ایمان درحقیقت وہ لوگ ہیں جن کے سامنے ذکرِ خدا کیا

---

[1] سورۂ رعد، آیت ۲۸.

[2] سورۂ انفال، آیت ۲.

جائے تو ان کے قلوب (خوف خدا سے) نورانی ہو جاتے ہیں"۔ کیا یہ دو آیتیں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں اطمینان سے مراد، دنیا اور اس کے مشکلات کے مقابلہ اطمینان حاصل ہونا ہے، مگر دوسری آیت میں خوف سے مراد خوف خدا ہے یعنی اللہ کی عظمت و جلالت کے مقابل خود میں خوف و خشیت پیدا کرنا ہے۔

آج کی موجودہ تحقیق ہمیں یہ بتا رہی ہے کہ دنیا میں نہ صرف بوڑھوں، بلکہ جوانوں اور بچوں میں بھی افسردگی اور ڈپریشن کی بیماری عام ہو چکی ہے خصوصاً یورپ میں اس مرض سے تنگ آ کر لوگ یا تو بے راہ روی کا شکار ہو کر خود کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں جو ناممکن ہے یا پھر خود کشی کے ذریعہ خود کو ختم کرلینا چاہتے ہیں مگر افسردگی اور خود کشی کا جذبہ مذہبی اور دیندار لوگوں میں عام طور پر نہیں دیکھا گیا ہے، کیونکہ وہ ذکر خدا کے ذریعہ دلوں کو آرام بخشتے ہیں لہٰذا اللہ نے قرآن کریم کی متعدد آیات میں کثرت سے ذکر الٰہی کی تاکید کی ہے۔

﴿وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيراً لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾[1]

"اور اللہ کو بہت یاد کرو امید ہے کہ تم کامیابی حاصل کرلو"

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللهَ ذِكْراً كَثِيراً﴾[2]

---

[1] سورۂ انفال، آیت ۴۵.

[2] سورۂ احزاب، آیت ۴۱.

''ایمان والو اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا کرو''

ذکر الٰہی احادیث کی روشنی میں:

حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"الْمُؤْمِنُ دَائِمُ الذّكْرِ كَثِيرُ الْفِكْرِ"[1]

''مومن ہمیشہ اللہ کی یاد اور اس کی نعمتوں میں غور و فکر کرتا ہے''

"أَصْلُ صَلَاحِ الْقَلْبِ اشْتِغَالُهُ بِذِكْرِ اللَّهِ"[2]

''دل کے صلاح و پاکیزگی کی جڑ خود کو ذکر خدا میں مشغول رکھنا ہے''

"الذّكْرُ هِدَايَةُ الْعُقُولِ وَ تَبْصِرَةُ النُّفُوس"[3]

''ذکر عقلوں کی ہدایت اور نفوس کی بصیرت کا سبب ہے''

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

"ذكر اللّه شفاء القلوب"[4]

''ذکر خدا دلوں کے لئے شفا ہے''

ان کے علاوہ معصومین علیہم السلام سے ذکر الٰہی، ذکر کے فائدے، ذکر کے خاص اوقات اور ذکر کے موانع وغیرہ سے متعلق روایات کی معتبر کتابوں میں بے شمار احادیث موجود ہیں۔[1]

۱۔ غرر الحکم، ح ۱۹۳۳.
۲۔ غرر الحکم، ح ۸۸۷۲.
۳۔ غرر الحکم، ح ۱۴۰۳.
۴۔ کنز العمال، ۱۳۵۱.

ذکر الٰہی کی شیرینی

انسان کی خصوصیتوں میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ لذت کا طالب ہوتا ہے جس طرح جسم کو لذّت کی ضرورت ہے اس طرح روح بھی طالبِ لذت ہوتی ہے، جسم کی لذتیں فوری طور پر محسوس ہوجاتی ہیں، مگر روحانی و معنوی لذت کے حصول کے لئے وقت درکار ہے اور اس کے لئے خاص شرائط کا لحاظ کرنا ضروری ہے، معنوی لذتوں کا مادی اور جسمانی لذتوں سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا، معنوی لذت کے حصول کے لئے گناہوں سے پرہیز اور واجبات پر عمل کرنا ضروری ہے۔

آیۃ اللہ مصباح یزدی "مناجات خمس عشر" کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اگر اللہ اپنے بندہ پر اس کے گناہوں کی بنا پر اس دنیا میں سزا دینا چاہتا ہے تو سب سے پہلے ذکر الٰہی، دعا و مناجات کی لذت اور حلاوت و شیرینی کو اس سے چھین لیتا ہے، لہٰذا اگر کسی کو نماز اور دیگر عبادات یا دعا و مناجات سے لذت و شیرینی محسوس نہیں ہورہی ہے تو اُسے چاہئے کہ وہ اپنے اعمال پر نگاہ کرے۔ اس کے برخلاف اگر اللہ اپنے بندہ سے راضی رہتا ہے تو اس کے لئے اپنے ذکر کی حلاوت کو بڑھا دیتا ہے تاکہ اس کا محبوب بندہ اس کی بارگاہ میں زیادہ دیر تک اس سے محو خطاب رہے۔ سچی محبت کا راز بھی یہی ہے کہ مُحب اپنے محبوب کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارنا چاہتا ہے۔ ہم نے دنیاوی اور مجازی محبت میں بھی یہ کرشمہ دیکھا ہے، دو محبت کرنے والے دنیا ومافیہا سے بیگانہ ہوکر ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے ایک دوسرے میں

---

[1] ۔اسی سلسلے میں مزید احادیث کے لئے میزان الحکمہ، ج ۴، مادۂ ذکر کی طرف رجوع کریں۔

کھو جاتے ہیں، لہٰذا خدا سے حقیقی محبت ہے تو بندہ اس کے ذکر کی حلاوت کو اپنی روح وجان میں محسوس کر سکتا ہے، پھر ایسے بندہ کو نمازوں میں بھی مزہ آتا ہے اور وہ دعا و مناجات میں بھی لذت محسوس کرتا ہے۔

اسی لئے امیر المومنین علیہ السلام دعائے شعبانیہ میں فرماتے ہیں:

"إِلَهِي هَبْ لِي قَلْباً يُدْنِيهِ مِنْكَ شَوْقُهُ وَ لِسَاناً يرفع [يَرْفَعُهُ] إِلَيْكَ صِدْقُهُ وَ نَظَراً يُقَرِّبُهُ مِنْكَ حَقُّهُ"

"اے میرے معبود! مجھ کو وہ دل عطا کر جو تیرے مقامِ قرب کا مشتاق ہو اور وہ زبان دے جس کی صداقت تیری طرف بلند ہو اور وہ نگاہ دے جو تیرا قرب تلاش کرے"

پھر آگے فرماتے ہیں:

"إِلَهِي هَبْ لِي كَمَالَ الِانْقِطَاعِ إِلَيْكَ"[۱]

"بارالٰہا! میرا دنیا کی ہر چیز سے مکمل رابطہ قطع کرکے صرف اپنا حضور عطا کر"

یہ حالت اُن ہی کو حاصل ہو سکتی ہے، جنھوں نے ذکر الٰہی کی حلاوت کو محسوس کر لیا ہے، اسی لئے ہمارے ائمہ اطہار علیہم السلام ساری ساری رات نمازوں میں گذار دیتے تھے؛ کیونکہ وہ لذت و حلاوتِ ذکر الٰہی سے مکمل طور سے آشنا تھے اور ان کے علاوہ دوسرے افراد کبھی بھی ایسی حلاوت و شیرینی کو محسوس نہیں کر سکتے۔

---

[۱] مناجات شعبانیہ، مفاتیح الجنان.

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الذّكْرُ لَذَّةُ الْمُحِبِّينَ"[۱]

"ذکرِ خدااس سے محبت کرنے والوں کے لئے باعثِ لذّت ہے"

"ذِكْرُ اللَّهِ... لَذَّةُ كُلِ مُوقِنٍ"[۲]

"ذکرِ خدا... ہر صاحبِ یقین کے لئے باعثِ لذت ہے"

امام سجاد علیہ السلام اپنی دعامیں فرماتے ہیں:

"أَسْتَغْفِرُكَ مِنْ كُلِ لَذَّةٍ بِغَيْرِ ذِكْرِكَ"[۳]

"خدایا! تجھ سے تیری یاد (کی لذت) کے علاوہ ہر لذت سے استغفار کرتا ہوں"

لہٰذا بندہ اس ذکر کی حلاوت و شیرینی کی لذت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے معبود کی بارگاہ میں آج کے دن کی دعامیں التجا کررہاہے: "خدایا! مجھ کو تواپنے ذکر کی شیرینی کاذائقہ عطاکر"۔

۱۔ غرر الحکم، ح۶۷۰۔

۲۔ غرر الحکم، ح۵۱۷۴۔

۳۔ بحار الانوار، ج۹۴، ص۱۵۱۔

تیسرا فقرہ: "وَأَوْزِعْنِی فِیهِ لِاَدَاءِ شُکْرِكَ بِکَرَمِكَ"

شکر کے معنی و مفہوم:

جب کبھی کسی سے کوئی چیز یا کوئی خیر و نیکی کسی تک پہنچے تو اس نیکی کرنے والے کی قدر دانی کرنا شکر کہلاتا ہے۔

۱۔ کبھی ایک انسان دوسرے انسان کا شکریہ ادا کرتا ہے جیسا کہ امام علی رضا علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے۔

"مَنْ لَمْ یَشْکُرِ الْمُنْعِمَ مِنَ الْمَخْلُوقِینَ لَمْ یَشْکُرِ اللَّهَ عَزَّ وَ جَلَّ".[1]

”جس نے مخلوقین میں سے نعمت دینے والے مخلوق کا شکریہ ادا نہیں کیا گویا اس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا“

۲۔ کبھی خود خداوند کریم بھی اپنے نیک بندوں کا ان کے نیک اعمال کی بناپر شکریہ ادا کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

﴿إِنَّ هَذَا کَانَ لَکُمْ جَزَاءً وَکَانَ سَعْیُکُمْ مَشْکُوراً﴾[2]

”یہ سب تمہاری جزا ہے اور تمہاری سعی قابل قدر ہے“

یہ آیۂ کریمہ اہلبیت علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے، بلکہ یہ پورا سورہ (سورۂ انسان) اہلبیت علیہم السلام ہی سے متعلق ہے۔ کتب تفاسیر میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

۳۔ کبھی بندہ اپنے معبود کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

---

[1] عیون اخبار الرضاؑ، ج۲، ص ۲۴.

[2] سورۂ دہر (انسان)، آیت ۲۲.

یہاں ہماری گفتگو آخری قسم سے متعلق ہے، کیونکہ آج کی دعا میں بندہ اپنے معبود کی بارگاہ میں یہ درخواست کررہاہے:

''خدایا! اس دن مجھ کو اپنے کرم کے ذریعہ اپناشکرادا کرنے کے لئے آمادہ کر''

حقیقی مُنعم خداوند کریم کی ذاتِ مقدسہ ہے، لٰہذا بندہ پر لازم ہے کہ وہ الٰہی نعمتوں کے عوض اُس کا شکر بجالائے۔

شکرِ خدا کی تعریف:

راغب اصفہانی نے شکر کی کچھ اس طرح تعریف کی ہے:

"الشُّكْرُ: تصوُّر النّعمةِ و إظهارُها"[1]

''شکر یعنی نعمت کا تصور اور اس کا اظہار''

تصورِ نعمت کا مطلب یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے اللہ کی دی ہوئی نعمت کو اس کی نعمت سمجھے، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"مَنْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ بِنِعْمَةٍ فَعَرَفَهَا بِقَلْبِهِ"[2]

''جس کسی کو اللہ اپنی نعمت عطا کرتا ہے تو اُسے چاہئے کہ وہ اپنے دل سے اُسے پہچانے یعنی تہہِ دل سے اس نعمت کی قدر کرے''

۱۔ مفردات الفاظ القرآن، راغب اصفہانی، مادۂ شکر۔

۲۔ کافی، باب شکر، ح۱۵، ج۲، ص۹۶۔

خواجہ عبد اللہ انصاری نے بھی اپنی کتاب "منازل السائرین" میں شکر کی تعریف اس طرح کی ہے:

"الشكر اسمٌ لِمَعرفَةِ النّعمَةِ لانّهَا السبيلُ الیٰ مَعرفَةِ المُنعِمِ"[1]

"شکر، شناختِ نعمت کو کہتے ہیں، کیونکہ شناختِ نعمت شناختِ مُنعم کا ذریعہ ہے"

علامہ طباطبائیؒ تفسیر المیزان میں ﴿... وَسَيَجْزِي اللهُ الشَّاكِرِينَ﴾[2] "عنقریب اللہ شکر کرنے والوں کو جزا دے گا"۔ اس آیۂ کریمہ کی توضیح میں فرماتے ہیں: "درحقیقت شکر، اظہارِ نعمت ہے اور شکر کے مقابل کفر ہے یعنی اخفائے نعمت۔ اظہارِ نعمت کا مطلب اس نعمت کا صحیح استعمال کرنا ہے"۔[3]

اظہارِ نعمت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اپنی بڑائی کے لئے اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو دوسروں کو دکھائے اور اس پر فخر و مباہات کرے، اظہارِ نعمت سے مراد اللہ نے جن نعمتوں کو عطا کیا انھیں مناسب اور صحیح مقام پر استعمال کرنا ہے جیسے آنکھ اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے اِن آنکھوں سے وہی کام لے جس کا ہمیں حکم دیا ہے مثلاً قرآن پڑھیں، مقامات مقدسہ کی زیارت کریں اور ان چیزوں پر نگاہ نہ کریں جنھیں دیکھنے سے منع کیا گیا ہے، اگر ایسا نہ کیا تو یہ اظہارِ نعمت نہیں، بلکہ اخفائے نعمت یعنی کفرانِ نعمت ہے۔

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

۱۔ شرح منازل السائرین، (شارح: علی شیروانی ۱۱۷)، ص ۱۱۷.

۲۔ سورۂ آل عمران: آیت ۳.

۳۔ تفسیر المیزان، ج ۷، ص ۶۵.

"أَقَلُّ مَا يَجِبُ لِلْمُنْعِمِ أَنْ لَا يُعْصَى بِنِعْمَتِهِ"[۱]

''نعمت دینے والے کے مقابل (نعمت پانے والے کا) کمترین فریضہ یہ ہے کہ وہ اس کی نعمت کے ساتھ گناہ و نافرمانی نہ کرے''

یعنی اس نعمت کا وہیں استعمال کرے جہاں وہ چاہتا ہے اور جس چیز سے منع کر دے وہ اس سے رُک جائے چنانچہ ایک اور مقام پر مولائے کائنات ارشاد فرماتے ہیں:

"أَقَلُ مَا يَلْزَمُكُمْ لِلَّهِ تَعَالَى أَنْ لَا تَسْتَعِينُوا بِنِعَمِهِ عَلَى مَعَاصِيهِ"[۲]

''خدا کا سب سے ادنیٰ حق یہ ہے کہ اس کی نعمت کو اس کی معصیت کا ذریعہ نہ بناؤ''

یہ بات واضح ہے کہ انسان کا سارا وجود نعمتِ پروردگار ہے لہٰذا وہ اپنے وجود کا کوئی بھی حصہ پروردگار کی معصیت اور مخالفت میں صرف نہ کرے۔

شکر کے مراحل

شکر کی تین قسم ہیں:

ا۔ قلبی شکر

یعنی نعمتِ الٰہی کا تصور کرکے تہہِ دل سے اس کی قدردانی کرنا اور دینے والے کی بارگاہ میں زبانِ قلب سے خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے عجز و ناتوانی کا اعتراف کرتے ہوئے نعمتوں کے مقابل اس کی حمد و ثنا کرنا۔

۱۔ غرر الحکم، ح۳۲۶۸۔
۲۔ نہج البلاغہ، حکمت ۳۳۰۔

۲۔ زبانی شکر

یعنی شکر قلبی کے ہمراہ زبان سے بھی نعمت عطا کرنے والے کی حمد و ثنا کرنا، امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: جب بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کوئی خوش کرنے والی بات پیش آتی تھی تو آپ "الحمد لله على هذه النعمة" کہتے تھے اور جب بھی کوئی غمزدہ بات پیش آتی تھی تو آپ "الحمد لله علىٰ كلّ حال" کہتے تھے۔[1]

۳۔ عملی شکر

یعنی بندہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح استعمال کرے اور جس امر کا حکم دیا گیا ہے، اُسے بجالائے اور جن چیزوں سے بچنے کے لئے گیا کہا ہے اُن سے اجتناب کرے، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"شُكْرُ النِّعْمَةِ اجْتِنابُ الْمَحارِمِ"[2]

"نعمت کا شکر محرمات سے پرہیز ہے"

حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"شُكْرُ الْمُؤْمِنِ يَظْهَرُ فِي عَمَلِهِ، وَشُكْرُ الْمُنَافِقِ لَا يَتَجَاوَزُ لِسَانَه"[3]

"مومن کی شکر گذاری اس کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے اور منافق زبان سے آگے نہیں بڑھتا"

---

[1]۔ کافی، ج۲، ص۹۷

[2]۔ کافی، ج۲، ص۹۵

[3]۔ غرر الحکم، ۵۶۶۱

نماز، اظہارِ شکر کا اعلیٰ ترین مصداق

نماز، پروردگار عالم کے شکر کی بہترین مثال اور اعلیٰ ترین مصداق ہے جس میں شکر کے تینوں مراحل موجود ہیں، زبان پر سورۂ حمد کی تلاوت ہے تو دل، خالق کی بارگاہ میں خاضع و خاشع ہے اور ساتھ ہی ساتھ کلمۂ اللہ اکبر کے ذریعہ اس کی بزرگی کا اعلان اور اپنے ناچیز ہونے کا اقرار بھی ہے۔ رکوع و سجود کے عمل کے ذریعہ بھی خضوع و خشوع کا اظہار ہے، اسی لئے جب خداوند کریم نے پیغمبر اکرم ﷺ کو کوثر (خیر کثیر) عطا کیا تو ساتھ ہی میں یہ حکم دیا: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ ”پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھیں اور قربانی دیں“۔

جب انسان نعمتوں کے مقابل خالق کائنات کا عملی طور پر شکر بجالاتا رہے گا تو خالق کا وعدہ ہے کہ وہ اس پر نعمتوں کو اور اضافہ کردیگا

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾[1]

”اگر تم ہمارا شکر ادا کروگے تو ہم نعمتوں میں اضافہ کردیں گے اور اگر کفران نعمت کروگے تو ہمارا عذاب بہت سخت ہوگا“

شکر کی توفیق

نعمتوں کے مقابل، بارگاہ خداوندی میں شکرگذاری کی توفیق حاصل کرنا خود اپنی جگہ ایک نعمت ہے، اس لئے کہ اللہ نے بندہ کو اپنی نعمتوں کے عوض شکر کرنے کی توفیق عطا کی ہے؛ کیونکہ اگر اس کی توفیق شامل حال نہ ہوتی تو بندہ اللہ کی نعمتوں کے

---

[1] سورۂ نمل، آیت ۱۹.

مقابل شکر بجالانے کی طرف متوجہ نہ ہوتا، لہٰذا توفیقِ شکر خود مقامِ شکر ہے اسی لئے حضرت سلیمان پیغمبرؑ نے خدا کی نعمتوں کے مقابل بارگاہ الٰہی میں یہ درخواست فرمائی:

﴿رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلى والِدَيَّ﴾[1]

"اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا کی ہے"

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"إِذْ [إِذَا] وَفَّقَهُ لِشُكْرِهِ وَ هُوَ شُكْرُ الشُّكْرِ"[2]

"جس نے بھی خدائے سبحانہ کا شکریہ ادا کیا اُس پر دوسرا شکر لازم ہو جاتا ہے؛ کیونکہ خدا نے اُسے اپنے شکر کی توفیق عطا کی ہے اور یہ امر شکر کے لئے شکر ہے"

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام بارگاہ خداوندی میں مناجات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَكَيْفَ لِي بِتَحْصِيلِ الشُّكْرِ وَ شُكْرِي إِيَّاكَ يَفْتَقِرُ إِلَى شُكْرٍ فَكُلَّمَا قُلْتُ لَكَ الْحَمْدُ وَجَبَ عَلَيَّ لِذَلِكَ أَنْ أَقُولَ لَكَ الْحَمْدُ"[3]

۱۔ سورۂ ابراہیم، آیت ۷۔

۲۔ غرر الحکم، ۹۱۱۹۔

۳۔ بحار الانوار، ج ۹۴، ص ۱۴۶۔

"پس کیسے میں تیرے شکر کو بجالاؤں؟ جبکہ میری یہ شکرگذاری تیرے دوسرے شکر کی محتاج ہے، پس جب بھی "لك الحمد" کہتا ہوں تو اس کے کہنے سے دوسری مرتبہ "لك الحمد" کہنا مجھ پر لازم ہو جاتا ہے"

اِن احادیث کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ شکرگذاری کی توفیق بھی اللہ کی عطا کردہ ایک نعمت ہے، لہٰذا اس نعمت کے حصول پر بھی شکر بجالانا ضروری ہے مذکورہ دعا میں بارگاہِ الٰہی میں بندہ کی یہی درخواست ہے:

"أوْزِعْنِي فِيهِ لِأَدَاء شُكْرِكَ بِكَرَمِكَ"

"خدایا! اپنے کرم کی بدولت ہمیں اپنا شکر بجالانے کی توفیق عطافرما"

شکرگذار باایمان ضعیفہ کی داستان

اس مقام پر اس واقعہ کو ذکر کرنا مناسب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے معبود کی بارگاہ میں التجا کی: خدایا! مجھے ایک ایسے انسان کی نشاندہی فرما جسے تو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے، اللہ نے حضرت عیسیٰ کو ان کی التجا پر انھیں آبادی سے دور دریا کے کنارے ایک بوڑھی عورت کی نشاندہی فرمائی، حضرت مسیح اس بوڑھی عورت کو تلاش کرتے ہوئے دریا کے اس کنارے تک پہنچ گئے جہاں وہ زندگی گذار رہی تھی، کیا دیکھا! ایک ٹوٹے پھوٹے جھوپڑے کے ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی ایک ضعیفہ "الحمد لله المنعم المفضل المجمل المکرم" کا ذکر کر رہی ہے، وہ جس گھر میں تھی وہاں زندگی بسر کرنے کے ساز و سامان نہ تھے اور وہ بڑھیا فالج کا شکار پورے بدن سے اپاہج اور نابینا بھی تھی چلنے پھرنے اور اٹھنے، بیٹھنے کی اس میں طاقت نہ تھی، مگر دل کی گہرائیوں سے خدا

کی نعمتوں کا شکر بجالارہی ہے، حضرت عیسیٰؑ نے جب اس کا یہ حال دیکھا تو دروازے سے ہی اُسے سلام کیا: اے کنیز خدا! تجھ پر میرا سلام، بڑھیا نے آواز سنی اور کہا: اے عیسیٰ روح اللہ! آپ پر بھی میرا سلام ہو۔

یہ سن کر حضرت عیسیٰؑ حیرت زدہ ہوئے اور پوچھا! اے کنیز خدا! ذرا مجھے یہ تو بتا تو نے مجھے کیسے پہچانا، جبکہ تو نے مجھے نہ کبھی دیکھا اور نہ ہی میری آواز سنی ہے؟

اُس بڑھیا نے جواب میں کہا: اے پیغمبر خدا! جس نے آپ کو یہاں تک پہنچایا اُسی نے مجھے آپ کی آمد کی خبر دی ہے۔

پھر حضرت عیسیٰؑ نے اُس سے سوال کیا: اے کنیز خدا! تیرے پاس نہ تو صحیح وسالم جسم ہے اور نہ ہی دنیاوی نعمتیں، پھر بھی میں دیکھ رہا ہوں تو اللہ کا شکر اس طرح بجالارہی ہے جیسے اللہ نے سب کچھ تجھے ہی دیدیا ہے، کیا تو مجھے بتا سکتی ہے کہ اس شکر گذاری کا راز کیا ہے؟

اس بوڑھیا نے کہا: اے پیغمبر خدا! الحمد للہ ذکر الٰہی کرنے والا قلب میرے پاس ہے، شکر کرنے والی زبان اور صبر کرنے والا جسم میرے پاس ہے اس کے علاوہ اور مجھے کیا چاہیے؟ مجھے اللہ نے وہ نعمتیں عطا کی ہیں جس کے ذریعہ میں ذکر بھی کر رہی ہوں، شکر بھی کر رہی ہوں اور صبر بھی کر رہی ہوں اور مجھے اُن چیزوں کو نہیں دیا جن کے ہوتے ہوئے شاید میں گناہ کر سکتی تھی، اگر آنکھیں ہوتی تو شاید نامحرم کی طرف دیکھتی، اگر ہاتھ ہوتے تو شاید کسی پر ظلم کرتی، اگر پیر سالم ہوتے تو شاید معصیت کی راہ پر چل پڑتی، میں شکر گذار ہوں اس پروردگار کی جس نے مجھے وہ نعمتیں عطا کی ہیں

جس کے ذریعہ میں اُس سے قریب ہو سکتی ہوں اور وہ چیزیں نہیں دی جن کی وجہ سے شاید میں اُس سے دور ہو سکتی تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اس بڑھیا کا یہ عرفان دیکھا تو بے ساختہ کہا: واقعاً اللہ کی یہ محبوب ترین مخلوق ہے۔[۱]

چوتھا فقرہ: "وَاحْفَظْنِی فِیهِ بِحِفْظِكَ وَسَتْرِكَ یَا أَبْصَرَ النَّاظِرِینَ"

دعا کے اس جملہ میں بندہ اپنے معبود سے دو چیزوں کی درخواست کر رہا ہے:

۱۔ حفاظت: یعنی زمینی اور آسمانی بلاؤں سے جان و مال کی حفاظت کی؛ کیونکہ صرف اللہ کی ذات ہے جو ہر موجود کی حفاظت کر سکتی ہے ﴿فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظاً﴾[۲] "پس خدا بہترین حفاظت کرنے والا ہے"۔

نہ صرف زمینی اور آسمانی بلاؤں سے حفاظت کی درخواست ہے، بلکہ تمام گناہوں سے؛ کیونکہ درحقیقت گناہوں کی ہی بنا پر انسان مختلف بلاؤں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ انسانوں کے گناہوں کی بنا پر خداوند کریم بارانِ رحمت کو روک دیتا ہے۔

۲۔ عیوب کی پردہ پوشی: خالق کائنات ہر انسان کے ظاہر اور باطن سے آگاہ ہے اور وہ ہمارے ہر عیب کو جانتا ہے، اسی لئے اس کو "یَا اَبْصَرَ النَّاظِرِینَ" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، یہ تو اس کا کرم ہے جو اس نے ہمارے گناہوں پر پردہ ڈال رکھا ہے تاکہ دوسرا اُس سے آگاہ نہ ہو سکے۔

۱۔ شہر رمضان (زمزہ روزہ داران) ج۱، ص ۸۴.

۲۔ سورۂ یوسف، آیت ۶۴.

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"لَوْ تَكَاشَفْتُمْ مَا تَدَافَنْتُمْ"[1]

"اگر تم ایک دوسرے کے گناہ سے باخبر ہو جاتے تو ہر گز ایک دوسرے کی تدفین میں شرکت نہ کرتے"

اس خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی کی ہے تاکہ بندہ ایک نہ ایک دن توبہ کے ذریعہ گناہوں سے چھٹکارا پاکر دوبارہ اس کی قربت حاصل کر سکے۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۴، ص ۳۸۵.

پانچویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِی فِیهِ مِنَ الْمُسْتَغْفِرِینَ، وَاجْعَلْنِی فِیهِ مِنْ عِبادِکَ الصَّالِحِینَ الْقانِتِینَ وَاجْعَلْنِی فِیهِ مِنْ أَوْلِیائِکَ الْمُقَرَّبِینَ بِرَأْفَتِکَ یَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِینَ».

”خدایا! مجھے اس دن میں استغفار کرنے والوں میں قرار دے اور مجھے اپنے نیک بندوں میں قرار دے جو تیری اطاعت کرنے والے ہیں اور مجھے اس دن میں قرار دے اپنے مقرب ترین دوستوں میں، اپنی مہربانی سے، اے سب سے بڑے رحم کرنے والے“

اہم مطالب:

آج کی اس دعا میں خالق کائنات سے مندرجۂ ذیل صاحبان اوصاف میں سے قرار دیئے جانے کی درخواست ہے:

۱۔ استغفار کرنے والے

۲۔ بندگان صالح

۳۔ مقربین بارگاہِ الٰہی

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِی فِیهِ مِنَ الْمُسْتَغْفِرِینَ"

استغفار

استغفار، اللہ سے بخشش و مغفرت کی درخواست کو کہتے ہیں، توبہ واستغفار، قرآن کریم کی اُن تعلیمات میں سے ہے جس کی تاکید متعدد آیات کریمہ میں ہوئی ہےاور یہ وہ عبادت ہے کہ جس کی بناپر انسان خود کو گناہوں سے پاک کرکے اللہ کی قربت کو حاصل کرسکتا ہے جیساکہ قرآن کریم میں ارشاد ربّ العزت ہورہاہے:

﴿وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ﴾[1]

"اور اپنے پروردگار سے استغفار کرواس کے بعد اس کی طرف لوٹ آؤ"

توبہ دراصل استغفار کے بعد کی منزل ہے؛ کیونکہ استغفار خدا کی بارگاہ میں گذشتہ گناہوں سے بخشش کی طلب ہے اور توبہ آئندہ اُن گناہوں کے نہ کرنے کا مصمم عزم کرتے ہوئے خالق کی بارگاہ میں لوٹ آنا ہے

انسان جب کوئی گناہ انجام دیتا ہے تو وہ حکم الٰہی کی نافرمانی کی بناپر بارگاہ احدیت سے دور ہوجاتا ہے، لیکن اگر بندہ اپنے گناہوں پر شرمندہ ہوکر استغفار اور توبہ کرلیتا ہے تو دوبارہ خالق کی بارگاہ میں لوٹ آتا ہے، لہٰذا خالق کا حکم ہے:

﴿وَتُوبُوا إِلَي اللهِ جَمِيعاً أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾[2]

"اے صاحبانِ ایمان! تم سب اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتے رہو امید ہے کہ تمھیں فلاح ونجات حاصل ہوجائے"۔

---

[1] سورۂ ہود، آیت ۹۰.

[2] سورۂ نور، آیت ۳۱.

استغفار کے معنیٰ مولا علی علیہ السلام کے کلام کی روشنی میں:

ایک شخص نے مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کے سامنے "استغفر اللہ" کہہ کر استغفار کیا! تو آپ نے فرمایا: تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے، جانتا ہے استغفار کیا ہے؟اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

"اِلاِسْتِغْفَارُ دَرَجَۃُ الْعِلِّیِّینَ وَ ھُوَ اسْمٌ وَاقِعٌ عَلَی سِتَّۃِ مَعَانٍ"

استغفار بلند ترین لوگوں کا مقام ہے اور استغفار کا مفہوم چھ چیزوں پر مشتمل ہے:

ا۔استغفار کی پہلی شرط: ماضی پر شرمندگی

"أَوَّلُھَا النَّدَمُ عَلَی مَا مَضَی"

گناہانِ گذشتہ پر شرمندگی کی توفیق ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی ہے، مگر جس پر اللہ کی خاص عنایت و کرم ہو وہ بندہ اپنے گناہوں پر شرمندہ و پشیمان ہوتا ہے۔

بشر حافی کا واقعہ: ایک دن حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ایک گلی سے گذر رہے تھے کہ درمیانِ راہ ایک گھر سے ناچ گانے کی صدا سنائی دی، امام علیہ السلام نے اس گھر کے در و دیوار پر ایک نظر ڈالی کہ اسی اثنا میں ایک کنیز کسی کام کی غرض سے اُس گھر سے باہر آئی، امام عالی مقام کے نورانی چہرہ پر اُس کی نظر پڑی تو اس نے دیکھا کہ امام حیرت زدہ اُس عالی شان گھر کو دیکھ رہے ہیں، پھر امام نے اس کنیز سے پوچھا یہ بتاؤ کہ اس گھر کا مالک بندہ (غلام) ہے یا آزاد؟

کنیز نے جواب دیا: اس گھر کا مالک ایک آزاد مرد ہے

امام نے فرمایا: یقیناً اگر بندہ ہوتا تو وہ اپنے آقا و مولا کا فرمانبردار ہوتا

اس کے بعد کنیز گھر میں واپس چلی گئی تو اس کے آقا بشر نے سوال کیا: اتنی دیر باہر کیا کر رہی تھی تو اس نے پورا ماجرا سنایا، بشر نے جیسے ہی امام عالی مقام کے کلمات کو کنیز کی زبانی سنا اور فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے اختیار برہنہ پا امام کی تلاش میں دوڑ پڑتا ہے اور امام کی خدمت میں پہونچ کر کہتا ہے: آقا میری جان آپ پر فدا ہو میں استغفار کرتا ہوں اور دوبارہ اس گناہ کو انجام نہیں دوں گا؛ چونکہ برہنہ پا استغفار کیا تھا لہٰذا پوری عمر اسی طرح رہ جاتا ہے جس سے اس کا لقب "حافی" یعنی برہنہ پا پڑ جاتا ہے۔

امامؑ نے اس کی توبہ کو قبول فرمایا اور اس کے لئے دعا کی، اس کے بعد بشر حافی گھر کو چھوڑ کر کہیں دور چلا جاتا ہے اور شب و روز اللہ کی عبادت، دعا و استغفار میں مشغول ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بیمار پڑ جاتا ہے، جب طبیبوں نے اس کا حال دیکھا تو بس اتنا کہا کہ اس کا دل خوف خدا سے پانی ہو چکا ہے۔[1]

۲۔ استغفار کی دوسری شرط: آئندہ کے لئے نہ کرنے کا محکم عزم

"وَ الثَّانِي الْعَزْمُ عَلَى تَرْكِ الْعَوْدِ إِلَيْهِ أَبَداً"

گذشتہ گناہوں پر شرمندگی کے بعد یہ دوسری شرط ہے کہ انسان جن گناہوں سے استغفار کر چکا ان کی طرف دوبارہ نہ لوٹنے کا مصمم ارادہ کرے، اگر وہ دوبارہ اُن گناہوں کی طرف لوٹے جن سے توبہ کر چکا تو یہ توبہ واستغفار کے ساتھ ایک مذاق ہے جیسا کہ

[1]۔ تحفۃ الواعظین، ج۱، ص ۱۶۴۔

ہم نے ابھی ''بشر حافی'' کے واقعہ میں دیکھا کہ وہ مرتے دم تک گناہ نہ کرنے کے عزمِ مصمم پر باقی رہا۔

۳۔استغفار کی تیسری شرط: مخلوقات کے حقوق کاادا کرنا ہے پھراس کے بعداس طرح پاک دامن ہو جائے کہ کوئی مواخذہ نہ رہ جائے

"وَ الثَّالِثُ أَنْ تُؤَدِّيَ إِلَى الْمَخْلُوقِينَ حُقُوقَهُمْ حَتَّى تَلْقَى اللَّهَ [عَزَّ وَ جَلَ] أَمْلَسَ لَيْسَ عَلَيْكَ تَبِعَةٌ"

حقوق کی تقسیم:

کلی اعتبار سے حقوق کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ا۔ اللہ کے حقوق ۲۔لوگوں کے حقوق

ا۔اللہ کے حقوق

اُن تمام وظائف وفرائضِ شرعیہ کو کہتے ہیں جن کاادا کرناہر مسلمان پر واجب ہےاور یہ فرائض خدا کی ذات سے مربوط ہیں جیسے نماز، روزہ اور حج وغیرہ۔

۲۔لوگوں کے حقوق

یعنی وہ فرائض جن کا تعلق ایک دوسرے انسانوں سے ہےاور یہ بھی دو طرح کے ہیں:

الف) مالی حقوق : جن کا تعلق مال سے ہے مثلاً اگر کوئی انسان کسی کا مال چوری کرلے یا صاحبِ مال کی اجازت کے بغیر اسے استعمال کرلے توجب تک اس مال کو اس کے مالک تک نہ لوٹادے یا استعمال کی اجازت نہ لے لے اس وقت تک اس کی توبہ قبول نہیں ہو سکتی۔

ب) **معنوی حقوق:** جن کا تعلق انسان کی عزت وآبرو سے ہے مثلاً اگر کوئی کسی مومن کی غیبت کرے تو خدا اس کی توبہ اُس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک وہ اس مومن سے بخشش طلب نہ کرلے اگر وہ مومن دنیا سے گذر جائے یا اس تک پہنچنا ممکن نہ ہو یا پھر کسی بڑے فساد کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں وہ اس توفیق کے حاصل نہ ہونے کی بناپر مزید شدّت سے خدا کی بارگاہ میں استغفار کرے اور اس مومن کے لئے بھی استغفار کرے جس کی اس نے غیبت کی تھی۔

زمانۂ امام صادق علیہ السلام میں سچے دل سے حقیقی توبہ کرنے والے کا واقعہ

علی بن حمزہ (جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے) کہتے ہیں کہ بنی امیہ کے درباری کاتبوں میں سے ایک شخص میرا رفیق تھا، ایک دن اس نے مجھ سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں شرفیابی کی خواہش کی تو میں نے اس کے لئے امام سے اجازت چاہی، جب اجازت مل گئی تو میں اس کو لے کر امام عالی مقام کی خدمت میں حاضر ہوا، میں سلام کرکے ایک گوشے میں بیٹھ گیا وہ بھی سلام کرکے میرے ساتھ بیٹھ جاتا ہے پھر کہا: اے فرزند رسول! میں ایک مدت تک بنی امیہ کے دربار میں مالی امور کا حساب وکتاب لکھنے والوں میں سے تھا اُس دوران میں نے حلال وحرام کی پرواہ کئے بغیر اپنے لئے خوب دولت اکھٹا کی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اگر بنی امیہ کے پاس تم جیسے بعض حساب وکتاب لکھنے والے، بعض لوگوں سے مال و دولت اکھٹا کرنے والے، بعض تلوار لیکر میدان

میں ان کی حمایت کرنے والے اور بعض ان کی اجتماعات میں شرکت کرنے والے نہ ہوتے تو ہر گز بنی امیہ ہمارا حق غصب نہ کرتے۔

(گویا امام صادق علیہ السلام یہ کہنا چاہتے ہیں اہلبیت علیہم السلام کا حق غصب کرنے کے لئے صرف بنی امیہ یا بنی عباس ہی ذمہ دار نہیں، بلکہ اس دور کے وہ تمام لوگ ذمہ دار ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی بہانے سے اُن ظالموں کی مدد کی ہے یا کرتے رہے ہیں حتّیٰ اپنی خاموشی کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو؛ کیونکہ اگر لوگ اُن کے ساتھ نہ ہوتے تو پھر اُن کے پاس ظلم کرنے کے لئے افراد ہی نہ ہوتے اور نہ ان کی طاقت رہ جاتی)۔

جب بنی امیہ کے اس کاتب نے امام سے اپنی نجات کی راہ دریافت کی تو امام نے اسے مایوس ہونے نہیں دیا اور فرمایا: جو میں کہوں اُس پر تم عمل کرنے کے لئے تیار ہو؟ اس نے کہا: ہاں اے فرزند رسول! امامؑ نے فرمایا: توبہ کر اور جو کچھ تو نے اس دربار سے حاصل کیا اُن اموال میں سے اگر مالکوں کو جانتا ہے تو اُن تک اُن کے اموال کو لوٹا دے، اگر نہیں جانتا ہے تو اُن کی طرف سے راہ خدا میں خرچ کر دے، اگر تو اس عمل کو انجام دے گا تو میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خدا کی طرف سے تیرے لئے بہشت کا ضامن بنوں گا۔ بڑی دیر تک وہ سر جھکا کر سوچتا رہا، پھر سر اٹھا کر کہتا ہے: آقا میں آپ کے حکم پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔

علی بن حمزہ کہتے ہیں کہ پھر وہ کاتب اپنے گھر کوفہ لوٹ جاتا ہے اور امامؑ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے جو کچھ اس کے پاس تھا وہ سب راہ خدا میں صدقہ کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اپنے جسم کے لباس کو بھی اتار دیتا ہے۔ علی بن حمزہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے چند دوستوں سے کچھ پیسہ اکھٹا کرکے اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لئے کپڑے

سلوائے اور گھر کے خرچ کے لئے اس کو کچھ پیسہ دے دیا؛ کیونکہ اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں تھا۔ ایک دن وہ سخت بیمار پڑا تو عیادت کی غرض سے جب میں اس کے گھر گیا تو کیا دیکھا بسترِ مرگ پر آخری سانسیں لے رہا ہے، مجھ کو اشارہ سے قریب بلایا پھر اُکھڑتی ہوئی سانسوں میں کپکپاتے ہونٹوں سے بس اتنا کہا: اے علی بن حمزہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

اُس کے مرنے کے چند بعد دن بعد جب میں امام کی خدمت میں حاضر ہوا تو امامؑ نے جیسے ہی مجھے دیکھا یہ فرمایا: اے علی بن حمزہ میں نے بھی جو تمہارے دوست کو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا۔[1]

۴۔ استغفار کی چوتھی شرط: ضائع کردہ فریضہ کو ادا کرنا

''وَ الرَّابِعُ أَنْ تَعْمِدَ إِلَى كُلِّ فَرِيضَةٍ عَلَيْكَ ضَيَّعْتَهَا فَتُؤَدِّيَ حَقَّهَا''

اگر بندہ نے واجبات کو انجام نہیں دیا تو گویا اس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی اور مرتکبِ گناہ ہوا۔ اب اس گناہ سے توبہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اُن واجبات کو انجام دے جنھیں وہ معصیت کی بنا پر ترک کر چکا تھا۔

۵۔ پانچویں شرط: کھال کا ہڈیوں سے چپک جانا اور اُن کے درمیان نیا گوشت پیدا ہو جانا

"وَ الْخَامِسُ أَنْ تَعْمِدَ إِلَى اللَّحْمِ الَّذِي نَبَتَ عَلَى السُّحْتِ فَتُذِيبَهُ بِالْأَحْزَانِ حَتَّى تُلْصِقَ الْجِلْدَ بِالْعَظْمِ وَ يَنْشَأَ بَيْنَهُمَا لَحْمٌ جَدِيدٌ"

---

[1] فروع کافی، ج۵، ص۱۰۶؛ پابند تاریخ، ج۴، ص۹۴.

”جو گوشت مال حرام سے اُگا ہے اُسے رنج و غم سے پگھلا دینا یہاں تک کہ کھال ہڈیوں سے چپک جائے اور اُن کے درمیان نیا گوشت پیدا ہو جائے“

دراصل یہ پانچویں قسم، توبہ واستغفار کے شرائط میں سے نہیں، بلکہ توبہ کے لئے ”تتمہ“ کی حیثیت رکھتی ہے یعنی خوف خدا اور لقمۂ حرام کا تصور حقیقی توبہ کرنے والے کو اس قدر غم واندوہ میں مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ اسی غم میں پگھل جاتا ہے۔ احادیث میں وارد ہے کہ جس نے ایک لقمۂ حرام کھایا چالیس دن تک اس کی دعا اور نماز قبول نہیں ہوگی۔ لقمۂ حرام کے کھانے کے بُرے اثرات مترتب ہوتے ہیں جو اس دنیا میں بھی ظاہر ہو جاتے ہیں کہ اس پر کسی وعظ و نصیحت کا اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا انسان کو حرام غذاؤں سے محفوظ رہنا چاہیئے۔

۶۔ چھٹی شرط: ”جسم کو ویسے ہی اطاعت کا مزہ چکھاؤ جس طرح معصیت سے اسے لطف اندوز کیا ہے اس کے بعد کہو ”استغفر اللہ“

"وَ السَّادِسُ أَنْ تُذِيقَ الْجِسْمَ أَلَمَ الطَّاعَةِ كَمَا أَذَقْتَهُ حَلَاوَةَ الْمَعْصِيَةِ فَعِنْدَ ذَلِكَ تَقُولُ أَسْتَغْفِرُ اللَّه"[۱]

یہ بھی توبہ کے لئے تتمہ کے عنوان سے ایک رکن ہے یعنی انسان نے جس طرح گناہ کی لذتوں کے حصول میں خود کو سرگرم کئے ہوا تھا، اُسی طرح اطاعت و عبادت کی سختیوں کو بھی برداشت کرے تاکہ گناہوں کی تلافی ہو سکے، مولا فرماتے ہیں: جب تم ان شرائط اور ارکان کو پورا کرلینا " فَعِنْدَ ذَلِكَ تَقُولُ أَسْتَغْفِرُ اللَّه "تو اس وقت ”استغفر

۱۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار ۴۱۷۔

اللہ" کہنا۔ حقیقی استغفار کے لئے اِن شرائط وارکان پر عمل کرنا ضروری ہے پھر جا کر اس کا شمار حقیقی استغفار کرنے والوں میں ہوگا۔آج کے دن خالق کائنات کی بارگاہ میں یہی دعا ہے: "خدایا! تو آج مجھے حقیقی استغفار کرنے والوں میں قرار دے"۔

دوسرا فقرہ: "وَاجْعَلْنِی فِیهِ مِنْ عِبادِكَ الصَّالِحِینَ الْقانِتِینَ"

"عباد اللہ الصالحین القانتین" یعنی اللہ کے اطاعت گذار اور نیک بندے، یوں تو ہر انسان اللہ کا بندہ کہلاتا ہے، مگر حقیقت میں وہی خدا کا بندہ ہے جس نے اللہ سبحانہ کی عبدیت کو جان و دل سے قبول کیا اور اطاعت و عبادت الٰہی میں اپنی زندگی گذاری ہے، انسان کے لئے معراج "عبادت" ہے اسی لئے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "الصلاة معراج المومن"[۱] "نماز، مومن کی معراج ہے" اور نماز، اطاعت و عبادت الٰہی کی مصداق ہے اور اسی عبادت و اطاعت کی بنا پر انسان پروردگار کا تقرب حاصل کرتا ہے، مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "مَا تَقَرَّبَ مُتَقَرِّبٌ بِمِثْلِ عِبَادَةِ اللَّهِ"[۲] "کوئی بھی چیز عبادت کی طرح انسان کو خدا سے قریب نہیں کر سکتی"، عبادتِ الٰہی مقامِ قربت الٰہی تک رسائی کا وسیلہ ہے اور قربت الٰہی ہی انسان کی معراج اور اس کی حیات کی کامیابی و کامرانی کی سند ہے، اسی لئے مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: "العبادة فوز"[۳] عبادت کامیابی ہے کیونکہ مقصد

۱۔ سفینۃ البحار، ج۲، ص۲۶۵.
۲۔ غرر الحکم، مادہ عبد.
۳۔ غرر الحکم، مادہ عبد.

حیات ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْأنسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُونِ﴾[۱] ہے (اور میں نے جن وانس کو نہیں خلق کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں) جہاں زندگی کا مقصد عبادت ہو اور اگر وہ مقصد پورا ہو جائے تو پھر وہ زندگی کامیاب زندگی ہے، اسی لئے مولائے کائنات ؑ نے انیس ماہ رمضان، مسجد کوفہ کے محراب عبادت سے اپنی عابدانہ ظاہری زندگی کے اختتام کا یہ کہہ کر اعلان کیا: "فزت و ربّ الكعبة" (رب کعبہ کی قسم کی میں کامیاب ہو گیا)۔

بندگانِ صالح کی عظمت

انسان کی معراج دراصل اس کی عبدیت کی معراج ہے لہٰذا خالقِ کائنات نے جب اپنے حبیب کو معراج عطا کی تو ان کے متعدد صفات میں سے کسی اور صفت کی جانب اشارہ نہیں کیا، بلکہ یہ کہا: ﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَيٰ بِعَبْدِهِ لَيْلا مِنْ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَي الْمَسْجِدِ الأَقْصَي﴾[۲] (پاک و پاکیزہ ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک لے گئی) یہ آیۂ کریمہ اس بات پر روشن دلیل ہے کہ رسول کی معراج دراصل ان کی عبدیت کی معراج ہے یعنی ان کی بندگی کی معراج ہے۔

بندگی اور بندگان صالح کی عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ کی سب سے عظیم عبادت نماز میں نماز گذار کو حکم ہے کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رسالت سے

۱۔ سورۂ ذاریات، آیت ۶۵

۲۔ سورۂ اسراء (بنی اسرائیل)، آیت ۱

پہلے "أشهَدُ أنَّ مُحَمَّداً عَبدُهُ وَ رَسُولُهُ." کہہ کر ان کی عبدیت کی گواہی اُن کی رسالت سے پہلے دے، پھر مقامِ سلام میں "السّلام عَلَینا وَ عَلَی عِبَادَ الله الصَّالِحِین" کہہ کر اللہ کے نیک بندوں پر سلام بھیجے، لہٰذا خوش نصیب ہیں وہ ہستیاں جنھیں لسانِ عصمت سے ''عبدِ صالح'' کاخطاب ملا اور باب الحوائج حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام کو یہ افتخار حاصل ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے جب آپ کی مزار مقدس کی زیارت فرمائی تو یہ کہہ کر سلام کیا:

"السلام عليك أيّها العبد الصالح المطيع لله و لرسوله ولأميرالمومنين والحسن و الحسين صلي الله عليهم وسلم"[1]

''سلام ہو آپ پر اے عبد صالح جو اطاعت کرنے والے ہیں، اللہ اور اس کے رسول اور امیر المومنین اور حسن اور حسین علیہم السلام کی''

آج کی اس دعا میں معبود کی بارگاہ میں ہماری یہی التجا ہے: خدایا تو ہمیں اپنے اطاعت گذار نیک بندوں میں سے قرار دے۔

تیسرا فقرہ: "وَاجْعَلْنی فِیهِ مِنْ أوْلِیائِكَ الْمُقَرَّبینَ بِرأفَتِكَ یَا أرْحَمَ الرّاحِمِینَ"

اولیاء، ولی کی جمع ہے اور عربی میں ولی کے متعدد معانی ہیں جن کا تعیّن جملہ کے سیاق و سباق سے ہوتا ہے، مذکورہ دعا میں بندہ اپنے معبود سے التجا کر رہا ہے:

---

[1] مفاتیح الجنان، زیارت حضرت عباسؑ

پروردگارا! مجھے آج کے دن اپنے مقرب اولیاء میں سے قرار دے، یعنی نزدیک ترین دوستوں میں سے قرار دے گویا اس دعا میں ولی کے معنٰی دوست کے ہیں۔

یوں تو ہر بندہ اپنے نیک اعمال کے ذریعہ خاصانِ حضرتِ حق کے زمرہ میں شامل ہونا چاہتا ہے، مگر حقیقت میں یہ مرتبہ اُسی بندہ کو نصیب ہوتا ہے جس نے خدا سے محبت کے تمام عہد و پیمان کو نبھایا ہو، حقیقت میں اللہ کے نزدیک ترین اولیاء سے مراد وہی ہستیاں ہیں جن کے لئے خداوند کریم نے قرآن مجید میں کئی بار یہ فرمایا: "رضي الله عنهم و رضوا عنه" (خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے راضی ہیں) یہی وہ قربت و رضایت ہے جو عارفوں کی حقیقی جنّت ہے اور اس قربت سے دوری ہی ان کے لئے جہنم کے سخت ترین عذاب سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اسی حقیقت کی طرف مولائے کائنات حضرت امام علی علیہ السلام ارشاد فرمارہے ہیں:

"إِلَهِي وَ سَيِّدِي وَ مَوْلَايَ وَ رَبِّي صَبَرْتُ عَلَى عَذَابِكَ فَكَيْفَ أَصْبِرُ عَلَى فِرَاقِكَ"[۱]

"اے میرے معبود اے میرے سردار اے میرے مولا اے میرے پروردگار میں تیرے عذاب پر تو صبر کرلوں گا لیکن تیرے فراق کو کیسے برداشت کرسکوں گا".

حقیقی مُحب ہر سختی کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرلے گا مگر دردِ فراق کا تحمل اس کے لئے بہت مشکل ہے۔

۱۔ دعائے کمیل

ولیؑ خدا کی منزل

جب بندہ قربِ الٰہی کے اُس منزل پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے اور خدا کے درمیان کوئی شئ حائل نہیں رہ جاتی تو اس کا ہر عمل صرف اور صرف خدا کے لئے ہوتا ہے جیسا کہ خود خداوند کریم اپنے حبیب کو حکم دیتا ہے کہ کہو: " إِنَّ صَلاتِي وَ نُسُكِي. وَ مَحْيايَ وَ مَماتِي لِلَّهِ رَبِ الْعالَمِينَ"[۱]

پھر ایسے بندہ سے جنگ کو خدا خود سے جنگ کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور اس بندہ کا خدا خود دفاع کرتا ہے:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرے جد امجد رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث قدسی نقل فرمائی جس میں خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

"مَنْ أَهَانَ لِي وَلِيّاً فَقَدْ أَرْصَدَ لِمُحَارَبَتِي وَ مَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدٌ بِمِثْلِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَ إِنَّهُ لَيَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّافِلَةِ حَتَّى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَ بَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَ يَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا وَ رِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا إِنْ دَعَانِي أَجَبْتُهُ وَ إِنْ سَأَلَنِي أَعْطَيْتُه"[۲]

"جس نے بھی میرے ولی (دوست) کی اہانت کی گویا وہ مجھ سے جنگ کرنے کے لئے کمر بستہ ہوگیا اور کوئی بندہ مجھ سے کسی ایسے چیز کے ذریعہ قریب نہیں ہوسکتا جو میرے اُس پر واجب کردہ عمل سے زیادہ محبوب ہو اور بندہ

۱۔ دعائے کمیل
۲۔ اصول کافی، ج۴، ص ۵۳

مجھ سے نافلہ (نمازوں) کے ذریعہ قریب ہوتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں پس جب میں اس کو دوست بنالیتا ہوں تو پھر میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اور اس کا ہاتھ (قدرت) بن جاتا ہوں جس سے وہ مدد لیتا ہے اگر وہ مجھے آواز دیتا ہے تو میں عطا کرتا ہوں"

حضرت سلمان اور اللہ سے دوستی کا اثر

حضرت سلمان اُن اولیائے الٰہی میں سے ہیں جو مذکورہ حدیثِ قدسی کے مصداق بن چکے تھے، مرحوم محدث نوری اپنی کتاب "نفس الرحمٰن" میں کتاب "زینۃ الاعیاد" سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرت سلمان جب مدائن کے گورنر تھے تو مسجد کے ایک گوشے میں مشغول عبادت رہا کرتے تھے لوگ ان کی سیدھی سادھی زندگی سے اُن کو کمزور گورنر سمجھنے لگے، جس کی بناپر مدائن کے چوروں میں اُن کا ڈر نہ رہا، جب شہر میں چوری کے واقعات کی اطلاع حضرت سلمان کو ہوئی تو آپ مسجد سے باہر آئے ایک کتّے پر نظر پڑی اس کو بلایا اور اس سے کچھ کہا اور وہ کتّا دوڑتا ہوا گیا ایک بلندی پر کھڑے ہو کر اپنے انداز میں صدا بلند کی جس سے شہر اور کتّے بھی اس کے اطراف جمع ہوگئے، پھر وہ کچھ دیر بعد شہر کی گلیوں میں پھیل گئے، جناب سلمان نے پورے شہر میں منادی کے ذریعہ یہ بات سب تک پہنچادی کہ خبردار، نصفِ شب کے بعد چوری کے ارادے سے کوئی گھر سے باہر نہ نکلے لیکن چوروں نے اس اعلان کی پرواہ نہ کرتے

ہوئے نصف شب کے بعد جب اپنے گھروں سے چوری کے لئے نکلے تو کتوں نے اُن پر حملہ کیا اس طرح چوری کا مسئلہ انجام کو پہنچا۔[1]

اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب بندہ اللہ سے محبت کرتا ہے تو اللہ اس کی زبان بن جاتا ہے، جس سے بندہ بولتا ہے جب سلمان جیسے ولیٔ خدا کا یہ مقام ہے تو جو سلمان کا بھی مولا ہے اس صاحبِ ولایت عظمیٰ حضرت علی علیہ السلام کے مقام و منزلت کا کون ادراک کر سکتا ہے؟!

اولیائے الٰہی کے اس مقام و مرتبہ کو دیکھنے کے بعد آج کے دن بے ساختہ زبان پر یہ دعا جاری ہو جاتی ہے: " وَاجْعَلْنِی فِیهِ مِنْ أَوْلِیائِکَ الْمُقَرَّبِینَ "پروردگار آج کے دن تو مجھے اپنے مقرب دوستوں میں قرار دے۔

---

[1] ۔ از حوالہ تحفۃ الاحباب، ص ۱۹۴۔

چھٹی تاریخ کی دعا

«اَللّٰھُمَّ لاَ تَخْذُلْنی فِیهِ لِتعَرُّضِ مَعْصِیَتكَ ولاَ تَضْرِبْنی بِسِیاطِ نَقِمَتِكَ وزَحْزِحْنی فِیهِ مِنْ مُوجباتِ سَخَطِكَ، بِمَنِّكَ وأَیادِیكَ یَا مُنْتَهی رَغْبَةِ الرّاغِبینَ»

”اے خدا مجھ کو اس دن معصیت کی وجہ سے رسوانہ کرنا اور اپنے عذاب کے تازیانہ سے نہ مارنا اور مجھ کو اس دن دور رکھ اپنے غضب کے اسباب سے، تجھے تیرے احسان اور نعمتوں کا واسطہ اے رغبت و آرزو رکھنے والوں کے آرزو کی انتہا“

اہم مطالب:

آج کی اس دعا میں تین اہم چیزوں کی درخواست ہے:

۱۔ گناہ و معصیت کی بنا پر رُسوانہ کرنے کی

۲۔ تازیانۂ عذاب سے محفوظ رکھنے کی

۳۔ غضب الٰہی کے اسباب کو خود سے دور رکھنے کی

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ لاَ تَخْذُلْنِی فِیهِ لِتَعَرُّضِ مَعْصِیَتِكَ"

دراصل "خذلان" کسی بندہ کو اُسی کے حال پر چھوڑ دینے کو کہتے ہیں اور بندہ کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی ذلت وخواری اور رسوائی نہیں ہے کہ خدا اس کے بُرے اعمال کی بنا پر اس کو اُسی کے حال پر چھوڑ دے ایسی صورت میں اس کو دنیا میں ذلت وخواری اور آخرت کے دردناک عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا، لہٰذا قرآن کریم میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

﴿إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللهُ فَلاَ غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ﴾[1]

"اگر اللہ تمھاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمھیں (تمہارے حال پر) چھوڑ دے گا تو اس کے بعد تمہاری مدد کون کرے گا"۔

دراصل "خذلان" "نصرت" کے مقابلہ میں ہے، جیسا کہ خود آیہ کریمہ سے بھی واضح ہے کہ اگر اللہ کی نصرت ومدد کسی بندہ کے ساتھ ہے تو وہ بندہ کبھی کسی سے مغلوب نہیں ہو سکتا اگر اللہ بندہ کے معصیت اور گناہ کرنے کی بنا پر اس کی مدد سے ہاتھ اٹھالے یعنی اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے تو پھر وہ بندہ شیطان کے دام فریب میں گرفتار ہو جاتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہو رہا ہے:

﴿وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنسَانِ خَذُولاً﴾[2]

۱۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۶۰.

۲۔ سورۂ فرقان، آیت ۲۹.

"اور شیطان توانسان کے لئے رسوا کرنے والا ہی ہے"

یعنی بندہ جب اطاعتِ الٰہی کی راہ کو چھوڑ کر معصیت کی راہ پر چل نکلتا ہے تو پھر خدا اس کو اسی کے حال پر چھوڑ دیتا ہے، پھر شیطان اس کو اپنا مطیع وفرمانبردار بنالیتا ہے اور اس کو رسوا کرکے ہی دم لیتا ہے۔

معصیت اور اس کے اقسام:

معصیت، گناہ کو کہتے ہیں یعنی خدا کے احکام کی نافرمانی کرنا، جن امور کا اللہ نے حکم دیا انھیں بجانہ لانا اور جن امور کو انجام دینے سے روکا ہے ان کو انجام دینا ہے اور گناہ کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ **اعتقادی گناہ:** جیسے شرکِ خداوندی یا ائمہ معصومین علیہم السلام کی شان میں غلو کرنا یا ان کو ان کے مرتبہ سے کم جاننا۔

۲۔ **قلبی گناہ:** جیسے ریا، تکبر، غرور، حسد وغیرہ

۳۔ **اعضاء وجوراح کے گناہ:** جیسے تہمت، غیبت، زنا، قتل وغیرہ

ان میں سے ہر گناہ غیظ وغضب الٰہی کا موجب ہے اور ان کا مرتکب، عذاب الٰہی کا مستحق ہے۔

امام حسین علیہ السلام دعائے عرفہ میں ارشاد فرماتے ہیں: "وَ أَسْعِدْنِي بِتَقْوَاكَ وَ لَا تُشْقِنِي بِمَعَاصِيك ؛پروردگارا اپنے تقوا و پرہیزگاری سے مجھ کو سعادت مند بنا اور مجھ کو اپنے گناہ اور معصیت کے سبب شقی و بدبخت قرار نہ دے۔

گناہ کے عواقب و نتائج:

گناہ عذابِ الٰہی کے علاوہ بھی وضعی آثار کا حامل ہے یعنی اس دنیا میں بھی گناہ اپنا بُرا اثر دکھاتا ہے:

۱۔ لذتِ عبادت و مناجات کا ختم ہو جانا

روایت میں وارد ہے کہ اگر عالم اپنے علم پر عمل نہ کرے تو خدا کی جانب سے اس پر کمترین عذاب یہ ہے کہ مناجات کی لذت و شیرینی اس سے چھین لیتا ہے۔[۱]

۲۔ نیک افراد کی نگاہوں میں گر جانا

مولا امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "مَنْ تَتَبَّعَ خَفِيَّاتِ الْعُيُوبِ حُرِمَ مَوَدَّاتِ الْقُلُوبِ؛ جو بھی گناہوں کو خفیہ طور پر انجام دینے کی تلاش میں رہے گا خدا اس کو لوگوں کی محبت سے محروم کر دے گا۔[۲]

۳۔ اولیائے الٰہی سے نفرت

جب انسان مسلسل گناہ انجام دیتا ہے تو پھر اس کی نظر میں بزرگانِ دین اور اولیائے الٰہی کا مقام و مرتبہ ختم ہو جاتا ہے، پھر آہستہ آہستہ اُن سے بغض و حسد کرنے لگتا ہے، امام حسین علیہ السلام نے روزِ عاشور دشمنوں پر حجت تمام کرنے بعد فرمایا: فرزند رسول سے

---

[۱]۔ اصول کافی، ج۱، ص۲۶.

[۲]۔ غرر الحکم، ص ۶۸۳.

تمھاری دشمنی کا سبب یہ ہے کہ تمھارے پیٹ مال حرام سے پُر ہیں لہٰذا تم حق اور مظلومیت کی آواز سُن نہیں سکتے۔[۱]

۴۔ بلا و مصیبت کا نزول

گناہ بذات خود، بلا و مصیبت ہے اس کے علاوہ دیگر مصیبتوں کا سبب بھی ہے، قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾[۲]

”اور تم پر جو مصیبت بھی پڑتی ہے وہ تمھارے ہاتھوں کی کمائی (اپنے کرتوت کا نتیجہ) ہے“

امام علی رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"كُلَّمَا أَحْدَثَ الْعِبَادُ مِنَ الذُّنُوبِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَعْمَلُونَ، أَحْدَثَ اللَّهُ لَهُمْ مِنَ الْبَلَاءِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَعْرِفُونَ".[۳]

”جب بھی بندے ایسے گناہوں کو انجام دیں جن کو اس سے پہلے کبھی انہوں نے انجام نہ دیا ہو تو خدا اُن کے لئے ایسی نئی بلائیں نازل کر دیتا ہے کہ وہ اس سے قبل اُن کے متعلق انہوں نے کبھی سُنا نہ ہو“

۱۔ قصّۂ کربلا بہ ضمیمہ قصّۂ انتقام، علی نظری منفرد.

۲۔ سورۂ شوریٰ، آیت ۳۰.

۳۔ اصول کافی، ج ۲، ۴۴۲، ۲.

۵۔ نیکیوں کی بربادی

امام علی رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"اتَّقُوا الذُّنُوبَ فَإِنَّهَا مَمْحَقَةٌ لِلْخَيْرَاتِ"[۱]

گناہوں سے بچو؛ کیونکہ گناہ انسان کے نیک اعمال کو برباد کردیتے ہیں۔

۶۔ عمر کا کوتاہ ہونا

عمر انسان کا سرمایہ ہے جس کے ہوتے ہوئے انسان بلند درجات کو کسب کرسکتا ہے، اسی لئے اولیائے الٰہی ہمیشہ اپنی طول عمر کے لئے دعا کرتے تھے "أَنْ تُطِيلَ عُمُرِي فِي طَاعَتِكَ؛ اے خدا میری عمر کو طولانی فرما اپنی اطاعت کی راہ میں"[۲]۔ لیکن بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی بناپر عمر کوتاہ اور مختصر ہوجاتی ہے جیسے قطعِ رحم، امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الذُّنُوبِ الَّتِي تُعَجِّلُ الْفَنَاءَ...وَ هِيَ قَطِيعَةُ الرَّحِمِ" "خدا سے پناہ مانگتے ہیں اُن گناہوں سے جو تعجیل مرگ کا سبب ہوں اور وہ قطع رحم ہے" (یعنی قریبی رشتہ داروں سے قطع تعلق کرلینا)۔

۷۔ فقر و تنگدستی

انسان کبھی کبھی گناہوں کی بناپر فقر و تنگدستی کا شکار ہوجاتا ہے اور اس کے رزق سے برکت ختم ہوجاتی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

۱۔ میزان الحکمۃ، ج۳، ص۴۶۵.

۲۔ اصول کافی، ج۲، ص۴۴۸.

"إِنَّ الْعَبْدَ لَيُذْنِبُ الذَّنْبَ فَيُحْرَمُ بِهِ الرِّزْقَ وَ قَدْ كَانَ هَيِّناً لَه"[۱]

اور بندہ جب کسی گناہ کو انجام دیتا ہے تو وہ رزق سے محروم ہو جاتا ہے، جبکہ وہ اس کے لئے آسانی سے حاصل ہونے والا تھا۔

۸۔ اشرارِ امت کا غلبہ

جب معاشرہ میں فساد کے مقابلہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض پر عمل نہیں ہوتا تو خدا اُن پر اشرار اور ظالموں کو مسلط کر دیتا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض کو انجام نہ دینا ایک عظیم گناہ ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:"لَا تَتْرُكُوا الْأَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ فَيُوَلَّى عَلَيْكُمْ أَشْرَارُكُم؛ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک مت کرو ورنہ تم پر بدترین لوگ مسلط ہو جائیں گے"[۲]۔

ان کے علاوہ معصیت و گناہ کے اور بھی عواقب و نتائج ہیں جن کا ذکر احادیث معصومین علیہم السلام میں موجود ہے، لہٰذا انسان اللہ کی معصیت سے پرہیز کرے تاکہ وہ عذابِ آخرت کے علاوہ اِن سنگین عواقب و نتائج سے محفوظ رہتے ہوئے دنیا و آخرت کی رسوائی سے بھی بچ سکے۔ اسی لئے روزہ دار بندہ کی زبان پر آج کے دن یہی دعا ہے:

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۴۴۸۔

۲۔ بحار الانوار، ج ۴۷، ص ۴۰۷۔

پروردگار مجھے اس دن معصیت کی بناپر رسوانہ کرنا یعنی مجھ کو میرے حال پر نہ چھوڑ دینا میں ہر آن تیرے تازہ کرم اور تیری نصرت اور امداد کا محتاج ہوں۔

دوسرا فقرہ: "وَلاَ تَضْرِبْنِی بِسِیاطِ نَقِمَتِكَ"

"سیاط" سوط کی جمع ہے جس کے معنی کوڑے اور تازیانے کے ہیں اور "نقمت" عقوبت و عذاب کو کہتے ہیں[1]۔ اور اسی سے انتقام بھی ہے جس کے معنی مقابلہ بہ مثل کے ہیں یعنی شریعتِ مقدسہ میں ہر عمل کی جزا و سزا ہے، برے عمل کا بُرا نتیجہ اور نیک عمل کا نیک نتیجہ ہوتا ہے، عام طور پر نقمت کا استعمال بُرے عمل کے نتیجہ یعنی عقوبت و عذاب کے لئے ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا﴾[2]

"ہر برائی کا بدلہ اسی کے جیسا ہوتا ہے"

ایک اور مقام پر ارشاد ہو رہا ہے:

﴿وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾[3]

۱۔ مفردات راغب، مادہ نقمہ

۲۔ سورۂ شوریٰ، آیت ۴۰.

۳۔ سورۂ یونس، آیت ۲۷.

"اور جن لوگوں نے برائیاں کمائی ہیں ان کے لئے ہر برائی کے بدلے ویسی ہی برائی ہے اور ان کے چہروں پر ذلت کی سیاہی لگی ہوئی ہوگی"

انتقام، قرآن کریم کی روشنی میں

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلا إِلَي قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَانتَقَمْنَا مِنْ الَّذِينَ أَجْرَمُوا وَكَانَ حَقّاً عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾[1]

"اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسول ان کی قوموں کی طرف بھیجے ہیں جو ان کے پاس کھُلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے پھر ہم نے مجرموں سے انتقام لیا اور ہمارا فرض تھا کہ ہم صاحبان ایمان کی مدد کریں"

ایک اور مقام پر قوم بنی اسرائیل سے متعلق ارشاد ہو رہا ہے:

﴿فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا﴾[2]

"پھر ہم نے اُن سے انتقام لیا اور انھیں دریا میں غرق کردیا (کیونکہ) انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا"

اس آیۂ کریمہ میں خداوند کریم نے انتقام کی قِسم کو بھی واضح کردیا کہ بنی اسرائیل نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا تھا لہٰذا انھیں دریائے نیل میں غرق کردیا گیا اور پہلی

---

[1] سورۂ روم، آیت ۴۸.

[2] سورۂ اعراف، آیت ۱۳۶.

آیت سے یہ بات بھی واضح ہے کہ مجرموں سے اس دنیا میں اللہ کا انتقام دراصل صاحبان ایمان کی نصرت ومدد ہے: ﴿وَكَانَ حَقّاً عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ اس حقیقت پر واضح دلیل ہے اور مذکورہ دونوں آیتوں میں انتقام سے مراد عمل کا انجام یعنی دُنیا ہی میں اللہ کا عذاب ہے۔

انتقام الٰہی کے اسباب

وہ موارد جن کی بناپر انسان، انتقام الٰہی کی لپیٹ میں آجاتا ہے، اللہ کی روشن نشانیوں کی تکذیب اور اُن کا انکار ہے یعنی کفران نعمت ہے، اگرچہ تمام نعمتیں اپنی جگہ خاص اہمیت کی حامل ہیں، لیکن بعض نعمتیں ایسی ہیں جن کا کسی اور نعمت سے مقابلہ ممکن نہیں ہے لہٰذا ایسی عظیم نعمتوں کے کفران پر الٰہی انتقام بھی بہت سخت ہوتا ہے جس کی روشن مثال ''ولایت ائمہ اہلبیت علیہم السلام'' ہے اسی لئے اللہ نے میدان غدیر میں اس عظیم نعمت کے انکار پر حارث فہری پر سخت عذاب نازل فرمایا۔

لہٰذا ماہِ رمضان مبارک میں اس دن کی دعا میں بندہ کی اللہ کی بارگاہ میں یہی التجا ہے کہ بارِالٰہا! آج کے دن کی برکت وعظمت کی طفیل مجھ پر معصیت کی وجہ سے نقمت و انتقام کے کوڑے نہ برسا۔

تیسرا فقرہ: "وَزَحْزِحْنِی فِیهِ مِنْ مُوجِباتِ سَخَطِكَ، بِمَنِّكَ وَأَیادِیكَ"

عربی میں ''سخط'' شدت غضب یعنی غضب کی انتہا کو کہتے ہیں[۱]۔ سخطِ الٰہی رضایتِ الٰہی کی ضد ہے اس لفظ کی تفصیل دوسری تاریخ کی دعا کے شرح میں گذر چکی ہے۔
سخط الٰہی یعنی غضب الٰہی ہے، کسی نے امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا: غضب الٰہی کیا ہے؟ تو امامؑ نے فرمایا: "غَضَبُ اللَّهِ تَعَالَى عِقَابُه: اللہ کے غضب سے مراد اس کا دردناک عذاب ہے''۔[۲]

اس دعا میں بندہ اپنے خالق سے التماس کرتا ہے: اے پروردگار جو چیزیں تیرے عذاب اور غضب کا سبب بنتی ہیں ان کو مجھ سے دور رکھ۔

غضب الٰہی کے اسباب

گناہ و معصیت کی بناپر انسان عذاب الٰہی میں مبتلا ہوتا ہے اور معصیت کے متعدد اقسام ہیں جن کا ذکر اسی دعا کے ذیل میں گذر چکا ہے، معصیت یعنی احکام الٰہی کی نافرمانی ہے اور اس کے مقابلہ میں اطاعت ہے یعنی احکام الٰہی کی فرمانبرداری، لہٰذا عذاب الٰہی سے دوری اور رحمت و رضائے الٰہی سے قربت صرف اور صرف اللہ کی اطاعت سے ممکن ہے یہ امر بغیر توفیق الٰہی کے ناممکن ہے لہٰذا بندہ کا خدا کی بارگاہ میں دعا کرنا کہ مجھے اُن چیزوں سے محفوظ رکھ جو تیرے غضب کی موجب ہیں یعنی گناہوں

۱۔ مفردات راغب، مادہ ''سخط''۔
۲۔ بحار الانوار، ج ۴، ص ۶۸۔

سے دوری کی دعا در اصل اطاعتِ الٰہی پر استقامت کی دعا ہے، جس کا حصول توفیق الٰہی کے بغیر ناممکن ہے اور توفیق کے اسباب کو مہیا کرنا خود بندہ کی ذمہ داری ہے۔

قابلِ غور نکتہ

اس دعا میں بندہ نے "بِمَنّكَ وَأَيادِيكَ" کہہ کر اللہ کو قبولیتِ دعا کے لئے اس کے احسان اور نعمتوں کا واسطہ دیا ہے ''من'' احسان اور ''ایادی'' نعمتوں کو کہتے ہیں۔ مگر جب عربی میں ''احسان'' کا لفظ استعمال ہوتا ہو تو اس کے معنیٰ نیک عمل کے ہیں اور اسی طرح ''منّان'' احسان کرنے والا اور ''محسن'' نیک عمل انجام دینے والے کو کہتے ہیں۔ بسا اوقات بھولے سے یا نادانستگی کی بنا پر لوگ ''احسان'' کا ترجمہ اردو میں احسان ہی سے کر دیتے ہیں۔

ساتویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ أَعِنِّی فِیهِ عَلَی صِیامِهِ وقِیامِهِ، وَجَنِّبْنی فِیهِ مِنْ هَفَواتِهِ وآثامِهِ، وارْزُقْنی فِیهِ ذِكْرَكَ بدَوامِهِ، بِتَوْفِیقِكَ یَا هادِیَ الْمُضِلِّینَ»

''خدایا! آج کے دن روزہ اور عبادت کے لئے میری مدد کر اور مجھ کو محفوظ رکھ لغزشوں اور گناہوں سے اور اس ماہ میں اپنی توفیق کے ذریعہ ہمیشہ اپنا ذکر کرنا نصیب فرما اے گمراہوں کے رہنمائی کرنے والے''

اہم مطالب:

مذکورہ دعا میں بندہ اپنے رب سے تین اہم چیزوں کی درخواست کر رہا ہے:

۱۔ روزہ اور عبادت کی انجام دہی کے لئے مدد کی

۲۔ لغزش اور گناہوں سے دوری کی

۳۔ دائمی طور پر ذکر الٰہی کی توفیق کی

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ أَعِنِّی فِیهِ عَلَی صِیامِهِ وَقِیامِهِ"

یہ حقیقت ہے کہ بندہ توفیق الٰہی کے بغیر اس کی عبادت و اطاعت کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، اسی لئے اس کی عبادت و اطاعت کے لئے اُسی سے مدد کی درخواست کرنا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ خالق کائنات نے بندۂ مومن کے اس فطری طلب کو سورۂ حمد میں "إِیَّاكَ نَعْبُدُ وَإِیَّاكَ نَسْتَعِینُ" کہہ کر اپنے لفظوں کا جامہ پہنایا۔ سورۂ حمد کی اس آیۂ کریمہ میں جمع متکلم کا صیغہ یعنی "نعبد و نستعین" استعمال کرکے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ کسی ایک فردِ بشر کی تمنا نہیں، بلکہ یہ ساری انسانیت کی فطری آواز ہے۔ لہٰذا حقیقی بندہ وہی ہے جو صرف اُسی کی عبادت کرے اور صرف اُسی سے مدد مانگے، یہاں تک کہ اس کی عبادت کرنے اور اُس کے لئے روزہ رکھنے کے لئے بھی اسی سے مدد مانگے۔

عبادتوں میں سب سے اہم عبادت نماز ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "إِنَّ أَوَّلَ مَا یُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ الصَّلَاةُ، فَإِنْ قُبِلَتْ قُبِلَ مَا سِوَاهَا"[1]: (روز قیامت) بندہ سے سب سے پہلے نماز کے بارے میں محاسبہ کیا جائے گا، اگر نماز قبول ہوئی تو دوسرے اعمال بھی قبول کئے جائیں گے"۔

[1] شیخ طوسی، تہذیب الاحکام، ج۲، ص۲۳۹.

اور دوسری اہم عبادت روزہ ہے، حدیث قدسی میں وارد ہے: "الصَّوْمُ لِي وَ أَنَا أَجْزِي بِه"[۱] خالق کائنات کا ارشاد ہے: روزہ میرے لئے اور میں خود اس کی جزا دوں گا۔

نماز اور روزہ ان دونوں عبادتوں سے متعلق پہلی تاریخ کی دعا کی شرح کے ذیل میں کچھ باتیں بیان کی جاچکی ہے یہاں پر آثارِ نماز سے متعلق جو آیتیں قرآنِ کریم میں موجود ہیں ہم ان میں سے چند کا ذکر مندرجہ ذیل عنوانات کی روشنی میں کررہے ہیں:

آثارِ نماز، قرآن کریم کی روشنی میں:

۱۔ نماز انسان کو باتقویٰ بناتی ہے

﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾[۲]

"متقی اور پرہیزگار وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، پابندی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں"

۱۔ شیخ کلینی، فروع کافی، ج ۲، ص ۲۱.
۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۳.

۲۔ نماز انسان کو برائیوں سے روکتی ہے

﴿وَأَقِمْ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَي عَنْ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾[۱]

''نماز قائم کرو؛ کیونکہ ہر برائی اور بدی سے روکنے والی ہے''

۳۔ نماز کامیابی کا سبب ہے

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّي، وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّي﴾[۲]

''بے شک پاکیزہ رہنے والا کامیاب ہو گیا، جس نے اپنے رب کے نام کی تسبیح کی اور پھر نماز پڑھی''

ان کے علاوہ قرآنی کریم میں کئی اور آیات کریمہ موجود ہیں جن میں آثار نماز کا ذکر ہے، مگر یہ تمام آثار حقیقی نماز کے ہیں، آیات کے علاوہ حضرات معصومین علیہم السلام سے مروی متعدد احادیث شریفہ میں نماز کی اہمیت اور اس کے آثار کا ذکر ہے۔

ماہ رمضان عبادت کا مہینہ ہے اور عبادتوں میں نماز اور روزہ سر فہرست ہے، لہٰذا آج کی اس دعا میں بندۂ مومن کی بارگاہِ ربّ العزت میں درخواست یہی ہونی چاہئے کہ خدایا! مجھے اس مہینے میں اپنے لئے روزہ رکھنے اور بکثرت نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرما اور اس توفیق کا حصول تیری مدد کے بغیر ناممکن ہے۔

۱۔ سورۂ عنکوبت، آیت ۴۵.

۲۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۷۰.

دوسرا فقرہ: "وَجَنِّبْنِی فِیهِ مِنْ هَفَواتِهِ وَآثامِهِ"

عربی میں "ھفوات" لغزشوں کو اور "آثام" اثم، کی جمع، گناہوں کو کہتے ہیں۔ بندہ، خالق کائنات کی بارگاہ میں دست بدعا ہے کہ خدایا مجھے آج لغزشوں اور گناہوں سے محفوظ رکھ۔

اپنے نفس کو گناہوں اور لغزشوں سے محفوظ رکھنا ہی درحقیقت زہد و ورع اور تقویٰ وپرہیزگاری ہے۔ ماہ رمضان، ماہ صیام ہے اور روزہ سرچشمۂ تقویٰ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ربّ العزت ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمْ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَي الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾[1]

"اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کر دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کر دیا گیا تھا تاکہ تقویٰ اختیار کرو"

روح تقویٰ گناہوں اور لغزشوں سے اجتناب کرنے میں ہے اور انسان کو یہ صفت حقیقی روزہ سے حاصل ہوتی ہے۔

ماہِ رمضان کا بہترین عمل

امیر المومنین حضرت امام علی علیہ السلام نے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال فرمایا: یا رسول اللہ! " مَا أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ فِي هَذَا الشَّهْر....."؛ اے خدا کے رسول! اس مہینے

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۳۔

(ماہ رمضان) میں بہترین عمل کیا ہے؟ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ فِي هَذَا الشَّهْرِ الْوَرَعُ عَنْ مَحَارِمِ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ" ''اس ماہ میں بہترین عمل خداوند سبحان کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب اور تقویٰ ہے''۔

ورع و تقویٰ کیا ہے

عام طور پر ''ورع و تقویٰ'' دو مترادف لفظ سمجھے جاتے ہیں، مگر ایسا نہیں ہے بلکہ معنیٰ کے اعتبار سے اِن دونوں میں معمولی سا فرق ہے، تقویٰ کی تعریف میں راغب اصفہانی لکھتے ہیں: "التقوی: حفظ النفس عما یوثم"[1] اُن چیزوں سے نفس کی حفاظت کرنا جو گناہ کہی جاتی ہیں اور گناہ دو چیزوں میں ہے: ۱۔واجبات کا ترک کرنا ۲۔حرام امور کا انجام دینا، جو بھی ان دو چیزوں سے اجتناب کرے وہ صاحب تقویٰ ہے اور ورع، تقویٰ کے ملکہ کو کہتے ہیں یعنی انسان کو مسلسل واجبات پر عمل کرنے اور محرمات سے پرہیز کرنے سے اس کام پر ملکہ حاصل ہو جائے تو اس ملکہ و قدرت کو ''ورع'' کہتے ہیں۔[2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "الْوَرَعُ الْوُقُوفُ عِنْدَ الشُّبْهَةِ"[3] ''ورع یعنی جب بھی کسی چیز میں حرام کا شبہ ہو تو وہاں پر توقف اختیار کرنا ہے''۔

۱۔ مغفردات راغب، مادہ تقویٰ

۲۔ زمزمہ روزہ داران، ج۱، ص۱۲۹۔

۳۔ محدث نوری، مستدرک، ج۱۷، ص ۳۲۴۔

عرفاء نے ''ورع'' کے چار مرحلوں کا ذکر کیا ہے:

ا۔ ورع التائبین: یعنی گناہوں سے اجتناب پر ملکہ حاصل کرنا۔ امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"انما الورع تطهير عن المعاصي"[1]

''ورع یعنی گناہوں سے پاک ہو جانا، در حقیقت یہ ملکہ حقیقی توبہ کے بعد ہی ممکن ہے''

۲۔ ورع الصالحین: حقیقی توبہ کے بعد بندہ نہ صرف گناہوں سے، بلکہ شبہات سے بھی پرہیز کرنے لگے پھر بندہ آہستہ آہستہ قرب الٰہی کے منازل کو طے کرتا ہوا محبوب خدا بن کر ''صالحین'' کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔

۳۔ ورع المتقین: کبھی انسان مباح اور حلال کام کو اس لئے ترک کر دیتا ہے کہ کہیں وہ کسی حرام کے لئے مقدمہ نہ بنے، اگر انسان کو اس قسم کے احتیاط پر ملکہ حاصل ہو جائے تو اُسے ''ورع المتقین'' کہتے ہیں۔

۴۔ ورع السالکین: یہ عمل اہل سیر و سلوک سے مخصوص ہے یعنی اہل سیر و سلوک قرب الٰہی اور لقائے معبود سے دور کرنے والی ہر چیز سے پرہیز کرتے ہیں اپنی عمر عزیز کو صرف اور صرف خدا کی قربتوں کے حصول کے لئے مخصوص کر دیں تو ایسی جد و جہد اور کوشش ہی کو ''ورع السالکین'' کہتے ہیں۔

---

[1] مستدرک، ج ۱۷، ص ۳۳۹.

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسان کو گناہوں سے اجتناب کی بناپر تقویٰ حاصل ہوتا ہے اور جب گناہوں سے اجتناب انسان کی عادت بن جائے تو اُس نفسِ اجتناب سے جو ملکہ حاصل ہوتا ہے اسے ورع کہتے ہیں اور جب ملکہ قوی سے قوی تر ہو جائے تو انسان قربِ الٰہی کے اعلیٰ ترین منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ ان مرحلوں کو طے کرتے ہوئے اللہ سے قریب تر ہونے کا بہترین زمانہ ماہِ مبارک رمضان ہے لہٰذا بندۂ مومن خدا کی بارگاہ میں عاجزانہ درخواست کرتا ہے کہ اے خدا اس مہینے میں مجھے لغزشوں اور گناہوں سے محفوظ رکھ۔

تیسرا فقرہ: "وَارْزُقْنِی فِیهِ ذِکْرَکَ بِدَوامِهِ"

مذکورہ دعا میں بندہ اپنے خالق سے اس مبارک مہینے میں ہمیشہ اللہ کی یاد اور ذکر میں مشغول رہنے کی توفیق عطا کرنے کی درخواست کرتا ہے۔

ذکر یعنی کسی بھی چیز کی یادآوری، یہ کبھی زبان کے ذریعہ ہوتی ہے تو کبھی دل سے[1] یعنی انسان دل ہی دل میں کسی چیز کو یاد کرے حتیٰ اس کو زبان پر جاری نہ کرے تب بھی اس کو "ذکر" کہا جاتا ہے۔

چوتھی تاریخ کی دعا میں "وَاَذِقْنِی فِیهِ حَلاوَةَ ذِکْرِکَ" "خدایا!... تو مجھے اپنے ذکر کی شیرینی سے آشنا فرما" کے ذیل میں ذکر سے متعلق آیات اور احادیث

---

[1] مغفردات راغب، مادۂ ذکر، ص۳۲۸.

معصومین علیہم السلام کی روشنی میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے لہٰذا تکرار سے پرہیز کرتے ہوئے صرف چند باتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

بندۂ مومن کو ہمیشہ ذکر الٰہی کرتا رہنا چاہئے، ایسی صورت میں وہ جن وانس کے شر سے محفوظ رہے گا اور اس کے ساتھ ساتھ غیبت اور بہتان جیسی بیہودہ اور جھوٹی باتوں سے دور رہے گا نتیجتاً اسے ثواب بھی حاصل ہوگا اور گناہوں سے بھی محفوظ رہے گا۔

ذکر الٰہی کے فوائد:

۱۔ اطمینان قلب

قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے: ﴿أَلاَ بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ "آگاہ ہو جاؤ اطمینان یادِ خدا ہی سے حاصل ہوتا ہے"۔

آج کل لوگوں میں افسردگی اور مایوسی (ڈیپریشن) کا مرض اس قدر عام ہو چکا ہے جس کی بنا پر ہر انسان پریشان ہے اس کا اہم سبب مادی دنیا سے وابستگی، غیر خدا سے امید باندھنا اور دوسروں پر بھروسہ کرنا ہے، جب امیدیں پوری نہیں ہوتی ہیں اور احباب اور اعزّاء توقعات پر پورا نہیں اترتے ہیں تو پھر انسان رنجیدہ خاطر ہو جاتا ہے، ہاں اگر انسان دنیا سے اپنے توقعات کو منقطع کرکے اپنے آپ کو دائم الذکر بنالے تو پھر وہ افسردہ نہیں ہوگا، یادِ خدا کی بنا پر اس کو قلبی اطمینان حاصل ہوتا رہے گا۔

۲۔ کامیابی وکامرانی

قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيراً لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾[۱] ”اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتو تاکہ تم کامیابی حاصل کرلو“۔

انسان کی حقیقی کامیابی ذکرِالٰہی میں ہے، لہٰذا کثرت سے ذکرِالٰہی کرنے کا حکم ہے، زندگی کے ہر شعبے میں اگر کوئی کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے تواُسے ذکرِ خدا سے غفلت نہیں برتنا چاہئے بلکہ ہمیشہ یادِالٰہی میں مشغول رہے۔

۳۔ شفائے قلب اور جلاءِ باطن

رسول اسلامﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "ذکر اللّٰہ شفاء القلوب ؛ذکرخدادلوں کے لئے شفاء ہے“[۲]۔

دعائے کمیل میں بھی مولائے کائنات نے فرمایا: "يَا مَنِ اسْمُهُ دَوَاءٌ وَ ذِكْرُهُ شِفَاء ؛اے وہ ذات جس کا نام خود دوا ہے اور جس کا ذکر شفا ہے“، لہٰذا اگر قلب کو روحانی امراض سے شفا چاہئے تو پھر ہمیشہ ذکرِ خدا میں دل کو مشغول رکھے، بارگاہِ خداوندی میں کثرت سے یادِ خدا کرنے کی توفیق کی دعامانگے۔

۱۔ سورۂ انفال، آیت ۴۴.

۲۔ کنزالعمال، ص ۱۷۵.

آٹھویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِی فِیهِ رَحْمَةَ الْاَیْتامِ وَ إطْعامَ الطَّعامِ وَ إفْشاءَ السَّلامِ وَصُحْبَةَ الْكِرامِ، بِطَوْ لِكَ يا مَلْجَأَ الأَمِلِينَ»

''خدایا! اس دن میں مجھے یتیموں پر رحم کرنے، دوسروں کو کھانا کھلانے، آشکارا طور پر سلام کرنے اور نیک لوگوں کی صحبت میں رہنے کی توفیق عطا فرما اپنے فضل و نعمت کے ذریعہ،اے آرزومندوں کی پناہگاہ''

اہم مطالب:

اس دعامیں چار اہم مطالب کا ذکر ہوا ہے:

۱۔ یتیم نوازی کی توفیق

۲۔ دوسروں کو کھانا کھلانے کی توفیق

۳۔ دوسروں کو آشکارا طور پر سلام کرنے کی توفیق

۴۔ نیک لوگوں کی صحبت کی توفیق

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی فِیهِ رَحْمَةَ الْاَیْتامِ"

"ایتام" یتیم کی جمع ہے اور یتیم مادۂ "یتم" سے ہے جس کے معنیٰ "انقطاع الصبی عن ابیه قبل بلوغه"[۱] بچہ کا باپ سے اپنے بلوغ سے پہلے جدا ہو جانا۔ یعنی وہ بچہ یتیم کہلاتا ہے جس کا باپ اس کے زمانۂ بلوغ سے پہلے ہی مر جائے ایسا بچہ شفقتِ پدری سے محروم ہو جاتا ہے ایسی صورت میں اس کو ایک مہرباں مربّی کی سخت ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کی صحیح تربیت کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورتوں کو محسوس کرکے اُن ضرورتوں کو مہر و محبت کے ساتھ پورا کرے؛ کیونکہ اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ اس ذمہ داری کو نبھاتا، لہٰذا اسلام نے اس ذمہ داری کو دیگر مسلمانوں کے سپرد کیا کہ وہ یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور اپنی اولاد کی طرح اُن سے پیار اور محبت کریں۔

بزمِ رسالت اور یتیم

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک کمسن یتیم بچہ رسول خداؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں یتیم ہوں، میرے سر پہ باپ کا سایہ نہیں، میری ماں نادار اور بے بضاعت ہے اور گھر میں ایک بن بیاہی بہن ہے جس کا کوئی سرپرست نہیں لہٰذا یارسول اللہ ہمیں کھانے کے لئے کچھ عطا فرمایئے رسول اسلام ﷺ نے اس کی بات بڑی غور سے سنی اور بلال کو حکم دیا اے بلال جاؤ جو کچھ گھر میں کھانے کی چیزیں مُہیّا ہو اُسے لے آؤ. بلال رسولؐ کے گھر سے ۲۱ عدد کھجور

---

[۱] مفردات راغب، مادۂ "یتم".

لے آتے ہیں جسے پیغمبر اکرم ﷺ نے تین حصوں میں تقسیم کیا اور کہا یہ حصہ تمہارا اور باقی دو حصے تمہاری ماں اور تمہاری بہن کے ہیں، رسول کے بزم میں معاذ بھی موجود تھے انھیں بچے پر رحم آیا بے ساختہ کھڑے ہو کر بچے کو گلے لگا کر تسلّی دی، سر پہ شفقت کا ہاتھ پھیرا، یہ دیکھ کر رسول اسلام ﷺ نے فرمایا: اے معاذ! تم جانتے ہو؟ جو کچھ تم نے کیا اس کا اللہ کے نزدیک کیا اجر ہے؟ تم نے جو یتیم کے سر پر دستِ شفقت پھیرا ہے تو اس یتیم کے جتنے بال تمہارے ہاتھ کے نیچے آتے رہے اسی مقدار میں تمہارے گناہ بخش دیئے گئے اور اُسی مقدار میں تمھاری نیکیوں میں اضافہ ہوا۔[1]

قرآنِ کریم اور اکرامِ یتیم:

ا۔ یتیموں کی سرپرستی

خداوند کریم اور حضرات معصومین علیہم السلام نے یتیموں کی سرپرستی کو بہترین اور خدا پسند عمل قرار دیا، قرآن حکیم میں خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ الْيَتَامَي قُلْ إِصْلاَحٌ لَهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ﴾[2]

---

[1] ۔کتاب شہر رمضان، ج۱، ص ۱۴۲.

[2] ۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۰

"اور یہ لوگ (اے رسول) آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ ان کے حال کی اصلاح بہترین عمل ہے اور اگر اُن سے مل جل کر رہو تو یہ بھی تمہارے بھائی ہیں"

دراصل ظہور اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں لوگ یتیموں کو صرف اس لئے اپنے سے قریب رکھتے تھے تاکہ اُن کے اموال، زمین و جائداد پر قبضہ کرلیں، قرآن کریم کا یہ حکم آیا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَي ظُلْماً إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَاراً وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيراً﴾[1] "جو لوگ ظالمانہ انداز سے یتیموں کا مال کھاجاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب واصل جہنم ہوں گے"۔ تو لوگوں نے اپنے گھروں سے یتیموں کو نکال دیا اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ ہم اِن یتیموں سے متعلق کیا کریں تو اس وقت آیت نازل ہوئی: "(اے رسول) یہ لوگ جو آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کررہے ہیں ان سے کہدیجئے کہ یتیموں کے حال کی اصلاح بہترین بات ہے۔ یعنی یتیموں کی سرپرستی اگر اُن کے حال کی اصلاح کے لئے ہو تو یہ عمل اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

۲۔ اموالِ یتیم کی حفاظت

﴿وَآتُوا الْيَتَامَي أَمْوَالَهُمْ وَلاَ تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ وَلاَ تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَي أَمْوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ حُوباً كَبِيراً﴾[2]

---

[1] سورۂ نساء، آیت ۱۰.

[2] سورۂ نساء، آیت ۲.

’’اور یتیموں کو اُن کا مال دے دو اور اُن کے پاکیزہ مال کو بُرے مال سے نہ بدلو اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاجاؤ، ایسا کرنا یقیناً بڑا گناہ ہے‘‘

اس آیۂ کریمہ میں یتیموں کے مال و متاع سے متعلق تین حکم ہیں:

الف: جب یتیم سنِ رُشد کو پہونچ جائے تو ان کے مال کو اُن کے سپرد کردو؛ کیونکہ ان کا مال تمہارے نزدیک امانت ہے جسے صاحبِ مال تک لوٹانا تم پر فرض ہے۔

ب: اور ہرگز اُن کے پاک مال کو ناپاک مال سے نہ بدلو یعنی بسا اوقات یتیموں کے سرپرست اُن کے مال کو اضافہ کرنے کے لئے سود پر دے دیتے یا اس سے کسی حرام کاروبار کرکے اُن کو نفع پہنچاتے تھے لہٰذ قرآن کریم سختی سے سرپرستوں کو اِن کاموں سے روکتا ہے۔

ج: اور ہرگز ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ؛ کیونکہ اس سے یتیم بڑا ہو کر اپنے حق سے محروم ہو جاتا ہے ﴿إِنَّهُ كَانَ حُوباً كَبِيراً﴾ ایسا کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ ’’حُوب‘‘ لغت میں اس ضرورت کو کہتے ہیں جو انسان کو گناہ کی طرف لے جاتا ہے۔[۱]

یتیم نوازی کی فضیلت احادیث کی روشنی میں

۱۔ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

---

[۱] مفردات راغب، مادۂ حُوب.

"أتُحِبُّ أنْ يَلِينَ قَلْبَكَ وَ تَدْرُكَ حَاجَتَكَ؟ اِرحَم اليَتِيمَ وَ امْسَحْ رَأسَهُ وَ أطْعَمَهُ مِن طَعَامِكَ يَلِنْ قَلبَكَ وَ تَدْرَكَ حَاجَتَكَ."[1]

"کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا دل نرم رہے اور حاجت پوری ہو؟ تو پھر یتیم کے ساتھ رأفت و رحمت سے پیش آؤ اور اُس کے سر پر دستِ شفقت پھیرو اور اپنے پاس سے اس کو کھانا کھلاؤ تو تمہارا دل نرم ہوگا اور تمھاری حاجت پوری ہوگی"

۲۔ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"إنَّ فِي الْجَنَّةِ دَاراً يُقَالُ لَهَا دَارَ الْفَرَجِ لَا يَدخُلُهَا إلّا مَن فَرَّحَ يَتَامَى المُؤمِنِينَ"[2]

"یقیناً جنت میں ایک گھر ہے جسے "دارالفرج" کہتے ہیں اس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا مگر وہ جس نے مومنین کے یتیموں کے دلوں کو شاد کیا ہو"

۳۔ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"خَيْرُ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِينَ بَيْتٌ فِيهِ يَتِيمٌ يُحْسَنُ إلَيْهِ وَ شَرُّ بَيْتٍ فِيهِ يَتِيمٌ يُسَاءُ إلَيْهِ، أنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّة هكذا"[3]

"مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور اس کے ساتھ گھر والے حُسن سلوک سے پیش آتے ہوں اور بدترین گھر وہ ہے جس

---

[1] ۔ نہج الفصاحۃ، ص ۳۳۹.

[2] ۔ نہج الفصاحۃ، ص ۱۷۴.

[3] ۔ نہج الفصاحۃ، ص ۱۷۴.

میں یتیم ہو مگر اس کے گھر والے اس کے ساتھ اس گھر میں بد سلوکی سے پیش آتے ہوں میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ایک ساتھ رہیں گے"

۴۔ مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام نے ضربت کھانے کے بعد جو وصیّت اپنے دونوں بیٹوں امام حسن اور امام حسین علیہما السلام سے کی اس میں فرمایا:

"اللَّهَ اللَّهَ فِي الْأَيْتَامِ فَلَا تُغِبُّوا أَفْوَاهَهُمْ وَ لَا يَضِيعُوا بِحَضْرَتِكُم "[1]

"دیکھو یتیموں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا اور اُن کے فاقوں کی نوبت نہ آجائے اور وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے برباد نہ ہو جائیں"

یتیم نوازی، سیرت معصومین کی علیہم السلام روشنی میں

تاریخ گواہ ہے حضرات معصومین علیہم السلام نے ہمیشہ یتیموں، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کی ہے اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھا ہے، دامنِ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جن سے معصومین علیہم السلام کی یتیم پروری کی سیرت کا پتہ چلتا ہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں ایک راستے سے گذر رہے تھے، دیکھا کہ چند لڑکے ایک بچہ کو گھیر کر یہ کہہ کر ستا رہے تھے تیرا باپ نہیں ہے، تو بے پدر ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر اُس یتیم پر پڑتی ہے، آپ نے قریب جا کر اس کو پیار کیا اور پوچھا؛ کیوں رو رہے ہو؟ اس بچہ نے کہا؛ میرا باپ جنگ اُحد میں مارا گیا

---

[1]۔ مستدرک الوسائل، ج۱، ص ۱۴۸۔

اور میری ماں نے دوسری شادی کرلی اور میری بہن بھی مر گئی اور میں بے گھر ہو گیا ہوں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بچہ کو اپنے زانوں پر بٹھایا، جی بھر کے پیار کیا اور فرمایا: اگر تیرا بابا نہیں ہے تو میں تیرا بابا ہوں اور میری بیٹی فاطمہ تیری بہن ہے، یہ کہہ کر اس بچہ کو اپنے گھر لے گئے اور اس بچہ کو شہزادی زہرا کے سپرد کیا، پھر شہزادی نے اس کو کھانا کھلایا، لباس بدلے، وفات رسول تک وہ بچہ اُسی گھر میں رہا۔[1]

اور اسی طرح حضرت علی علیہ السلام بھی کوفے میں ہر شب بیواؤں کے گھر جا کر اُنھیں آذوقہ فراہم کرتے تھے اور ان کے یتیم بچوں سے کھیلتے تھے، یہی سیرت امام حسن، امام حسین، امام سجاد اور دیگر ائمہ علیہم السلام کی رہی ہے جس کا ذکر کتبِ تاریخ وسیر میں موجود ہے۔

لہٰذا اس مبارک ماہ میں خداوند کریم کی بارگاہ میں ہماری دعا یہی ہے: پروردگارا! ہمیں یتیموں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور ان کی حاجتوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرما۔

دوسرا فقرہ: "وَ إطْعامَ الطَّعامِ"

ماہِ مبارک رمضان، ماہِ ضیافت الٰہی ہے اس مہینے میں نادار روزہ داروں کو غذا فراہم کرنا اور اُن کے افطار اور سحری کا اہتمام کرنا سنتِ حسنہ ہے جو الحمد للہ ہمارے درمیان کسی حد تک مرسوم ہے۔

---

[1] مستدرک الوسائل، ج۲، ص ۴۷۴۔

بھوکوں کو کھانا کھلانے کی بڑی فضیلت ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "مِنْ مُوجِبَاتِ الْمَغْفِرَةِ إِطْعَامُ الْمُسْلِمِ السَّغْبَان"[1] بھوکے مسلمان کو غذا فراہم کرنا مغفرت کا سبب ہے۔

اہلبیتِ اطہار علیہم السلام کی سیرت یہی رہی ہے کہ وہ اپنی ضرورت اور خواہش کے باوجود اپنی غذا بھوکے یتیم، مسکین اور اسیر کو دیدیا کرتے تھے، اہلبیت علیہم السلام کا یہی وہ عمل ہے جس کا قصیدہ خداوند رزّاق نے قرآن میں اس طرح پڑھا ہے: ﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَي حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً﴾[2] "باوجود اپنی خواہش وضرورت کے یتیم، مسکین اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں، لہٰذا خداوند کریم کی بارگاہ میں ہماری یہی دعا ہے کہ ہمیں سیرتِ اہلبیت علیہم السلام پر چلنے کی توفیق عطا کرے"۔

تیسرا فقرہ: "وَ إِفْشاءَ السَّلامِ"

سلام کرنا، اخلاقِ اسلامی کا ایک اہم جزء ہے جس کے معنی سلامتی کے ہیں اور اللہ کے اسمائے گرامی میں سے ایک اسم "سلام" بھی ہے؛ کیونکہ وہ ہر عیب و نقص سے مبرّا و منزّہ ہے۔[3] سلام کرنا تواضع اور انکساری کی علامت ہے جو شخص مغرور ہوتا ہے وہ دوسروں کو سلام نہیں کرتا، بلکہ سلام کا منتظر رہتا ہے، سلام کرنا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے۔"أَنَّهُ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَى الصَّغِيرِ وَ الْكَبِيرِ"[4] وہ ہمیشہ ہر بچہ اور بڑے کو سلام

---

[1] ۔ نہج الفصاحۃ ص ۴۲۱.

[2] ۔ سورۂ انسان، آیت ۸.

[3] ۔ المنجد، مادۂ "سلم".

[4] ۔ مستدرک الوسائل، ج ۲، ص ۶۹.

کرنے میں پہل کیا کرتے تھے، اسی لئے آپ نے فرمایا: "أَبْخَلُ النَّاسِ مَنْ بَخِلَ بِالسَّلَامِ" سب سے بڑا بخیل وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں بُخل سے کام لے۔

آدابِ سلام قرآن کریم کی روشنی میں

ا۔ سلام کیسے کریں؟

قرآن کریم میں ارشاد رب العزت ہورہا ہے: ﴿وَإِذَا حُيِّيتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا﴾[۱] "اور جب تمھیں کوئی تحیت (سلام) کرے تو تم اس سے بہتر یا انہی الفاظ سے جواب دو"۔

"تحیت" لغت میں مادۂ "حیات" سے ہے جس کے معنیٰ حیات کی دعا کے ہے، "سلام علیکم" بھی دراصل دعا ہے یعنی خدا آپ کو سلامتی عطا کرے۔

تفسیر علی بن ابراہیم قمیؒ میں مذکورہ آیۂ کریمہ کے ذیل میں امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے: "المراد بالتحية في الآية السلام"[۲] تحیت سے مراد آیت میں سلام اور اس کے علاوہ دیگر نیکی ہے۔

سلام کرنا مستحب ہے ہاں اگر کوئی آپ کو سلام کرے تو پھر آپ پر اسی انداز میں یا اس سے بہتر انداز میں جواب دینا واجب ہے۔

۱۔ سورۂ نساء، آیت ۸۶.
۲۔ تفسیر علی بن ابراہیم قمی.

کون کسے سلام کرے؟

۱۔ یوں تو سلام کی پہل کرنے میں کوئی شرط نہیں ہے، بلکہ جس کی نظر مقابل شخص پر پہلے پڑ جائے وہ سلام کرنے میں پہل کرے، مگر سلام کرنے کے آداب سے متعلق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ کمسن اپنے سے بزرگ کو سلام کرے، ایک آدمی دو آدمیوں کو، راستہ چلنے والا کھڑے ہوئے شخص کو، کھڑا ہوا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے۔[۱]

۲۔ معصوم کا فرمان ہے: جب بھی اپنے گھر میں داخل ہو تو خود پر سلام کرے۔[۲]

کسے سلام نہ کریں؟

امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: یہودیوں، نصرانیوں، مجوسیوں، بت پرستوں اور جن کے دسترخوان پر شراب ہو اُن کو اور شطرنج کی بساط پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو اور اس مرد کو جو زنانہ شکل وصورت میں خود کو ظاہر کرے اور اس شاعر پر جو پاک دامن عورتوں پر اپنے اشعار کے ذریعہ تہمت لگاتا ہے اور اسے جو نماز کی حالت میں ہو اور جو شرابخوار ہو اور جو حمام میں نہا رہا ہو اور کھُلے عام فسق وفجور کرنے والے کو سلام نہ کرو۔[۳]

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عورتیں سلام کیا کرتی تھیں اور آپ اُن کے سلام کا جواب دیتے تھے اور اسی طرح عورتیں حضرت علی

۱۔ میزان الحکمۃ، محمدی ری شہری.
۲۔ میزان الحکمۃ، محمدی ری شہری.
۳۔ میزان الحکمۃ، محمدی ری شہری، حدیث ۳۱۱۱.

علیہ السلام کو سلام کرتی تھیں اور آپ اُن کے سلام کا جواب دیتے تھے، مگر آپ دونوں حضرات جوان عورتوں کو سلام کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔[1]

چوتھا فقرہ: "وَصُحْبَةَ الْكِرامِ"

انسان کی دنیا و آخرت کی سعادت؛ نیک، صادق، باایمان، اپنے قول و فعل پر پابند، دیندار، متدین اور خیر خواہ افراد کی ہمنشینی اور ان کی صحبت میں پوشیدہ ہے، لہٰذا ہمیشہ اچھے اعمال اور صحیح العقیدہ افراد کو اپنا دوست بنائے، احادیث میں وارد ہے کہ انسان اپنے دوستوں اور ہمنشینوں کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے۔

سلمان فارسی

جناب سلمان فارسی، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام اور دیگر نیک افراد کی صحبت اور ہمنشینی ہی کی بناپر ہی اُس عظیم مقام پر پہونچے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں "سلمان منا اهل البيت" کی سند دی۔

چنانچہ روایت میں وارد ہے کہ جناب سلمان کے پاس اون کی ایک عبا تھی جس کو وہ آذوقہ کے ساز و سامان کے لئے استعمال کرتے تھے اور رات میں اُسی کو بستر بنا کر سوتے تھے، ایک دن کا واقعہ ہے کہ عُیینہ بن حصین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتا ہے، گرمیوں کے ایّام تھے رسول کے پاس ہی جناب سلمان اُس عبا کو اوڑھے پسینے میں غرق تشریف فرما تھے، جب عُیینہ نے ان پر نگاہ کی تو کہا: یا رسول اللہ! جب میں

---

[1] میزان الحکمۃ، ری شہری، مادۂ "س"، ح ۳۱۱۲.

آپ کے پاس آئیں تو ایسے لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دیجیے، یہ سن کر رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت متاثر ہوئے اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلاَ تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلاَ تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطاً﴾[1]

"اور اپنے نفسوں کو اُن لوگوں کے ساتھ صبر پر آمادہ کرو جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اسی کی مرضی کے طلبگار ہیں اور خبردار تمہاری نگاہ اُن کی طرف سے پھر نہ جائے اور زندگانی دنیا کی زینت کے طلبگار بن جاؤ اور ہر گز اس کی اطاعت نہ کرنا جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے محروم کر دیا ہے"

اس آیۂ کریمہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہمارے لئے یہ پیغام ہے کہ فضیلت کا معیار مال دنیا اور مادی ثروت کو قرار نہ دیں اسی لئے خداوند کریم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دے کر واضح کر دیا کہ خبردار! ایمان کے مقابلہ میں دولت والوں کی طرف نگاہ بھی نہ اٹھنے پائے، یہ واقعہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بہترین نمونہ ہے کہ وہ اپنے دوست اور ساتھی کے انتخاب میں بصیرت سے کام لیں، اس کے مالِ دنیا کو نہ دیکھے کہ اس کے پاس کتنی دولت و ثروت ہے اور نہ اس کی

---

[1] سورۂ کہف، آیت ۲۸.

ظاہری شکل و صورت کو دیکھے، بلکہ اس کے ایمان اور اعمال صالحہ اور اس کے کردار کو دیکھ کر اُسے اپنا دوست بنائیں۔

بہر حال دوست کے انتخاب میں بصیرت کی ضرورت ہے اچھے دوست آپ کی دنیا و آخرت کو سنوار سکتے ہیں اور بُرے دوست آپ کی دنیا و آخرت کو برباد کر سکتے ہیں بقول سعدی شیرازی کہ:

پسرِ نوح بابدان بنشست خاندان نبوتش گم شد
سگِ اصحابِ کہف روزِ چند پئے نیکان گرفت مردم شد

ترجمہ: نوح کا بیٹا بُرے لوگوں کی صحبت سے خاندانِ نبوت سے جُدا ہو گیا اور اصحاب کہف کا کتّا نیک لوگوں کی صحبت سے جانور سے انسان کی طرح ہو گیا۔

ماہِ مبارک کی اس دعا میں خالق کائنات سے یہی دعا ہے کہ پروردگارا! ہمیں اچھے دوستوں کے انتخاب میں مدد فرما۔

نویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِی فِیهِ نَصِیباً مِنْ رَحْمَتِكَ الْواسِعَةِ
واَهْدِنی فِیهِ لِبَراهِینكَ السّاطِعَةِ، وَخُذْ بناصِیَتی إلی
مَرْضاتِكَ الْجامِعَةِ، بِمَحَبَّتِكَ یَا أَمَلَ الْمُشْتاقِینَ»

"خدایا! اس ماہ (یا دن) میں اپنی رحمتِ واسعہ میرے بھی شاملِ حال کردے اور اس میں میری ہدایت کر اپنی روشن دلیلوں کے ذریعہ اور میری پیشانی کو اپنی جامع خوشنودی کی طرف جھکادے اپنی محبت کے ذریعہ؛ اے مشتاقین کی امید و آرزو"

اہم مطلب:

اس دعا میں تین بنیادی مطالب کا ذکر ہے:

۱۔ اپنے حق میں وسیع رحمت کا مطالبہ

۲۔ روشن دلیلوں کے ذریعہ ہدایت

۳۔ رضائے معبود کی جانب حرکت

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِی فِیهِ نَصِیباً مِنْ رَحْمَتِكَ الْواسِعَةِ"

انسان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ رحمتِ الٰہی اس کے شامل حال ہو، قرآن کریم میں بعض آیات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کی خلقت کا ہدف اللہ کی رحمت تک پہنچنا ہے، مذکورہ دعا میں اللہ کی لامتناہی اور وسیع رحمت کا ذکر ہے۔

خالق کائنات قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾[۱]

"اور میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے"۔

حاملانِ عرش الٰہی بھی کہتے ہیں: ﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَحْمَةً وَعِلْماً﴾[۲]
"اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور تیرا علم ہر شیٔ پر محیط و وسیع ہے"۔

تقریباً یہی مضمون اکثر منقول دعاؤں میں بھی موجود ہے جیسا کہ ہم دعائے کمیل میں بھی پڑھتے ہیں: "وَبِرَحْمَتِكَ الَّتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ" اور دعائے ابو حمزہ ثمالی میں آیا ہے: "أَيْنَ رَحْمَتُكَ الْوَاسِعَةَ" اسی طرح دیگر دعاؤں میں بھی رحمت کا ذکر، صفتِ واسعہ کے ساتھ آیا ہے، جب اللہ کی رحمت ہر شیٔ پر وسیع ہے تو انسان کو اللہ

۱۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۵۶.

۲۔ سورۂ غافر، آیت ۷.

کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے جیسا کہ خود خداوند کریم کا حکم ہے: "لا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّه"[۱] "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا"۔

رحمتِ خدا سے مایوسی خود اپنی جگہ ایک عظیم گناہ ہے، دراصل رحمتِ خدا سے مایوسی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی گناہ ایسا بھی ہے جو خدا کی رحمت سے بھی بالاتر ہے اور معاذاللہ جس کے معاف کرنے پر خدا بھی قادر نہیں ہے، ایسا تصور خود اپنی جگہ گناہ کبیرہ ہے، اس کاہر گزیہ مطلب نہیں ہے کہ "گناہ کیوں نہ کیا کیا خدا رحیم نہ تھا؟"۔ کہہ کر خدا کی رحمت کامذاق اڑایا جائے اور اس کی رحمت کو گناہ کرنے کے لئے "**رحمتِ حق بہانہ می خواہد**" کہہ کر بہترین بہانہ بنالے یہ بھی عظیم گناہ ہے در حقیقت اسلام میں رحمتِ الٰہی سے مایوسی بھی گناہ ہے اور عذابِ خدا سے لاپرواہی بھی بہت بڑا گناہ اور جرم ہے۔

اقسامِ رحمت

آیات و روایت کی روشنی میں رحمتِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ رحمت عام ۲۔رحمتِ خاص

۱۔ رحمتِ عام

جو تمام موجوداتِ عالم کے لئے ہے اور کسی سے مخصوص نہیں ہے، ہر موجود رحمتِ عام سے فیضیاب ہے چاہے وہ مومن ہو یا کافر، انسان ہو یا جانور جیسے پانی، افتاب، آکسیجن وغیرہ وغیرہ۔

---

[۱] سورۂ زمر، آیت ۵۳.

۲۔ رحمتِ خاص

جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ائمہ معصومین علیہم السلام اور ان کے طفیل میں تمام اہلِ ایمان سے مخصوص ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ﴾[1]

"اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے مخصوص کردیتا ہے"

اس آیہ کریمہ کے ذیل میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام اپنے جد امجد حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے حدیث نقل فرماتے ہیں:

"اَلْمُخْتَصُ بِالرَّحْمَةِ نَبِيُّ اللّٰهِ وَ وَصِيُّهُ وَ عِتْرَتُهُمَا إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى خَلَقَ مِائَةَ رَحْمَةٍ فَتِسْعٌ وَ تِسْعُونَ رَحْمَةً عِنْدَهُ مَذْخُورَةٌ لِمُحَمَّدٍ وَ عَلِيٍّ وَ عِتْرَتِهِمَا وَ رَحْمَةٌ وَاحِدَةٌ مَبْسُوطَةٌ عَلَى سَائِرِ الْمَوْجُودِين"

"رحمتِ خاص، مخصوص ہے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے وصی سے، یقیناً اللہ نے رحمت کے ۱۰۰/حصّہ قرار دیئے ہیں ۹۹/حصّے اس کے پاس محفوظ ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام اور ان دونوں کی عترت کے لئے ہے اور باقی ایک حصّہ میں تمام موجوداتِ عالم برابر سے شریک ہیں"

﴿إِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾[2]

"یقیناً اللہ کی رحمت صاحبانِ حُسنِ عمل سے قریب ہے"

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۱۰۵.

[2] سورۂ اعراف، آیت ۵۶.

﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيماً﴾[1]

"اور وہ صاحبانِ ایمان پر بہت زیادہ مہربان ہے"

مذکورہ آیات کریمہ میں رحمت سے مراد، رحمتِ خاص ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اہلبیت اطہار علیہم السلام اور آپ کے سچے مطیع اور فرمانبرداروں سے مخصوص ہے

ماہِ رمضان، ماہ رحمتِ الٰہی

جو افراد اپنی زندگی میں ماہِ رمضان کو دیکھتے ہیں وہ دو طرح کے ہیں:

۱۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنے اعمال اور توبہ و استغفار کے ذریعہ رحمتِ الٰہی سے قریب ہو کر، ماہ رمضان کی فیوضات اور برکتوں سے مالامال ہوتے ہیں

۲۔ کچھ وہ بدنصیب ہیں جو ماہ رحمت میں بھی اپنے گناہوں کو نہیں بخشوا سکتے، یعنی اس مبارک مہینے میں بھی معصیت اور گناہ میں مشغول رہتے ہیں اور توبہ و استغفار سے دور رہتے ہیں ایسے لوگ ملعون ہیں یعنی رحمت خدا سے دور، کیونکہ رحمت کی ضد لعنت ہے، لہٰذا جو لوگ رحمتِ خدا سے دور ہیں اُن کے گردنوں میں لعنت کے طوق ہیں۔ لعنت یعنی رحمت الٰہی سے دوری، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم خود اپنے بُرے اعمال اور عصیان و نافرمانی کی بناپر رحمتِ خدا سے دور رہتے ہوئے دوسروں پر لعنت بھیجتے ہیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"مَنْ أَدْرَكَ شَهْرَ رَمَضَانَ فَلَمْ يُغْفَرْ لَهُ فِيهِ فَمَاتَ فَدَخَلَ النَّارَ فَأَبْعَدَهُ اللَّه"[2]

---

[1] ۔ سورۂ احزاب، آیت ۴۳.

[2] ۔ بحار الانوار، علامہ مجلسی، ج۷۱، ص ۲۲

”جو بھی ماہ رمضان کا ادراک کیا ہو اور اپنے گناہوں کو نہ بخشوا سکا وہ شخص ملعون اور رحمت خدا سے دور ہے“

یہ ماہِ رمضان درحقیقت ماہِ رحمت، ماہِ برکت اور ماہِ مغفرت ہے جیسا کہ احادیث میں وارد ہے:

"قَدْ أَقْبَلَ إِلَيْكُمْ شَهْرُ اللَّهِ بِالْبَرَكَةِ وَ الرَّحْمَةَ"

”ماہِ رمضان تمہارے پاس برکت اور رحمت کے ہمراہ آیا ہے“

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"فَإِنَّ الشَّقِيَّ مَنْ حُرِمَ غُفْرَانَ اللَّهِ فِي هَذَا الشَّهْرِ"[1]

”بدبخت اور شقی وہ شخص ہے جو اس ماہ میں اللہ کی مغفرت سے محروم ہے“

بارگاہ خداوند کریم ورحیم میں یہی دعا ہے: پروردگارا! اس مہینے کی برکتوں اور رحمتوں سے ہمیں محروم نہ فرما۔

دوسرا فقرہ: "وَاهْدِنِی فِیهِ لِبَرَاهِینِكَ السَّاطِعَةَ"

ہدایت کا کلمہ آیاتِ قرآنی اور احادیث معصومین علیہم السلام میں متعدد مرتبہ آیا ہے جس کے معنی رہنمائی کے ہیں، رہبر ورہنما کو عربی میں ہادی بھی کہا جاتا ہے۔ انسان اُسی وقت ہدایت یافتہ کہلاتا ہے جب وہ منزلِ سعادت اور قلۂ معرفت تک پہونچتا ہے جس کے لئے ابتدا میں چند چیزوں کی ضرورت ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ، علامہ حرّ عاملی، باب تاکد استحباب الاجتہاد...، ص ۳۰۳.

الف: راہِ خدا کی شناخت: اس راہ کو جاننا ضروری ہے جس پر چل کر انسان ہدایت یافتہ اور سعادت مند کہلاتا ہے۔ وہ راہ، صراط مستقیم ہے جس پر ہدایت پانے کی تمنا کسی ایک فرد بشر کی نہیں، بلکہ پورے کاروان بشریت کی ہے، اسی لئے خداوند کریم نے سورۂ حمد میں ہماری اس فطری تمنا کو اس طرح بیان کیا﴿اهْدِنَا الصِّرَطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (سیدھے راستے پر (چلنے کی) ہمیں رہنمائی فرما) لہٰذا سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اس راستے کو پہچانیں جو ہمیں منزلِ مقصود تک اور لقائے معبود کی چوکھٹ تک پہونچاتی ہے۔

ب: ہدایت کے اسباب: حق کی راہ پر اسباب کے بغیر ہدایت ناممکن ہے لہٰذا اسبابِ ہدایت کا فراہم ہونا ضروری ہے، اسباب ہدایت یہ ہیں کہ انسان ہر بات کو غور سے سنے اور اچھی طرح تجزیہ و تحلیل کرے اور غور کرے چنانچہ قرآن کریم میں خالق کائنات اعلان کر رہا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالأَبْصَارَ وَالأَفْئِدَةَ قَلِيلا﴾[۱]

"(اے رسول) کہد یجئے خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اور تمھارے لئے کان، آنکھ اور دل قرار دیا ہے، مگر پھر بھی تم بہت کم شکریہ ادا کرنے والے ہو"

یہ نعمتیں اسبابِ ہدایت ہیں اگر انسان ان سے صحیح کام لے اور اللہ کی نشانیوں میں غور و فکر کرے تو پھر منزلِ ہدایت کی جانب آگے بڑھ سکتا ہے، اگر انسان اِن نعمتوں کے باوجود ہدایت کی منزل کی طرف آگے نہ بڑھے اور ان کا

۱۔ سورۂ ملک، آیت ۲۳.

صحیح استعمال نہ کرے تو وہ پھر ﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لاَ يَرْجِعُونَ﴾[1] ہی کا مصداق ہے۔

ج: رہنما: راہ اور اسباب کی شناخت کے ساتھ ساتھ الٰہی رہنما کی شناخت بھی ضروری ہے؛ کیونکہ انسان اگر کسی غلط انسان کو رہنما مان کر اس کی اطاعت میں آگے بڑھے گا تو وہ یقیناً راہِ حق سے گمراہ ہو جائے گا۔ لہٰذا اللہ نے انسان کی ہدایت کے لئے رہنماؤں کا اہتمام کیا اور اعلان کیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِي إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً وَمُبَشِّراً وَنَذِيراً وَدَاعِياً إِلَي اللهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجاً مُنِيراً﴾[2]

''اے پیغمبر! ہم نے آپ کو گواہ، بشارت دینے والا، عذاب الٰہی سے ڈرانے والا اور خدا کی طرف اس کی اجازت سے دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے''

عالم اسلام میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہادی اور رہنما ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، مگر رسول کے بعد وہ کون ہیں جن کی اطاعت ہی سے ہدایت اور نجات ممکن ہے؟۔ قرآن کریم کی روشنی میں اُن کی شناخت بھی آسان ہے کیونکہ ارشاد ربّ العزت ہو رہا ہے:

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا﴾[3]

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۱۸.
[2] سورۂ احزاب، آیت ۴۵ و ۴۶.
[3] سورۂ انبیاء، آیت ۷۳.

''اور ہم نے ان کو پیشوا قرار دیا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں''

پیغمبر اکرم ﷺ کی حدیث ثقلین اور دیگر احادیث نبوی سے وہ راہنما معلوم اور معین ہیں، اگر ان کی معرفت نہ ہو تو پھر اس کی موت جاہلیت یعنی کفر وشرک کی موت ہوگی۔

د: **سراپا تسلیم**: رہنما کی شناخت کے بعد سب سے اہم مرحلہ خود کو اس رہنما کے سپرد کر دینا ہے یعنی اس کو واجب الاطاعت، جانتے ہوئے اس کا اتباع کرے، نہ صرف واجب الاطاعت بلکہ اپنے نفوس پر اُسے اولیٰ بالتصرف جانے، قرآن کریم میں ﴿وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾"کے یہی معنیٰ و مفہوم ہے۔

ہدایت کی اقسام:

ہدایت کی مختلف تقسیم ہوئی ہے کہ ان میں سے ایک یہ ہے: ہدایت کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ ہدایتِ عام ۲۔ ہدایتِ خاص

۱۔ **ہدایتِ عام**: جسے ہدایت "اِرَائَةُ الطَّرِيق" بھی کہتے ہیں یعنی ہادی کا طالبِ ہدایت کے لئے راہ اور مسیر کو بتادینا یعنی صرف راستہ بتادینا۔ یہ عمومی ہدایت اُس شخص کی ذمہ داری ہے جسے راہِ ہدایت کا علم حاصل ہے۔

۲۔ **ہدایتِ خاص**: جسے ہدایت ''ایصال الی المطلوب'' بھی کہتے ہیں یہ ہدایت صرف اور صرف ائمہ علیہم السلام سے مخصوص ہے، سورۂ انبیاء، آیت ۷۳ میں ﴿أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا﴾ سے اِسی ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔

ایک تقسیم کے لحاظ سے ہدایت کی کچھ اور بھی تقسیم ہوئی ہے جیسے:

ا۔ ہدایتِ تکوینی جو تمام موجودات عالم میں موجود ہے یعنی اللہ نے انھیں فطری طور پر یہ صلاحیت عطا کی ہے وہ فطرتاً ہدایت پا سکتے ہیں۔

۲۔ ہدیتِ تشریعی: اللہ نے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے ذریعہ آسمانی کتابوں کے نزول کے ساتھ اس ہدایت کا اہتمام فرمایا۔

ہدایت کے ذیل میں آیات قرآنی اور احادیث معصومین علیہم السلام کی روشنی میں گفتگو ہو سکتی ہے مگر اختصار کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اس بحث کو یہیں پر ختم کیا جاتا ہے اگر کسی کو ہدایت کے ذیل میں مزید معلومات حاصل کرنا ہے تو وہ کتب تفاسیر کی طرف رجوع کریں بالخصوص آیۃ اللہ جوادی آملی کی تفسیرِ موضوعی، ہدایت در قرآن جلد ۱۶/ کی جانب رجوع کریں۔

براہینِ ساطعہ سے کیا مراد ہے؟

آج کی مذکورہ دعا میں خداوند کریم کی بارگاہ میں یہ التجا ہے؛ خدایا! میری ہدایت فرما اپنی روشن دلیلوں کے ذریعہ۔

براہین، برہان کی جمع ہے اور "ساطعہ" براہین کی صفت یعنی روشن اور واضح کے معنٰی میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ روشن دلائل سے مراد کیا ہے؟

قرآن کریم اور محمد و آل محمد علیہم السلام ہی اللہ کے "براہینِ ساطعہ" ہیں؛ کیونکہ قرآن کریم کی شان یہ ہے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لاَ رَيْبَ فِيهِ هُدي لِلْمُتَّقِينَ﴾[1]

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۲.

''یہ وہ کتاب ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے، یہ صاحبان تقویٰ کے لئے ہدایت ہے''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْن كِتَابُ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَل وَ عِتْرَتِي أَهْلُ بَيْتِي"[۱]

''میں تمہارے درمیان دو گرانبہا چیزیں چھوڑے جارہا ہوں اللہ کی کتاب اور میری عترت یعنی اہلبیت، یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے ملیں گے جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہوگے ہرگز گمراہ نہیں ہوں گے''

حدیث ثقلین سے یہ بات ثابت ہے کہ اہلبیت علیہم السلام ''براہینِ ساطعہ'' ہیں اگر انھیں چھوڑ دوگے تو پھر گمراہی اور ضلالت ہی مقدر ہے۔

خدا کی روشن دلیلوں کی جانب ہدایت

جیسا کہ آپ کو علم ہے ''برہانِ ساطع'' کے معنی روشن دلیل کے ہیں قرآن کریم میں چند مقامات پر ''برہان'' کا لفظ استعمال ہوا ہے بطور مثال دو چیز کا ذکر مقصود ہے۔

۱۔ خداوند کریم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿یَا أَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَکُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّکُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَیْکُمْ نُوراً مُبِیناً﴾[۲]

۱۔ بحارالانوار، ۲، ص۱۰۰۔

۲۔ سورۂ نساء، آیت ۱۷۴۔

''اے انسانوں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان آچکا ہے
اور ہم نے تمہاری طرف آشکار نور بھی نازل کردیا ہے''

مفسرین نے ''برہان'' کی تفسیر میں کہا ہے اس آیہ کریمہ میں برہان سے مراد قرآن کریم یا دین اسلام یا رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں، اگرچہ ان تینوں مصادیق کا ایک کلی عنوان کے تحت جمع ہونا ممکن ہے۔

۲۔ داستانِ حضرت یوسفؑ کے ذیل میں خداوند کریم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلاَ أَنْ رَأَي بُرْهَانَ رَبِّهِ....﴾[1]

''اور یقیناً اس عورت نے اُن سے برائی کا ارادہ کیا اور وہ بھی ارادہ کر بیٹھتے اگر
اپنے رب کی طرف سے دلیل نہ دیکھ لیتے''

جب زلیخا نے حضرت یوسفؑ کو اپنی جانب گناہ کی دعوت دی، اس وقت حضرت یوسفؑ کے پیشِ نظر ''برہانِ الٰہی'' نہ ہوتی تو وہ بھی ارادہ کر بیٹھتے، بعض مفسرین نے لکھا کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جناب یوسفؑ بھی گناہ کا ارادہ کر بیٹھتے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زلیخا کے قتل یا اُسے مارنے کا ارادہ کر بیٹھتے۔

بہرحال مذکورہ آیۂ کریمہ میں ''برہان'' سے مراد، حرمتِ زنا کے حکم کی یاد آوری یا مقامِ عصمت یا روح ایمان و تقویٰ یا مقامِ شہود الگ الگ تفسیریں منقول ہیں۔

۳۔ داستان حضرت موسیٰؑ و فرعون کے ذیل میں خداوند کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

---

[1] سورۂ یوسف، آیت ۲۴.

﴿فَذَانِكَ بُرْهَانَانِ مِنْ رَبِّكَ إِلَي فِرْعَوْنَ وَمَلَئِه﴾[۱]
"تمہارے لئے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی طرف یہ دو دلیلیں ہیں"

اس آیۂ کریمہ میں "دو برہان" سے مراد حضرت موسیٰ کا عصا اور "ید بیضا" ہے۔ مختصر یہ کہ ہر وہ چیز برہانِ ساطع ہے جس کے ذریعہ اللہ کی جانب ہدایت و رہنمائی ہوتی ہے، لہٰذا ائمہ اطہار علیہم السلام بھی "براہینِ ساطعہ" کے مصادیقِ اوّلیہ میں سے ہیں اسی لئے حضرت امام علی النقی علیہ السلام نے زیارت جامعہ کبیرہ میں فرمایا: "نُورِهِ وَ بُرهانِهِ" ائمہ اہلبیت علیہم السلام اللہ کے نور اور اس کی جانب دلیل ہیں۔

تیسرا فقرہ: "وَخُذْ بِناصِيَتي إلى مَرْضاتِكَ الْجامِعَةِ"

دعا کے جملہ میں "ناصیہ" سے پیشانی اور "مرضاتِ جامعہ" سے اللہ کی مکمل اور جامع رضا مراد ہے؛ چونکہ بندۂ مومن کی پیشانی، سجدۂ الٰہی کا مقام ہے اور بندہ جب اللہ کے لئے سجدہ کرتا ہے تو گویا وہ خود کو رضائے معبود کے سامنے تسلیم اور اس کے سپرد کردیتا ہے لہٰذا دعا کے اس جملہ میں بندہ، خالق کی بارگاہ میں یہ التجا کررہا ہے خدایا! میری پیشانی کو تو اپنی مکمل اور جامع رضا کی طرف لے جا۔

رضائے معبود سے متعلق دوسری تاریخ کی دعا کے اس فقرہ "اَللّٰهُمَّ قَرِّبْني فيهِ إلى مَرْضاتِكَ" کے ذیل میں گفتگو ہوچکی ہے، لہٰذا یہاں پر "وَخُذْ بِناصِيَتي إلى مَرْضاتِكَ الْجامِعَةِ" کے ذیل میں چند باتوں کا ذکر کرکے گفتگو کو ختم کردینا ہے۔

۱۔ سورۂ قصص، آیت ۳۲۔

مرضاتِ جامعہ سے مراد کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ "رِضَا اللّٰهِ سُبْحَانَهُ مَقْرُونٌ بِطَاعَتِهِ"[۱]. ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا، اطاعت کے ساتھ ساتھ ہے''۔ اور یہ انسان کے لئے سب سے بڑی کامیابی اور سب سے بڑی سعادت مندی ہے اور یہ بندہ کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ اللہ کے اوامر و نواہی کی اطاعت کرتا ہے، لہٰذا اگر بندہ کو مرضیٔ معبود حاصل کرنا ہے تو وہ خدا کا مطیع و فرمانبردار بن جائے اور افسوس ہے اس بندہ پر جو اس کی ناراضگی کو بندوں کی رضایت کے بدلہ خرید لیتا ہے، چنانچہ امام سجاد علیہ السلام نے مسجدِ دمشق میں اُس خطیب کے لئے فرمایا جو منبر پر بیٹھ کر یزید کی تعریف کررہا تھا، امام نے اس سے خطاب کرکے فرمایا: وائے ہو تجھ پر تونے خالق کی ناراضگی خریدی مخلوقین کی رضایت کے عوض، بسا اوقات ہم لوگ بھی اپنے معاشرہ میں ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے عوام تو خوش ہوجاتی ہیں مگر خدا، رسولؐ اور اہلبیتؑ ناراض ہوجاتے ہیں، حتیٰ عوام کی ناراضگی سے بچنے کے لئے صحیح مسائل اور صحیح عقائد کو پیش کرنے سے بھی ڈرتے اور کتراتے ہیں اور اس پر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اگر کوئی صحیح مسائل اور صحیح عقائد کو پیش کرتا ہے تو اس کی کھلم کھلا مخالفت کے لئے کمر بستہ ہوجاتے ہیں اور اپنے غلط کاموں پر مصلحت کی ردا ڈال دیتے ہیں، اے کاش ان امور میں ملوّث رہتے ہوئے ہمیں سخط اور غضب الٰہی کے دردناک عذاب کی یاد آجاتی اور جس مولا کی محبت کا ہم دم بھرتے ہیں اس کا جملہ یہ یاد آجاتا:

۱۔ غرر الحکم، ص۵۴۱.

"یَا رَبِّ وَ أَنْتَ تَعْلَمُ ضَعْفِي عَنْ قَلِيلٍ مِنْ بَلَاءِ الدُّنْيَا وَ عُقُوبَاتِهَا وَ مَا يَجْرِي فِيهَا مِنَ الْمَكَارِهِ عَلَى أَهْلِهَا عَلَى أَنَّ ذَلِكَ بَلَاءٌ وَ مَكْرُوهٌ قَلِيلٌ مَكْثُهُ يَسِيرٌ بَقَاؤُهُ قَصِيرٌ مُدَّتُهُ فَكَيْفَ احْتِمَالِي لِبَلَاءِ الْآخِرَةِ وَ جَلِيلِ وُقُوعِ الْمَكَارِهِ فِيهَا وَ هُوَ بَلَاءٌ تَطُولُ مُدَّتُهُ وَ يَدُومُ مَقَامُهُ..."[۱]

"اے پروردگار دنیا کی مختصر آزمائشوں اور تکلیفوں کے مقابل میری کمزوری کو تو جانتا ہے میں، اور وہ ناپسندیدہ امور جو اہل دنیا کے لئے پیش آتے (میں انھیں برداشت نہیں کر سکتا) اگرچہ وہ بلا و رنج دیرپا نہیں ہوتی اس کی مدت کم اور اس کی بقا مختصر ہوتی ہے تو بھلا مجھ سے آخرت کی بلا اور وہاں کی بڑی بڑی تکلیفیں کس طرح برداشت ہوں گی جب کہ اس عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہوگی اس لئے کہ وہ عذاب تیرے غضب، تیرے انتقام اور تیری ناراضگی کے سبب ہوگا اور تیری ناراضگی کو نہ آسمان برداشت کرتا ہے اور نہ زمین"

لہٰذا آج کے دن خالق کی بارگاہ میں ہماری یہی دعا ہے: خدایا! ہماری پیشانیوں کو اپنی جامع مرضی کی طرف لے جا اور ہمیں آخرت کے دردناک عذاب سے محفوظ رکھ۔

۱۔ دعائے کمیل، مفاتیح الجنان، ص ۱۱۲.

دسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْمُتَوَكِّلِينَ عَلَيْكَ، وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْفائِزِينَ لَدَيْكَ، وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ إِلَيْكَ، بِإِحْسانِكَ يا غايَةَ الطّالِبِينَ»

"خدایا! آج کے دن مجھے اُن لوگوں میں قرار دے جو تجھ پر بھروسہ کرتے ہیں اور مجھے اس دن میں اپنی بارگاہ میں کامیاب ہونے والوں میں قرار دے اور مجھ کو اپنے مقرب بندوں میں قرار دے، اپنے حُسنِ کرم سے اے طلبگاروں کے مقصود"

اہم مطالب:

آج کی اس دعا میں تین اہم مطالب کی طرف اشارہ ہوا ہے:

۱۔ اللہ پر بھروسہ اور توکل کرنے والوں میں شمار پانا۔

۲۔ اللہ کے حضور کامیاب بندوں میں شمار پانا۔

۳۔ اللہ کے بے حد قریب بندوں میں سے قرار پانا۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْمُتَوَكِّلِينَ"

"توکل" دراصل مادۂ "وکالت" سے اپنے لئے وکیل انتخاب کرنے کے ہیں اور وکالت کے معنیٰ اپنے امور کو دوسرے کے حوالہ کردینے کے ہیں، خداپر توکل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام مادی اور معنوی امور کی تاثیر کو خداکے سپرد کردے۔ توکل کاہر گزیہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنے کام کاج کو چھوڑکر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جائے اور کہے کہ خداپر بھروسہ ہے وہ میرے اور میرے گھر والوں کے رزق کامالک ہے۔ خداپر توکل کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنی دینی اور دنیاوی، فردی اور اجتماعی تمام ذمہ داریوں کو بحُسن وخوبی نبھانے کے لئے اللہ سے مدد طلب کرے اور اعمال کے نتیجہ کو خداپر چھوڑدے۔

علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں "توکل" کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: "توکل کے معنیٰ یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام امور کی تاثیر کو خداکے حوالہ کردے اور صرف اور صرف خداہی کواپنے امور میں مؤثر جانے"۔

دوسری جگہ پر لکھتے ہیں: "توکل کے معنیٰ یہ ہے کہ بندہ اپنے خداکواپنے لئے یوں وکیل قرار دے کہ جو تصرّف بھی چاہے وہ بندہ کے امور میں انجام دے"۔[1]

انسانِ باایمان کی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے تمام امور میں اللہ پر توکل کرتاہے اور اس بات کااعتقاد رکھتاہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ جو بھی کرے گااس کے حق میں خیر ہی ہوگا،

[1] ۔ المیزان، ج۱۷، ص۵۰۷.

جس انسان کا یہ عقیدہ ہوگا تو وہ ہر مشکل منزل میں صبر سے کام لے گا اور غیر خدا سے شکوہ نہیں کرے گا اور اسے اللہ کی مرضی جان کر تحمل سے کام لے گا۔

آج دنیا میں خصوصاً یورپی ممالک میں افسردگی (ڈپیریشن) کا مرض جو عام ہے صرف اس لئے ہے کہ وہ نعمتِ توکل سے محروم ہیں اور تعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ متدین افراد میں یہ مرض بہت کم ہوتا ہے، افسردگی کا نتیجہ خودکشی ہے لہٰذا متدین افراد کو خودکشی کرتے ہوئے بہت کم دیکھا گیا ہے۔

اس بات سے بھی غافل نہ ہو کہ توکل اسی وقت صحیح معنیٰ و مفہوم رکھتا ہے کہ جب ہم اپنی ذمہ داری کو بخوبی انجام دیں اور صحیح اور صالح عمل انجام دیں اس وقت ہمارا خدا پر توکل کرنا درست ہوگا نہ یہ کہ عمل کو غلط انجام دے اور خدا پر بھروسہ کرے۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص جو اپنے اونٹ کو نہیں باندھتا تھا اور کہتا تھا مجھے اپنے پروردگار پر پورا بھروسہ ہے وہ جو بھی کرے گا میرے حق میں خیر ہی کرے گا، رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے طلب کیا اور فرمایا: پہلے اپنے اونٹ کو صحیح طریقہ سے باندھ پھر خدا پر توکل کر۔[1]

توکل کے معنیٰ و مفہوم

ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل سے سوال فرمایا: اللہ پر توکل کے کیا معنی ہیں؟ جبرئیل نے جواب دیا:

---

[1] ۔ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید معتزلی، ج۱۱، ص۲۰۱.

"الْعِلْمُ بِأَنَ الْمَخْلُوقَ لَا يَضُرُّ وَ لَا يَنْفَعُ وَ لَا يُعْطِي وَ لَا يَمْنَعُ وَ اسْتِعْمَالُ الْيَأْسِ مِنَ الْخَلْقِ فَإِذَا كَانَ الْعَبْدُ كَذٰلِكَ لَمْ يَعْمَلْ لِأَحَدٍ سِوَى اللّٰهِ وَ لَمْ يَرْجُ وَ لَمْ يَخَفْ سِوَى اللّٰهِ وَ لَمْ يَطْمَعْ فِي أَحَدٍ سِوَى اللّٰهِ فَهَذَا هُوَ التَّوَكُّل"[۱]

''اس بات کا علم و یقین رکھنا کہ کوئی بھی مخلوق نہ اُسے فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ ہی ضرر، اور نہ کوئی چیز عطا کر سکتی ہے اور نہ روک سکتی ہے اور بندہ، مخلوق سے مایوس ہو جائے پس جب انسان اس منزل پر پہونچ جائے تو وہ خدا کے علاوہ کسی اور کے لئے کام نہیں کرے گا اور خدا کے علاوہ نہ کسی اور سے امید رکھے گا اور نہ ڈرے گا خدا کے علاوہ کسی اور سے کوئی آرزو نہیں کرے گا، یہ ہے توکل کے معنیٰ''

مذکورہ روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بندۂ متوکل، نہ خدا کے علاوہ کسی سے ڈرتا ہے اور نہ غیر خدا سے امیدیں وابستہ رکھتا ہے، بلکہ ہر چیز کی امید خدا سے وابستہ رکھتا ہے۔

اطلاقِ توکل

دراصل توکل کا اطلاق تین جگہوں پر ہوتا ہے:

۱۔ **قسمت:** یعنی اللہ نے جو اس کی قسمت میں لکھا اُسے کوئی چھین نہیں سکتا اور جو قسمت میں نہیں ہے اُسے کوئی دے نہیں سکتا۔ ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلاَّ عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ

۱۔ سفینۃ البحار، ج۲، ص۳۸۶.

وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلاَّ بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ﴾[۱] ''اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور ہر شیٔ کو ایک معین مقدار میں ہی ہم نازل کرتے ہیں''۔

﴿اللهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ﴾[۲]

''اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق وسیع یا تنگ کر دیتا ہے''

مذکورہ آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو چیز جس کی قسمت میں لکھی ہوئی ہے اُسے اللہ ضرور عطا کرتا ہے اور قسمت اور تقدیر صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ نصرت: نصرت میں توکل کا مطلب یہ ہے اگر انسان راہِ حق پر گامزن ہے تو پھر اُسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ اللہ پر بھروسہ کرے کہ وہ اس کی مدد ضرور کرے گا جیسا کہ وہ خود ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَي اللهِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ، إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللهُ فَلاَ غَالِبَ لَكُمْ﴾[۳]

''جب ارادہ کر لیا تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا''۔

۳۔ حاجت: حاجت اور ضرورت کے موقعہ پر صرف خدا پر توکل اور بھروسہ کرے: ﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَي اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾[٤] اور جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو خدا اس

۱۔ سورۂ حجر، آیت ۲۱.
۲۔ سورۂ رعد، آیت ۲۶.
۳۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹۔۱۶۰.
٤۔ سورۂ طلاق، آیت ۳.

کے لئے کافی ہے، خلیلِ حق جناب ابراہیمؑ کا واقعہ ہمارے لئے نمونۂ عمل ہے کہ وہ نہ نارِ نمرود سے ڈرے نہ دشمن سے خوف کھائے؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انھوں نے اپنا فرض نبھایا، لہٰذا اب ڈرنے کی ضرورت نہیں جو قسمت میں ہے وہ ہو کر رہے گا، اور اللہ کی مدد پر بھی بھروسہ ہے، اسی لئے جبرئیل کی مدد کو بھی "و أمّا اليك فلا" کہہ کر رد کردیا، جناب ابراہیمؑ نے توکل کی اس منزل پر پہونچ کر ہی لباسِ خُلت کو زیبِ کردار کیا۔

انسان کی زندگی میں اللہ پر توکل کا اثر

جیسا کہ ابھی عرض کیا انسان اللہ پر بھروسہ اور توکل کرنے سے یاس و ناامیدی اور افسردگی (ڈپیریشن) جیسے روحی اور نفسیاتی امراض سے محفوظ رہتا ہے، ہر مشکل موقعہ پر اُسے اطمینان و سکون رہتا ہے؛ کیونکہ اس نے اپنے تمام امور کے نتائج کو اب خدا کے حوالے کردیا ہے اب وہ جو بھی کرے گا بھلا ہی ہوگا ایسا انسان حالاتِ زمانہ سے کبھی ٹوٹتا نہیں ہے، حضرت امام علی رضاعلیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "مَنْ أَرَادَ أَنْ يَكُونَ أَقْوَى النَّاسِ فَلْيَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّه"[1] "جو بھی طاقتور ترین انسان بننا چاہتا ہے اُسے اللہ پر بھروسہ کرنا چاہئے"۔

امام محمد باقرعلیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

" مَنْ تَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ لَا يُغْلَبُ"

"جو بھی اللہ پر توکل کرے گا وہ کبھی مغلوب نہیں ہوگا"

---

[1] ۔ میزان الحکمۃ، ج۱، ص۶۸۱.

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

"مَنْ أُعْطِيَ ثَلَاثاً لَمْ يُحْرَمْ ثَلَاثاً مَنْ أُعْطِيَ الدُّعَاءَ أُعْطِيَ الْإِجَابَةَ وَ مَنْ أُعْطِيَ الشُّكْرَ أُعْطِيَ الزِّيَادَةَ وَ مَنْ أُعْطِيَ التَّوَكُّلَ أُعْطِيَ الْكِفَايَة"

جسے تین چیزیں دی جاتی ہیں اس سے تین چیزوں کو محروم نہیں کیا جاتا ہے

۱۔ جسے دعا کی توفیق دی جاتی اسے اجابت بھی دی جاتی ہے

۲۔ جسے شکر کی توفیق عطا کی جاتی ہے اُسے زیادئ نعمت بھی عطا کی جاتی ہے۔

۳۔اور جسے توکل کی توفیق عطا کی جاتی ہے اُسے کفاف و قناعت بھی عطا کی جاتی ہے۔

اس کے بعد امامؑ فرماتے ہیں: "أَ تَلَوْتَ كِتَابَ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَ ﴿وَ مَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُه﴾" پھر فرمایا: ﴿وَ قَالَ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾اور پھر فرمایا: ﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾

زاہدِ متوکل کا عبرت آموز واقعہ:

کسی زمانے میں حاتمِ اصم نامی ایک زاہد و عابد شخص تھا جو مالی اعتبار سے بہت غریب تھا، مگر کثیر العیال تھا لہٰذا بڑی مشکل سے اس کی زندگی بسر ہوتی تھی ایک رات اپنے رفقاء کے ہمراہ بیٹھا گفتگو میں مصروف تھا کہ بات حج و زیارات تک آپہونچی، حج بیت اللہ کا ذکر چھڑنا تھا کہ اس کے دل میں خانۂ کعبہ کی زیارت کی تمنا

کروٹ لینے لگی پھر کیا تھا کہ فوراً گھر گیا اپنے تمام بال بچوں کو یکجا کیا، پھر کہا میں حج پر جانا چاہتا ہوں اور میں وہاں جاکر تم سب کے لئے دعا کروں گا، بیوی اور بچوں نے کہا ہمارے حالات ایسے نہیں ہیں کہ آپ ہمیں چھوڑ کر سفرِ حج پر روانہ ہو جائیں، حج تو مالدار پر واجب ہے، ہم تو فقیر ہیں، یہ سن کر اس مردِ زاہد کی آس ٹوٹ گئی مگر اس کی ننھی منّی سب سے چھوٹی ایک بچی تھی جو بہت سمجھدار اور شریں زبان تھی، اُس نے سب کی بات کاٹتے ہوئے کہا: بابا کو حج پر جانے سے نہ روکو، رزق کا ذمہ دار خالق ہے کل تک وہ باباکے وسیلہ سے ہم تک رزق پہونچاتا تھا، بابا حج پر چلے جائیں گے تو کسی اور کو ذریعہ بنائے گا، اس بچی کی حکمت آمیز گفتگو سن کر سب راضی ہو گئے، الغرض وہ مردِ زاہد، حاتم اصم ایک قافلہ کے ہمراہ حج کے سفر پر نکل پڑا گو کہ اس کے پاس نہ سواری تھی اور نہ پونجی، قافلہ میں وہ سب سے زیادہ فقیر تھا، مگر عشق الٰہی میں ہر مشکل کو شاداں و فرحاں گلے سے لگاتے ہوئے منازلِ سفر طے کرتا رہا، ادھر اس کے گھر میں فاقوں کی نوبت آپہونچی، لوگ اس کے گھر والوں کی مدد کرنے کے بجائے یہ کہہ کر طعنہ دینے لگے کہ کیا ضرورت تھی اِن حالات میں سفر کرنے کی، گھر والوں کی کوئی پرواہ کئے بغیر اس طرح حج پر جانا کیا صحیح ہے؟ طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں جتنے منھ اتنی باتیں، بہر حال گھر والے بھی اِن چہ می گوئیوں سے عاجز ہو کر گھر کی چھوٹی بچی کو قصوروار ٹھہرانے لگے، وہ بچی رات کے وقت مصلّیٰ بچھا کر بارگاہ ربّ العزت میں دست بدعا ہوتی ہے اور کہتی ہے: اے مالک! تو ہمیں اس مشکل سے نجات عطا فرما میرے گھر والے تیری نعمتوں کے عادی ہو چکے ہیں تو اپنی نعمتوں سے انھیں محروم نہ فرما اور میرے بابا کی بھی خیر ہو، بارگاہِ احدیت میں گڑگڑا کر دعا کی، صبح ہوئی

تو کیا دیکھا کسی نے دقّ الباب کیا، دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ بادشاہِ وقت شکار کرتے ہوئے اپنے وزیروں کے ہمراہ ادھر آپہونچا اُن سب پر پیاس کا غلبہ ہوا تو پانی کی تلاش میں یہاں آئے، گھر والوں نے سوچا عجیب بات ہے کل ہم کھانے کے محتاج تھے آج بادشاہِ وقت ہمارے گھر پانی کے لئے محتاج بن کر آیا ہے، گھر والوں نے اُن سب کے لئے پانی کا انتظام کیا، بادشاہ سیراب ہو کر پوچھنے لگا: یہ کس کا گھر ہے؟ایک وزیر نے کہا: یہ ایک عابد وزاہد کا گھر ہے جو سفرِ حج کے لئے نکلا ہے مگر اس کے گھر والے بہت مجبور ہیں، یہ سن کر بادشاہ نے کہا: یہ بات ہماری مروت کے خلاف ہے کہ وہ ہماری حاجت کو پوری کرے اور میں ان کی حاجت مندی کا ذکر سن کر کچھ کئے بغیر چلا جاؤں، پھر اس نے اپنی کمر سے قیمتی زرّین کمر بند کو کھولا اور تمام وزیروں سے کہا اگر تمھیں مجھ سے تھوڑی بھی محبت ہے تو تم بھی ایسا ہی کرو سب نے اپنے اپنے کمر بندوں کو کھولا اور سب کو یکجا کرکے گھر والوں کے سپرد کیا تو انھوں نے لینے سے انکار کیا، بادشاہ نے کہا: اس وقت ہمارے پاس یہی ہے مگر ہاں میں ایک وزیر کو بھیجوں گا جو ان تمام کمر بندوں کی قیمت لگا کر اس کے برابر تمہیں پیسہ دے کر واپس لے لے گا، پھر ویسا ہی ہوا، ایک وزیر نے آکر تمام کمر بندوں کی قیمت چکا کر اس کے عوض خاطر خواہ مقدار میں پیسہ دیا، گھر کے سب لوگ خوش ہوگئے مگر وہ بچی سجدے میں سر رکھ کر شکر خدا کرتے ہوئے رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی: اے معبود تو توکل کرنے والوں کو کس قدر دوست رکھتا ہے، اُدھر حاتم پریشان تھا مگر اچانک اس قافلہ کا امیر الحاج (میر کارواں) بیمار پڑ گیا اور اپنے ہمراہیوں سے کہنے لگا کیا ہمارے قافلہ میں کوئی عابد وزاہد ہے جس کی دعا سے میں شاید شفا پا جاؤں؟ لوگوں نے کہا: ہاں ایک بہت بڑا عابد وزاہد ہے جس کا نام حاتم

ہے، امیر نے طلب کیا تواس نے امیر کے حق میں دعا کی، کچھ ہی دیر میں وہ شفا پاگیا اور خوش ہو کر حاتم کو مرکب کے علاوہ بہت سارا مال و متاع عطا کرتا ہے وہ عابد و زاہد اللہ کا شکرادا کرتا ہے مگر گھر والوں کی حالت کو یاد کرکے فکر مند ہو جاتا ہے، جب رات ہوئی تو خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ہاتفِ غیبی کی صدا گونجتی ہے: ''اے حاتم گھر والوں کی فکر نہ کرنا ہم نے اُن کا بھی بہتر سے بہتر انتظام کر دیا ہے جو بھی اپنے امور کی وکالت ہمارے ذمہ کر دیتا ہے ہم اس کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں، حاتم خواب سے بیدار ہونے کے بعد حمد و شکرالٰہی بجالاتا ہے، جب حجِ بیت اللہ سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا ہے تو سب سے پہلے اپنی چھوٹی بچی کو گلے لگالیتا ہے۔

مذکورہ واقعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو اپنے امور کو خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے سپرد کر دیتا ہے خدا اس کی کفالت کرتا ہے، خدائے برتر کی بارگاہ میں ہماری یہی دعا ہے: پروردگارا! ہمیں توفیقِ توکل عطا فرما اور ہمارے امور کی اصلاح فرما۔

دوسرا فقرہ: "وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْفائِزِينَ لَدَيْكَ"

عربی میں ''فوز'' کامرانی اور کامیابی کو کہتے ہیں، اگر انسان اپنے مقصود اور مطلوب تک پہنچ جائے تو یہ اس کی کامیابی ہے مگر مذکورہ دعا میں "الفازئين لديك" آیا ہے یعنی اللہ کے نزدیک کون کامیاب ہے اور اس کے پاس کامیابی و کامرانی کا معیار کیا ہے؟ بظاہر ہم مادی چیزوں کے حصول کو کامیابی سمجھتے ہیں مگر حقیقی کامیابی اُخروی سعادت ہے، قرآن کریم میں لفظ ''فوز'' اپنے مشتقات کے ساتھ متعدد مرتبہ آیا ہے۔

سعادت اور کامیابی قرآن کریم کی روشنی میں:

۱۔ ایمان اور عمل صالح

قرآن کی نگاہ میں صاحبان ایمان اور اعمال صالحہ بجالانے والے کامیاب و کامران ہیں، چنانچہ ارشاد رب العزت ہورہا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الأَنْهَارُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ﴾[1]

"بیشک جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجالائے اُن کے لئے وہ جنّتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے"

۲۔ معبود کی خوشنودی

اللہ کی نگاہِ اقدس میں وہ کامیاب ہیں جو اللہ سے راضی ہو اور جن سے اللہ راضی ہو اور اس رضایت کا حصول ایمان اور اعمال صالحہ کے بغیر ممکن نہیں ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾[2]

"خدا ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے، یہی سب سے عظیم کامیابی ہے"

---

[1]۔ سورۂ بروج، آیت ۱۱۔

[2]۔ سورۂ مائدہ، آیت ۱۱۹۔

۳۔ راہ حق میں جہاد

اللہ کی راہ میں اپنے مال و متاع اور جان سے جہاد کرنا سب بڑی کامیابی ہے، شہدائے کربلا علیہم السلام اس صفت کے سب سے واضح مصداق ہیں جنھوں نے اللہ کے لئے اپنے وطن سے ہجرت فرمائی، جان اور مال سے جہاد بھی کیا ہے، مگر اسلامِ ناب میں جہاد اور شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شہید محراب مولی الموحدین حضرت علی علیہ السلام نے مسجد کوفہ میں سر پہ ضربت کھا کر "فزت و رب الکعبة" کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ جس کی ظاہری حیات کی کتاب مہر شہادت کے ساتھ تمام ہو وہ زندگی کامیاب زندگی ہے، چنانچہ ارشاد ربّ العزّت ہو رہا ہے:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللهِ وَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾[1]

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور راہِ خدا میں اپنے مال و جان سے جہاد کیا ان کا اللہ کے نزدیک عظیم مرتبہ ہے اور حقیقت میں وہی لوگ کامیاب (بھی) ہیں"

ان کے علاوہ قرآن کریم میں اور بھی آیات کریمہ ہیں جن میں کامیابی اور سعادت کا ذکر ہے اور احادیث معصومین علیہم السلام میں کامیاب اور سعادت مند افراد کی صفات کا ذکر ہے، اگرچہ کامیابی اور سعادت مفہوم کے اعتبار سے دو الگ الگ لفظیں ہیں مگر خارج میں ان دونوں کا مصداق ایک ہے جو کامیابی ہے وہی سعادت بھی ہے

---

[1] سورۂ توبہ، آیت ۲۰.

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "السَّعِيدُ مَنْ أَخْلَصَ الطَّاعَةَ"[۱] ''سعادتمند وہ ہے جس کی اطاعت، خدا کے لئے خالص ہو''۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "جَالِسِ الْعُلَمَاءَ تَسْعَد"[۲] ''علماء کی ہمنشینی اختیار کرو سعادت نصیب ہوگی''۔

اب یہاں اس وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ یہاں علماء سے مراد باعمل اور مخلص علماء ہی مراد ہیں، آج ہماری دعا یہی ہے کہ پروردگارا! ہمیں کامیاب اور سعادت مند افراد میں قرار دے۔

تیسرا فقرہ: "وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ إِلَيْكَ"

''قرب'' نزدیکی کو کہتے ہیں اور اس دعا میں خدا کی بارگاہ میں التجا ہے کہ خدایا تو مجھے اپنے نزدیک ترین بندوں میں سے قرار دے۔ یہاں قرب سے مراد، قربِ مکانی و زمانی نہیں ہے، کیونکہ ذاتِ خداوند سبحانہ زمان و مکان کی قیود سے مُبرّا و آزاد ہے، لہٰذا قرب سے مراد، قربِ معنوی ہے جس طرح جب ہم نماز کی نیت کرتے ہیں تو ''قربۃً الی اللہ'' کہتے ہیں یعنی اللہ سے معنوی اعتبار سے قریب ہونے کا ارادہ کرتے ہیں، اُسی طرح ہر عبادت میں اس نیت کا ہونا ضروری ہے، بعض لوگ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ صرف کلمۂ ''قربۃً الی اللہ'' عمل کی ابتدا میں زبان پر جاری ہونا کافی ہے، جبکہ نیت کا تعلق دل سے ہے، کیونکہ نیت، قصد و ارادہ کو کہتے ہیں اور اس قصد و ارادہ کا،

۱۔ غرر الحکم، مادۂ سعد.
۲۔ امالی، شیخ مفید، ص۹۰.

عمل کی تکمیل تک ہمراہ ہونا ضروری ہے گویا ابتدائے عمل سے لے کر انتہائے عمل تک دل میں ارادہ ہو کہ میں یہ جو عبادت اور عمل انجام دے رہاہوں یہ صرف اور صرف اللہ سے قریب ہونے کے لئے انجام دے رہاہوں اس کے علاوہ میرا کوئی اور مقصد نہیں ہے یعنی میں اس لئے نماز نہ پڑھوں کہ نمازی کہلاؤں، اس لئے عبادت نہ کروں کہ لوگوں میں میرا اعتبار بڑھے اس لئے عمل صالح انجام نہ دوں کہ لوگوں میں میری شہرت ہو اور میری نیکی کے تذکرے ہوں، یعنی عمل اور عبادت صرف اور صرف خدا کے لئے ہو، جب بندہ ایسا عمل انجام دیتا ہے تو وہ اس عمل کے ذریعہ خدا سے قریب ہوتا ہے۔

واجبات کی انجام دہی اور محرمات سے پرہیز خدا سے قریب ہونے کا ذریعہ

قربت الٰہی سے دراصل رضائے الٰہی کا حصول مراد ہے جیسا کہ ہم اپنی روز مرّہ کی زندگی میں بھی یہ کہتے ہیں، فلاں ان سے بہت زیادہ قریب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں سے وہ بہت زیادہ راضی اور خوش ہیں درحقیقت نزدیکی اور قربت، رضایت اور خوشنودی کے سبب حاصل ہوتی ہے اور اللہ اپنے بندوں سے اس وقت راضی اور خوش ہوتا ہے جب بندے اس کے احکام کو بجالائیں اور جن چیزوں سے منع کیا ہے اُن سے پرہیز کریں، دوسری تاریخ کی دعا میں اس فقرہ "اَللّٰھُمَّ قَرِّبْنِی فِیهِ إِلی مَرْضاتِكَ" کے ذیل میں مفصلاً گفتگو ہو چکی ہے کہ خدا سے قریب ہونے اور اس کی رضایت کو حاصل کرنے کے اسباب کیا ہیں۔

مولائے کائنات حضرت امیر المومنین علیہ السلام دعائے کمیل میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اللَّهُمَّ إِنّي أَتَقَرَّبُ إِلَيْكَ بِذِكْرِك"

"خدایا! میں تیرے ذکر کے ذریعہ تیری بارگاہ میں تقرب چاہتا ہوں"

ائمہ اطہار علیہم السلام کی اکثر زیارتوں میں بھی یہ جملہ ملتا ہے:

"اللَّهُمَّ إِنّي أَتَقَرَّبُ إِلَيْكَ بِحُبِّهِمْ"

"خدایا! میں ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی محبت کے ذریعہ تیری بارگاہ میں تقربت چاہتا ہوں"

اسی طرح دعاؤں میں مناجات میں احادیث میں زیارت ناموں میں متعدد جملے مل جاتے ہیں، تقرب الٰہی کے لئے اہلبیت علیہم السلام سے محبت ضروری ہے، محبتِ اہلبیت علیہم السلام کے بغیر اللہ سے تقرب کا کوئی مفہوم نہیں ہے اسی لئے نماز عیدین کے قنوت میں ہم یہ پڑھتے ہیں:

"اللَّهُمَّ أَدْخِلْنِي فِي كُل خَيْرٍ أَدْخَلْتَ فِيهِ مُحَمَّداً وَ آلَ مُحَمَّدٍ وَ أَخْرِجْنِي مِنْ كُلِّ سُوءٍ أَخْرَجْتَ مِنْهُ مُحَمَّداً وَ آلَ مُحَمَّد"

"اور مجھے داخل کردے ہر اس نیکی میں جس میں محمد وآل محمدؐ کو داخل کیا ہے اور تو مجھے نکال دے ہر اس بُرائی سے جس سے محمد وآل محمدؐ کو نکالا ہے"

بارگاہ الٰہی میں آج ہماری یہی دعا ہے: "خدایا! محمد وآل محمد علیہم السلام کی محبت کے صدقے میں ہمیں اپنی بارگاہ میں تقرب عطا فرما"!

گیارہویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَیَّ فِیهِ الْاِحْسانَ وَکَرِّهْ إِلَیَّ فِیهِ الْفُسُوقَ وَالْعِصْیانَ وَحَرِّمْ عَلَیَّ فِیهِ السَّخَطَ وَالنِّیرانَ، بِعَوْنِكَ یَا غِیاثَ الْمُسْتَغِیثِینَ»

"خدایا! آج کے دن نیکی کو میرے لئے پسندیدہ فرمااور فسق و فجور اور گناہ کو ناپسندیدہ قرار دے اور آج کے دن میں اپنے غضب اور جہنم کی آگ کو مجھ پر حرام کردے اپنی مدد سے، اے فریاد کرنے والوں کے فریادرساں"

اہم مطالب:

اس دعا میں خدا کریم کی بارگاہ میں تین چیزوں کی درخواست ہے:

۱۔ نیکیوں سے محبت کی۔

۲۔ فسق و فجور اور گناہ سے نفرت کی۔

۳۔ اللہ کے غیظ و غضب اور آتش جہنم سے نجات کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ إِلَیَّ فِیهِ الْاِحْسانَ"

عربی میں ''اِحسان'' نیکی اور حُسن عمل کو کہتے ہیں اور جس عمل کو اردو میں احسان کہا جاتا ہے اُسے عربی میں ''امتنان'' کہتے ہیں، لہٰذا قرآن کریم میں ﴿وَبِالْوَالِدَیْنِ إِحْسَاناً﴾[۱] کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اپنے والدین پر اِحسان و مِنّت گذاری کرو؛ کیونکہ اولاد اپنے والدین پر امتنان اور احسان نہیں کر سکتی لہٰذا یہاں احسان سے مراد نیکی، بھلائی اور حُسنِ عمل کے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب انسان فطری طور پر اچھائیوں سے محبت کرتا ہے تو پھر اس دعا کی کیا ضرورت ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں یہ کہے کہ خدایا نیکیوں کو میرے لئے محبوب اور پسندیدہ قرار دے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح انسان بعض اوقات سراب کو سمندر سمجھ کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اسی طرح کبھی کبھی انسان برائیوں کو نیکی سمجھ کر اُسی کی طرف آگے بڑھتا ہے اور غلط فہمی کی مختلف وجہیں ہو سکتی ہیں ہم نے تاریخ میں دیکھا اور دور حاضر میں بھی اس کو ملاحظہ کر رہے ہیں کہ تکفیری گروہ سے تعلق رکھنے والے دہشتگرد ٹولے، خوارج کی طرح شام اور عراق میں کس طرح بربریت پھیلا رہے ہیں اور مقدس زمینوں کو مسلمانوں کے خون سے کس طرح رنگین کر رہے ہیں یہ لوگ جو اس گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں اسے گناہ جان کر انجام نہیں، بلکہ اس کو نیک عمل

---

[۱] سورۂ بقرہ، آیت ۸۳۔

اور کارِ ثواب جان کر انجام دے رہے ہیں دراصل یہ افراد بصیرت کے نہ ہونے کی بناپر حقیقتوں کی صحیح تشخیص نہیں کر پا رہے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ممکن ہے کہ انسان نیکی کو نیکی جان کر بھی اور اُس نیک عمل کے انجام دینے کی فضیلت اور ثواب کو جانتے ہوئے بھی اس کے قریب نہیں جاتا ہے، بقول غالب:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا دل گناہوں اور دنیا کی محبت کی وجہ سے اس قدر سیاہ ہو جاتا ہے کہ اس پر کسی اچھی بات یا اچھے عمل کا اثر نہیں ہوتا ہے اور اس کے دل سے نیکیوں کی محبت ختم ہو جاتی ہے، عبدالملک بن مروان اپنی خلافت سے پہلے ہمیشہ مسجد میں عبادت اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتا تھا اُسے اس عمل کی بناپر تاریخ میں ''حمامة المسجد'' (مسجد کا کبوتر) کے نام سے یاد کیا گیا ہے، مگر جیسے ہی باپ کی موت اور اپنی خلافت کی خبر سنتا ہے تو قرآن کو یہ کہہ کر بند کر دیتا ہے کہ اب تیرا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں اور خلیفہ بن کر تمام ائمہ جمعہ کو یہ حکم دیتا ہے کہ آج کے بعد سے کوئی بھی نماز جمعہ کے خطبوں میں زہد و تقویٰ کی دعوت نہ دے۔ اور اپنے بارے میں کہتا تھا اب میں ایسا ہو گیا ہوں کہ کوئی نیکی کرتا ہوں تو خوشی نہیں ہوتی ہے اور بُرائی انجام دیتے ہوئے بھی کوئی غم نہیں ہوتا ہے۔[1]

[1]۔ رک: سیرہ پیشوایان، مہدی پیشوائی.

لہٰذا آج کی دعا میں بارگاہِ احدیت میں یہی گزارش ہے، خدایا! نیکیوں کو ہمارے لئے پسندیدہ فرما اور برائیوں کو ناپسند قرار دے۔

نیکی اور احسان قرآن کریم کے آئینہ میں:

نیکی اور احسان امر الٰہی ہے:

﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ﴾[1]

''بے شک اللہ عدل اور نیکی کا حکم دیتا ہے''

احسان (نیکی) اور عدل میں فرق:

عدل، ظلم کے مقابل میں ہے، ظلم کی تعریف "وضع الشئ علی غیر محله" ہے یعنی ''کسی بھی چیز کو اس کے نامناسب جگہ پر قرار دینا''۔ اور عدل اس کے برعکس ہے یعنی ہر چیز کا اس کے مناسب جگہ پر قرار دینا یعنی ہر چیز کو اس کا اپنا حق دینا ہی عدل ہے مگر احسان و نیکی عدل سے برتر ہے، احسان اور نیکی کا مطلب صرف دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنا ہی نہیں، بلکہ اپنے وجود کو دوسروں کے حق میں سراپا خیر و برکت قرار دینا ہے یعنی اُن کی خطاؤں سے بھی درگذر کرنا اور عفو و بخشش سے کام لینا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں قارون کے لئے حکم ہوا ہے ﴿وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللهُ إِلَيْكَ﴾[2] اسی طرح ''نیکی کر جس طرح خدا نے تمہارے ساتھ نیک برتاؤ کیا ہے''۔

---

[1] سورۂ نحل، آیت ۹۰.
[2] سورۂ قصص، آیت ۷۷.

قارون، موسیٰ کی قوم سے تھا ابتدا میں وہ راہِ راست پر تھا پھر خدا نے اسے بے پناہ دولت عطا کرکے اُس سے اُس کے نفس کا امتحان لیا تو وہ امتحان الٰہی میں ناکام ہو گیا اور آخرت کی فکر و خیال سے یکسر غافل ہو گیا، اس کو حضرت موسیٰ اور ان کی قوم نے بھی سمجھایا کہ وہ غرور و تکبر سے کام نہ لے، بلکہ جس طرح خدا نے تیرے ساتھ نیک برتاؤ کیا تو بھی اس کے بندوں کے ساتھ نیک برتاؤ کر پھر بھی وہ راہِ راست پر نہ آیا۔

اس آیۂ کریمہ سے یہ واضح ہے کہ خدا اپنے بندوں سے چاہتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے نیک برتاؤ کریں اور نیکی کے ساتھ پیش آئیں تاکہ خدا بھی اس نیکی کے عوض اُس سے نیکی کرے چنانچہ ارشاد ربّ العزّت ہے:

﴿هَلْ جَزَاءُ الْأَحْسَانِ إِلاَّ الْأَحْسَانُ﴾[1]

”کیا نیکی کی جزا نیکی کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے“

نیکی کی جزا سے متعلق ایک واقعہ

حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل کے زمانے میں ایک مرتبہ بہت سخت قحط پڑا جس سے لوگ بہت پریشان تھے اور دانے دانے کو ترستے رہے، ایک عورت جو مومنہ اور خدا ترس تھی اس کا ایک چھوٹا بچہ تھا دوپہر کے وقت سخت بھوک کے عالم میں اس کے گھر میں صرف روٹی کا ایک ٹکڑا تھا جسے کھانے کے لئے منھ تک اٹھایا ہی تھا کہ دروازے پر اک فقیر نے آواز دی اے کنیز خدا! بھوک

۱۔ سورۂ رحمٰن، آیت ۶۰.

مارے ڈال رہی ہے اگر تیرے پاس کچھ ہے تو دیدے، یہ صدا سن کر اُس نے اپنا ہاتھ روک لیا اس روٹی کے ٹکڑے کو اٹھا کر اس بھوکے فقیر کو دے دیا اور بچہ کو گود میں لے کر لکڑیاں جمع کرنے کے لئے جنگل کی طرف نکل پڑی، بچہ کو ایک جگہ بٹھا کر لکڑیاں چُننے میں مشغول ہو گئی، ناگہاں ایک بھیڑیا اُس کے بچہ کو اٹھالے جاتا ہے، وہ عورت اس بھیڑیے کے پیچھے روتے ہوئے دوڑتی ہے، پھر اسی اثنا میں جبرئیل امین بحکم خدا نازل ہوتے ہیں اور بھیڑیے سے اس بچہ کو چھوڑا کر اس کے ماں کے سپرد کردیتے ہیں اور اس عورت سے کہتے ہیں کیا تو اب راضی و خوش ہے اُس روٹی کے ٹکڑے کے عوض اس عمل سے؟﴿هَلْ جَزَاءُ الْأحْسَانِ إِلاَّ الأحْسَانُ﴾[1] یہ ہے۔

بہر حال اگر انسان دوسروں کے ساتھ نیکی کے ساتھ پیش آئے گا تو خدا بھی اس کے ساتھ نیک برتاؤ کرے گا، لہٰذا ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا چاہئے، خصوصی طور پر والدین، رشتہ دار، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیکی کے ساتھ پیش آنا چاہئے چنانچہ ارشاد رب العزّت ہو رہا ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لاَ تَعْبُدُونَ إِلاَّ اللهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَذِي الْقُرْبَي وَالْيَتَامَي وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْناً وَأَقِيمُوا الصَّلاَةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلاَّ قَلِيلا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ﴾[2]

---

[1] شہر رمضان، ج۱، ص۲۱۱، بحوالہ گنجینۂ لوئلوء و مرجان.
[2] سورۂ بقرہ، آیت ۸۳.

"اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خبر دار خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ، قرابتداروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا"

خداوند عالم نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں متعدد مرتبہ آیا ہے: ﴿إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾[۱]

نیکی اور احسان کے مصادیق

جو کچھ قرآن اور احادیثِ معصومین علیہم السلام میں نیکی اور احسان سے متعلق وارد ہوا ہے اس سے یہ بات واضح ہے کہ نیکی اور احسان صرف چند مادی اور مالی امور سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، مثلاً خدا، رسول، قیامت پر ایمان رکھنا نیکی ہے، محمد وآل محمد علیہم السلام سے محبت و مودّت نیکی اور احسان ہے اور اسی طرح مشکلات کا تحمل کرنا، فساد و فحشا سے بچنا، واجبات اور مستحبات پر عمل کرنا اور محرمات سے پرہیز کرنا یہ تمام امور نیکی اور احسان کے دائرے میں آتے ہیں، حتّیٰ نیکی اور احسان کا دائرہ صرف انسانوں سے ہی مخصوص نہیں ہے (خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر)، بلکہ جانوروں سے بھی اچھا سلوک، نیکی اور احسان کے دائرے میں آتا ہے۔

۱۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۵؛ آل عمران ۱۳۴ و ۱۴۸، مائدہ ۱۳ و ۹۳

نیکی اور احسان کے اچھے آثار و نتائج

۱۔ لطف الٰہی

جو بھی نیکی اور احسان کرتا ہے اس کی زندگی میں اللہ کا خاص لطف و کرم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ربّ العزت ہو رہا ہے:

﴿وَإِنَّ اللهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾[۱]

"بے شک اللہ ہمیشہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے"

۲۔ محبت الٰہی

جو بھی نیکی اور احسان کرتا ہے خدا اس سے محبت کرتا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾[۲]

"بیشک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"

۳۔ دنیا و آخرت کی بھلائی

ارشاد رب العزت ہے:

﴿وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْراً لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الأخِرَةِ خَيْرٌ﴾[۳]

۱۔ سورۂ عنکبوت، آیت ۶۹.

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۵؛ آل عمران ۱۳۴ و ۱۴۸، مائدہ ۱۳ و ۹۳

۳۔ سورۂ نحل، آیت ۳۰.

''اور جب صاحبان تقویٰ سے کہا گیا کہ تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے؟ توانہوں نے کہاسب خیر ہے بیشک جن لوگوں نے اس دنیا میں نیکیاں کی ہیں ان کے لئے دنیا میں بھی نیکی ہے اور آخرت کا گھر بہرحال بہتر ہے''

۴۔ سکون و اطمینان

خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرّاً وَعَلاَنِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ﴾[1]

''جو لوگ اپنے اموال کو راہِ خدا میں رات میں، دن میں، خاموشی سے اور علنی طور پر خرچ کرتے ہیں اُن کے لئے پروردگار کے نزدیک اجر بھی ہے انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ حزن''

یہ آیۂ کریمہ ابن عباس کی روایت کے مطابق مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے، آپ کے پاس چار درہم تھے اور آپ نے اس کو ایک ایک کرکے مختلف اوقات میں راہِ خدا میں خرچ کردیا تب اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

۵۔ رفعت و بلندی

حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

"مَعَ الْإِحْسَانِ تَكُونُ الرِّفْعَة"[2]

''بلندی ورفعت نیکی اور احسان کے ساتھ ہے''

۱۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۴.

۲۔ غرر الحکم، مادۂ ''حسن''

۶۔ حُسنِ عاقبت

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

"مَنْ أَحْسَنَ إِلَى النَّاسِ حَسُنَتْ عَوَاقِبُه"[۱]

"جو بھی لوگوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرے گا وہ عاقبت بخیر ہوگا"

ان کے علاوہ نیکی اور احسان کے اور بھی نتائج و آثار ہیں جن کا ذکر احادیث کی مختلف کتابوں میں موجود ہے۔

دوسرا فقرہ: "وَكَرَّهَ إِلَيَّ فِيهِ الْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ"

"فسق" یعنی حق کے دائرہ سے خارج ہو جانا۔ لغت کی کتابوں میں فسق کے معنیٰ: "خروج الشئ عن الشئ علی وجه الفساد"[۲] "ایک چیز کا ایک چیز سے باہر ہو جانا اس چیز کے فاسد ہونے کی بنا پر" ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں بھی فسق کے معنیٰ اسی سے لئے گئے ہے یعنی بندہ کا شریعت کے حدود سے خارج ہو جانے کو فسق کہتے ہیں چاہے وہ خروج، گناہِ صغیرہ کے ذریعہ ہو یا گناہ کبیرہ کے ذریعہ ہو یا کفر و نفاق کے ذریعہ۔

بطور خلاصہ ہر وہ گناہ جو انسان کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے دل کی تاریکی کا سبب بنتا ہے وہ فسق و عصیان ہے۔

۱۔ غرر الحکم، مادۂ "حسن"

۲۔ المصباح المنیر و اقرب الموارد، مادۂ "فسق".

فسق کے مصادیق قرآن کریم کی روشنی:

راہِ حق سے بھٹک جانا فسق ہے جس کے چند مصادیق قرآن کی روشنی میں درجۂ ذیل ہیں:

۱۔ ابلیس

﴿كَانَ مِنْ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ﴾[۱]

"(ابلیس) جِنّات میں سے تھا پس اس نے اپنے پرودگار کے حکم سے سرتابی کی"

اللہ نے ملائکہ سے کہا آدم کا سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس کا یہ عمل یعنی سجدہ سے انکار گویا خدا کے حکم سے انکار ہے اور یہ فسق ہے۔

۲۔ غیر شرعی ذبیحہ کھانا

﴿وَلاَ تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرْ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ﴾[۲]

"اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اُسے نہ کھاؤ؛ کیونکہ یہ فسق ہے"

ذبح کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ ذبح کے وقت، ذبح کرنے والا اللہ کا نام لے اگر کسی نے اللہ کا نام لئے بغیر ذبح کر دیا تو اُس ذبیحہ کا کھانا حرام ہے اور یہ فسق ہے۔

۱۔ سورۂ کہف، آیت ۵۰.

۲۔ سورۂ انعام، آیت ۱۲۱.

۳۔ حج میں اس کے مقررات اور دستور العمل سے سر پیچی کرنا

﴿فَلاَ رَفَثَ وَلاَ فُسُوقَ وَلاَ جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾[۱]

"حج میں جماع اور اطاعتِ خدا سے خروج اور جھگڑا منع ہے"

تفسیری روایات میں ہے کہ مذکورہ آیت میں "رفث" یعنی جماع، فسق یعنی جھوٹ کے ہیں۔

۴۔ مومن کے نام کو برائی کے ساتھ یاد کرنا

﴿بِئْسَ الاِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الأِيمَانِ﴾[۲]

"ایمان لانے کے بعد مومن کو بدی سے یاد کرنا فسق ہے"

مذکورہ آیت میں اہل ایمان سے خطاب ہے کہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے نہ پکارو اور ایمان لانے کے بعد ایک دوسرے کو بُری نسبتوں سے یاد نہ کرو کیونکہ یہ فسق ہے، تفسیرِ المیزان میں مذکور ہے کہ مذکورہ آیت میں "اسم" سے مراد ذکر یعنی یاد کرنا ہے۔

۵۔ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلاَ تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَداً وَأُوْلَئِكَ هُمْ الْفَاسِقُونَ﴾[۳]

۱۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۷.

۲۔ سورۂ حجرات، آیت ۱۱.

۳۔ سورۂ نور، آیت ۴.

”اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں اور اپنے دعویٰ پر چار گواہ بھی نہیں لاتے انھیں اسّی کوڑے لگاؤ اور پھر کبھی اُن کی گواہی قبول نہ کرنا اور یہ لوگ فاسق ہیں“

ان کے علاوہ قران کریم میں فسق کے اور بھی مصادیق ہیں، احادیث معصومین علیہم السلام میں بھی کئی ایک فسق کے مصادیق موجود ہیں، کلی طور پر فسق ہر اُس عمل کو کہتے ہیں جس سے انسان شریعت کی حدوں سے خارج ہو جاتا ہے۔

فسق اور عصیان میں فرق

اگرچہ مصداق کے اعتبار سے فسق اور عصیان میں زیادہ فرق نہیں ہے؛ کیونکہ جو کام معصیت ہے وہی فسق بھی ہے، لیکن مفہوم اور معنیٰ کے اعتبار سے اِن دونوں کے درمیان تھوڑا سا فرق ہے، جب بھی بندہ اپنے خدا کے حکم کے خلاف کوئی عمل انجام دے اس عمل کو عصیان یا معصیت اور اس کے کرنے والے کو عاصی کہتے ہیں اور اگر بندہ اس عملِ معصیت کو بار بار انجام دے تو اسے فاسق کہتے ہیں، مختصر یہ ہے کہ عاصی، گنہگار کو کہتے ہیں اور فاسق، گناہ کو بار بار انجام دینے والے کو کہتے ہیں۔[1]

خالقِ برتر سے ہماری دعا یہی ہے کہ خدایا! آج کے دن ہمیں معصیت اور فسق سے دور رکھ اور ہمارے لئے اسے ناپسند قرار دے جیسا کہ خداوند کریم نے صاحبانِ ایمان سے خطاب کرکے فرمایا:

---

[1] رک: تفسیر المیزان، ج۱۸، ص۴۶۷.

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنْ الأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَكِنَّ اللهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمْ الإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمْ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُوْلَئِكَ هُمْ الرَّاشِدُونَ﴾[1]

"اور یاد رکھو کہ تمہارے درمیان خدا کا رسول موجود ہے یہ اگر بہت سی چیزوں میں تمہاری بات مان لیتا تو تم خود مشکل میں پڑ جاتے، لیکن خدا نے تمہارے فسق اور نافرمانی کو تمہارے لئے ناپسندیدہ قرار دیا اور حقیقت میں یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں"

تیسرا فقرہ: "وَحَرِّمْ عَلَيَّ فِيهِ السَّخَطَ وَالنِّيرانَ"

عربی میں "سخط" اُس شدید غضب کو کہتے ہیں جو عذاب و عقوبت کا سبب بنے۔[2] اور یہ رضائے الٰہی کی ضد ہے، جس کا نتیجہ "حبط اعمال" یعنی اعمال کا برباد ہو جانا ہے چنانچہ ارشاد رب العزت ہے:

﴿ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ﴾[3]

۱۔ سورۂ حجرات، آیت ۷.

۲۔ مفردات راغب، مادۂ سخط.

۳۔ سورۂ محمد، آیت ۲۸.

”یہ اس لئے کہ انھوں نے اُن باتوں کا اتباع کیا ہے جو خدا کو ناراض کرنے والی ہیں اور اس کی مرضی کو ناپسند کیا ہے تو خدا نے اُن کے اعمال کو برباد کرکے رکھ دیا“

سخطِ الٰہی سے مربوط گفتگو دوسری تاریخ کی دعا میں "وَجَنِّبْنِی فِیهِ مِنْ سَخَطِكَ وَنَقِماتِكَ"کے ذیل میں تفصیل سے ہو چکی ہے۔

”نیران“ سے مراد دوزخ کی آگ ہے جس میں خدا کے نافرمان بندے کو قیامت کے دن ڈالا جائے گا، کوئی بھی عذاب آتشِ دوزخ سے زیادہ سخت نہیں ہے ہم اس دردناک عذاب کا تصور بھی نہیں کرسکتے، جب ہم دنیا کی معمولی سختیوں کے مقابل کمزور و ناتواں ہیں تو آخرت کے طولانی، دردناک اور دائمی عذاب کو کیسے برداشت کرسکتے ہیں، چنانچہ مولائے کائنات علیہ السلام دعائے کمیل میں ارشاد فرماتے ہیں:

"یَا رَبِّ وَ أَنْتَ تَعْلَمُ ضَعْفِي عَنْ قَلِيلٍ مِنْ بَلَاءِ الدُّنْيَا وَ عُقُوبَاتِهَا وَ مَا يَجْرِي فِيهَا مِنَ الْمَكَارِهِ عَلَى أَهْلِهَا عَلَى أَنَّ ذَلِكَ بَلَاءٌ وَ مَكْرُوهٌ قَلِيلٌ مَكْثُهُ يَسِيرٌ بَقَاؤُهُ قَصِيرٌ مُدَّتُهُ فَكَيْفَ احْتِمَالِي لِبَلَاءِ الْآخِرَةِ "

”اے پروردگار تو جانتا ہے میری کمزوری کو دنیا کی قلیل تکلیفوں کے مقابل میں۔ . . تو بھلا میں آخرت کی بلا اور وہاں کے عذاب کو کیسے برداشت کرسکتا ؟، خدایا! ہمارا یہ ناتواں بدن کہاں اور وہ دردناک عذاب کہاں ہمیں اپنے غضب اور آتش جہنم سے بچالے اپنی مدد سے اے فریادیوں کے فریادرساں“

بارہویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰھُمَّ زَیِّنّی فِیهِ بالسِّتْرِ وَالْعَفافِ، وَاسْتُرْنی فِیهِ بِلِباسِ الْقُنُوعِ وَالْکَفافِ وَاحْمِلْنی فِیهِ عَلَی الْعَدْلِ وَالْاِنْصافِ وَآمِنِّی فِیهِ مِنْ کُلِّ مَا أَخافُ بِعِصْمَتِكَ یَا عِصْمَةَ الْخائِفِینَ».

"خدا مجھ کو اس دن میں پردہ پوشی اور پاکدامنی سے آراستہ کر اور آج کے دن مجھ کو قناعت اور خود داری کا لباس عطا کر اور مجھے عدل و انصاف پر آمادہ کرد، مجھے امان عطا کر ہر اس چیز سے جس سے خوف کھاتا ہوں اپنی (طرزِ) حفاظت کے ذریعہ، اے ڈرنے والوں کے پناہ گاہ"

اہم مطالب:

اس دعا میں ہم ناچیز بندے، بارگاہ خداوندی میں چار بنیادی چیزوں کے درخواست کررہے ہیں:

۱۔ ستر و عفاف ۲۔ قناعت و کفاف ۳۔ عدل و انصاف ۴۔ ہر خوف زدہ شیٔ سے امن و امان

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ زَیِّنِّی فِیہِ بِالسِّتْرِ وَالْعَفافِ"

''ستر'' لغت میں ڈھکنے، چھپانے، پوشش اور پردہ کے ہیں چاہے وہ پردہ داری، ظاہری ہو یا باطنی ومعنوی، ظاہری پردہ داری سے مراد ظاہری عیوب کو چھپانا اور باطنی ومعنوی پردہ داری سے مراد کسی نفسانی و باطنی برائیوں پر پردہ ڈالے رکھنا ہے۔

خداوند کریم کی صفاتِ حمیدہ میں سے ایک صفت ''ستار'' ہونا ہے، یعنی وہ ''ستّار العیوب'' ہے وہ لوگوں کے عیوب کو ایک دوسرے سے چھپاتا ہے یقین مانیئے اگر ہمارے عیوب اور ہماری غلط باتیں اور غلط حرکتیں ایک دوسرے کے سامنے ظاہر ہوجاتیں تو ہم آج ایک دوسرے کو منہ دِکھانے کے قابل نہ رہتے، یہ اس کا ہم پر عظیم احسان و کرم ہے کہ وہ ہمارے عیوب پر پردہ ڈال رکھا ہے تاکہ دوسروں کو پتہ نہ چلے اور وہ اپنے بندوں سے بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ ایک دوسروں کی برائیوں اور عیبوں کا پردہ فاش نہ کریں اور دوسروں کی شخصیت اور آبرو کو محترم جانیں اور دوسروں کے پوشیدہ عیوب کو اس کے پسِ پشت بیان نہ کریں چانچہ ارشاد ربّ العزت ہورہاہے:

﴿وَلاَ تَجَسَّسُوا وَلاَ یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضاً﴾[۱]

''اور خبردار ایک دوسرے کے عیب تلاش نہ کرو اور ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کرو''

---

[۱]. سورۂ حجرات، آیت.

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہیں:

"مَن اغْتَابَ مُسْلِماً أَوْ مُسْلِمَةً لَمْ يَقْبَل اللَّهُ تَعَالَى صَلَاتَهُ وَ لَا صِيَامَهُ أَرْبَعِينَ يَوْماً إِلَّا أَنْ يَغْفِرَ لَهُ صَاحِبُهُ"[۱]

"جو بھی، مسلمان مرد یا عورت کی غیبت کرے گا خداوند کریم اس شخص کی چالیس شب و روز تک نماز و روزہ کو قبول نہیں کرتا، مگر یہ کہ جس کی غیبت کی ہے وہ اُسے معاف کردے"

اس حدیث سے واضح ہے کہ خداوند کریم نے حقوق الناس کی کس حد تک رعایت کی ہے اور وہ اپنے بندوں کو اس حد تک چاہتا ہے کہ اُن کے عیوب ایک دوسرے کے سامنے آشکار نہ ہونے پائیں اور اس طرح وہ ایک دوسرے کے سامنے آشکار نہ ہوں اور اس طرح وہ ایک دوسرے کے سامنے ذلیل و خوار نہ ہوں، اللہ کو یہ بات ہرگز گوارا نہیں ہے کہ کسی کے سامنے اس کے بندۂ مومن کی برائی اور عیب بیان کی جائے اگر کوئی ایسا کرے گا تو اس کی عبادت، نماز و روزہ کو بھی قبول نہیں کرے گا، ذرا غور کریں ربّ کریم ہم پر کس حد مہربان ہے مگر ہم ہیں کہ اس کے باوجود بھی اس کی نافرمانی کرتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"إِنَ لِلنَّاسِ عُيُوباً فَلَا تَكْشِفْ مَا غَابَ عَنْكَ"[۲]

"یقیناً لوگوں کے عیوب ہوتے ہیں مگر جو تم سے پوشیدہ ہیں اسے آشکار مت کرو"

۱۔ مستدرک الوسائل، ج۱، ص۱۱۶۔

۲۔ غرر الحکم، حدیث نمبر ۳۰۵۰۵۔

ایک اور مقام پر امیر بیان حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"أَيُّهَا النَّاسُ طُوبَى لِمَنْ شَغَلَهُ عَيْبُهُ عَنْ عُيُوبِ النَّاس"[۱]

"اے لوگو! تم میں قابل مبارک وہ شخص ہے جس کی نگاہ بجائے دوسروں کے عیوب کے، اپنے عیوب پر ہے"۔

اس حدیث میں دو اہم نکتوں کی طرف اشارہ ہے:

۱. دوسروں کے عیب سے چشم پوشی:۔ آیات و روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ انسان دوسروں کی برائیوں کی طرف نظر نہ کرے حتیٰ اُن چیزوں کو بھی نہ دیکھے اور نہ آشکار کرے جن کے بارے میں وہ چاہتے ہیں کہ دوسروں سے پوشیدہ رہے۔

۲. اپنی برائیوں پر نظر:۔ انسان کو چاہئے کہ وہ دوسروں کی عیب گوئی کے بجائے اپنے گریباں میں جھانکے اور اپنی برائیوں پر نظر کرے، پھر اللہ کی بارگاہ میں رو رو کر استغفار کرکے اور ان برائیوں کو آئندہ نہ کرنے کی قسم کھائے۔

"عفت" ایک عرفانی لفظ ہے جس کا تعلق نفسانی کیفیت سے ہے۔ عفت کی تعریف اہل لغت نے یوں کی:

"العِفّة: الكَفُ عما لا يَحِلّ و يَجْمُل. الاسْتِعْفاف: طلَبُ العَفَافِ و هو الكَفُ عن الحرام و السؤال من الناس"[۱]

۱۔ مستدرک الوسائل، ج۱، ص۱۱۶.

"عفت یعنی غیر حلال اور غیر مناسب چیزوں سے خود کو روکنا ہے اور استعفاف سے مراد طلبِ عفاف یعنی حرام چیزوں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے پرہیز کرنا ہے"[1]

عفت کی قسمیں

۱. **عفتِ فکری:** فکر، عقلی عمل کا نام ہے، اللہ کی طرف سے انسان کو دیا گیا سب سے اہم تحفہ عقل ہے جس کی بناء پر انسان نے اشرف المخلوقات ہونے کا خطاب پایا، انسان کے رفتار اور اعمال کا سرچشمہ یہی عقل ہے لہٰذا بندۂ مومن پر اپنی فکر میں عفت کو پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ فکری گناہ سے اپنے دل و دماغ کو پاک رکھے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "جب بھی بندۂ مومن کسی گناہ کی فکر کرتا ہے تو کبھی وہی فکر اس کے رزق سے محروم ہونے کا سبب بنتی ہے"۔[2]

۲. **عفتِ نگاہ:** پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "نامحرم کی طرف نگاہ کرنا شیطان کے مسموم تیروں میں سے ایک تیر ہے"۔ لہٰذا اپنی نگاہ پر کنٹرول رکھے، کیونکہ یہ گناہ کا مقدمہ بنتی ہے۔

۱۔ لسان العرب، ج۹، ص ۲۵۳.
۲۔ مستدرک الوسائل، ج ۱۴، ص ۲۸۶.

۳. **عفتِ گفتار:** جیسا کہ خالق کائنات نے پیغمبر اکرم ﷺ کی ازواج کو حکم دیا: ﴿فَلاَ تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ﴾[1] ''لوگوں سے ناز و نخرے سے بات نہ کرو''۔ جس کی وجہ سے صنفِ مخالف تمہاری طرف کھینچ آتی ہے اور یہ چیز گناہ کے لئے مقدمہ بن سکتی ہے، اس کے علاوہ زبان کو بُری باتوں کے اظہار سے پاک رکھو، اِن تمام باتوں کا اطلاق عصرِ حاضر میں سوشل میڈیا یا فیس بُک وغیرہ پر نامحرموں سے گفتگو کرنے یا لکھنے پر بھی ہوتا ہے۔

۴. **عفتِ رفتار:** آج مختلف میٹنگوں یا پارٹیوں میں عورتوں اور مردوں کا میل جول ایک عام بات ہے، ایسے موقعوں پر دونوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی رفتار و روابط کو شرعی حدود سے تجاوز نہ ہونے دیں، روایتوں میں مرد و زن کے تنہائی میں ملنے سے منع کیا گیا ہے۔

۵. **عفتِ لباس:** آج ہمارے معاشرے میں اسلامی اقدار کے فقدان کی بنا پر، انسان جانور سے بھی زیادہ بدتر ہو چکے ہیں کم سے کم لباس زیب تن کرنے کو فیشن کے طور پر دیکھا جارہا ہے خصوصاً عورت جس کے لئے مکمل پردے اور عفاف کا حکم ہے، جسے بال بھی نامحرموں کو دکھانے کی اجازت نہیں، جسے عفت و حیا کا پتلا ہونا چاہئے وہ بالوں کو کھول کر، کم سے کم کپڑے پہن کر پیکرِ شر بنی ہوئی ہے، ہمارا اسلام ہو اُن مقدس خواتین پر جو ایسے دور میں

---

[1] سورۂ احزاب، آیت ۳۲

بھی حجاب و عفاف کی رعایت کرتی ہیں، حجاب و عفاف عورت کے لئے ویسے ہی ہے جیسے گہر کے لئے صدف۔[1]

عفت کے ان اقسام کی رعایت صرف عورتوں سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ مرد اور عورت دونوں کے لئے ہیں۔

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا عفت کا نمونہ

مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی نابینا صحابی کے ہمراہ درِ فاطمہ سلام اللہ علیہا پر آتے ہیں دق الباب کیا، شہزادی نے دیکھا کہ پیغمبرؐ کے ہمراہ کوئی اور بھی ہے، لہٰذا مکمل حجاب کے بعد پیغمبر کو گھر میں داخل ہونے کی دعوت دیتی ہیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بیٹی یہ تو نابینا ہے جو تمھیں دیکھنے سے قاصر ہے یہ سن کر شہزادی نے فرمایا: مگر میں تو دیکھ سکتی ہوں، یہ سن کر رسول نے فرمایا: میں گواہی دیتاہوں کہ تو میرا پارۂ جگر ہے۔[2]

عفت آیات وروایات کی روشنی میں

عفت کے معنیٰ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ عفت سے مراد حرام اور نامناسب امور سے اجتناب کرنا ہے، مگر احادیث میں عام طور پر عفت کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے: ۱۔ عفتِ شکم ۲۔ عفتِ شرمگاہ

---

[1] ۔کتاب، حجاب وعفاف در سیما، فریدہ پیشوائی و مریم رضائی، ص۱۹.

[2] ۔دنیائے دختران، کریمی نیا، ج۱، ص۳۹.

خواجہ نصیر الدین طوسی لکھتے ہیں: عفت یعنی شہوت، نفسِ ناطقہ کا مطیع ہو، نفسِ ناطقہ سے مراد عقل ہے یعنی شہوت کسی بھی قسم کی ہو اگر وہ عقل کے کنٹرول میں ہو تو معتدل رہتی ہے اور یہی اعتدال عفت ہے۔ عیسائیت میں رہبانیت ہے اور اسلام میں عفت ہے، رہبانیت، شہوت کا گھلا گھونٹتی ہوتا اور عفت شہوت کو حدِ اعتدال میں رکھتی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

"مَا عُبِدَ اللَّهُ بِشَيْءٍ أَفْضَلَ مِنْ عِفَّةِ بَطْنٍ وَ فَرْجٍ"

''شکم اور شرمگاہ کی عفت سے بڑھ کر اللہ کی کوئی عبادت نہیں ہو سکتی''

پاکدامنی اور غیر کے سامنے پیٹ بھرنے کے لئے ہاتھ نہ پھیلانا انبیاء اور اولیائے الٰہی کی سیرت رہی ہے۔

صاحبانِ عفت کے اوصاف قرآن کریم کی روشنی میں:

یہاں پر مناسب ہے کہ قرآن کریم کی روشنی میں صاحبانِ عفّت کے اوصاف کو ذکر کیا جائے:

۱۔ فقیر عفیف

﴿لِلفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ الله لاَ يَسْتَطِيعُونَ ضَرْباً فِي الأَرْضِ يَحْسَبُهُمْ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنْ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لاَ يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافاً وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾[1]

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۳.

"یہ صدقات، ان فقراء کے لئے ہیں جو راہِ خدا میں محصور ہیں اور کچھ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، ناواقف لوگ اُن کو حیا و عفت کی بناپر مالدار سمجھتے ہیں، تم ان کے چہروں سے اندازہ کر سکتے ہو اگرچہ یہ لوگوں سے چمٹ کر کچھ مانگنے والے نہیں ہیں اور تم لوگ جو بھی انفاق کروگے خدا اُسے خوب جانتا ہے"

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اسی شخص کی مدد ہوتی ہے جو زبان کھول کر سوال کرتا اور ہاتھ پھیلا کر مانگتا ہے مگر اُن افراد کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوتی ہے جو بہت غریب و نادار تو ہوتے مگر اپنی آبرو اور عزت کی بناپر کسی کے آگے دستِ سوال پھیلا نہیں سکتے ایسے ناداروں فقراء کی جانب خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے؛ کیونکہ مانگنے والا تو کسی سے بھی مانگ لے گا اور یاد رکھو صاحبانِ عزت و عفّت کی مدد بھی ان ہی کے مزاج کے مطابق کی جانی چاہیئے تاکہ اُن کی آبروریزی نہ ہو۔

۲۔ مالدار عفیف

﴿وَابْتَلُوا الْيَتَامَي حَتَّي إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْداً فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلاَ تَأْكُلُوهَا إِسْرَافاً وَبِدَاراً أَنْ يَكْبَرُوا وَمَنْ كَانَ غَنِيّاً فَلْيَسْتَعْفِفْ﴾[۱]

"اور یتیموں کا امتحان لو اور جب وہ نکاح کے قابل ہو جائیں اور ان میں رشید ہونے کا احساس کر لو تو اُن کے اموال کو اُن کے حوالے کر دو اور زیادتی کرتے

[۱] سورۂ نساء، آیت ۶.

ہوئے اس خوف سے کہ کہیں وہ جلدی بڑے نہ ہو جائیں جلدی جلدی نہ کھا جاؤاور تم میں جو غنی ہے وہ اُن کے مال سے پرہیز کرے“

اس آیۂ کریمہ میں مالدار سرپرستوں کے لئے حکم ہے کہ وہ یتیموں کا مال کھانے سے پرہیز کریں یہی ان کی عفّت ہے۔

امام حسن علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"فَإنَّ ابْتِغَاءَ الْفَضْلِ مِنَ السُّنَّةِ وَ الْإجْمَالَ فِي الطَّلَبِ مِنَ الْعِفَّةِ وَ لَيْسَتِ الْعِفَّةُ بِدَافِعَةٍ رِزْقاً"[1]

”کثرت سے طلبِ رزق کرنا سنت ہے اور طلب رزق میں اعتدال عفّت ہے، عفّت، رزق کو دور نہیں کرتی“

عفّت و پاکدامنی انسانی زیور ہے جس سے انسان کی عظمت دوبالا ہو جاتی ہے احادیث میں بھی وارد ہے کہ شادی کے لئے عفّت دار عورت کی تلاش کرو اور انسان قیامت کے دن شکم اور شرمگاہ کی عفت کے فقدان کی بناپر ہی نذرِ آتشِ جہنم ہوگا، بارگاہِ الٰہی میں میری دعا ہے خدایا! ہمیں آج ستر اور عفت کے زیور سے مزیّن فرما اور آتشِ جہنم سے محفوظ رکھ۔

---

[1] الحیاۃ، اخوان حکیمی، ج۵، ص۴۳۵.

دوسرا فقرہ: "وَاسْتُرْنِی فِیهِ بِلِباسِ الْقُنُوعِ وَالْکَفافِ"

دعاکے اس جملہ میں بندہ، خالقِ کائنات سے درخواست گذار ہے کہ خدایا مجھ کو آج کے دن قناعت اور خودداری کا لباس عطا فرما۔ ستر اور لباس دو طرح کے ہوتے ہیں: ا۔ظاہری ۲۔ باطنی، انسان ظاہری ستر ولباس سے اپنے ظاہر کو چھپاتا ہے اور باطنی ستر و لباس سے باطنی عیوب کو چھپاسکتا ہے، قناعت اور کفاف کے معنٰی بھی تقریباً ایک ہے اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

قناعت

قناعت، مادۂ "قنع" سے "قَنَعَ یَقنَعُ از باب مَنَعَ یَمنَعُ" سے ہو تو سوال کرنے کے معنٰی میں ہے اسی لئے دوسری رکعت میں ہاتھوں کو بلند کرکے جو دعا کی جاتی ہے اس حالت کو "قنوت" کہتے ہیں اور اگر از باب عَلِمَ یَعلَمُ قَنِعَ یَقنَعُ سے ہو تو رضایت اور خوشنودی کے معنٰی میں ہے۔[1] دراصل اپنی قسمت پر راضی ہونے کو قناعت کہتے ہیں۔

کفاف

کسی بھی چیز کے بقدر حاجت و ضرورت ہونے کو "کفاف" کہتے ہیں، ضرورت نہ زیادہ ہو اور نہ کم۔[2، 3]

---

[1]۔ مفردات راغب، مادۂ "قنع"

[2]۔ قاموس القرآن، سید علی اکبر.

[3]۔ حاصلِ قناعت و کفاف زہد ہے اور زہد کی ضد، دنیا کی طرف حرص و رغبت ہے (لسان العرب، ج ۳، ص ۱۹۶) لہٰذا جو انسان قناعت صفت ہوتا ہے وہ حریص نہیں ہوتا۔

قناعت و کفاف اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں کی صفات میں سے ایک صفت ہے، آیات وروایات میں ان صفات کی مدح ہوئی ہے اور جو زندگی قناعت و کفاف کے زیر سایہ بسر ہو اُسے احادیث میں "حیات طیّبہ" سے تعبیر کی گئی ہے، قرآن میں ﴿فَلَنُحۡيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً﴾ کی تفسیر میں مولائے کائنات نے فرمایا: "حیات طیبہ سے مراد قسمت، رضا اور قناعت ہے"۔[1]

لوگ اپنی بے نیازی اور رضایت کو مال دنیا کی بکثرت حصول یابی میں تلاش کرتے ہیں جب کہ مولائے کائنات ارشاد فرماتے ہیں:

"الْغَنِيُ مَنِ اسْتَغْنَى بِالْقَنَاعَةِ "[2]

"بے نیاز اور مالدار وہ ہے جس نے قناعت کے ذریعہ بے نیازی طلب کی ہے"

آج ہمارے معاشرے میں افسردگی، بے چینی اور گھر میں جھگڑے صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ اکثر لوگ قناعت اور کفاف کی دولت سے محروم میں ہیں اگر ہر انسان اپنی قسمت پر راضی رہے اور ضرورت بھر مالِ دنیا سے استفادہ کرے تو اس کی زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے۔

ہم کس طرح قانع بنیں؟

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] ۔ نہج البلاغہ، حکمت ۲۲۹.

[2] ۔ غرر الحکم، ص ۲۸.

"انْظُرْ إِلَى مَنْ هُوَ دُونَكَ فِي الْمَقْدُرَةِ وَ لَا تَنْظُرْ إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَكَ فِي الْمَقْدُرَةِ"[۱]

"جس کی قسمت اور مقدّر میں تم سے کم مال و متاع ہے اس کی طرف نظر کرو اور اُسے مت دیکھو جس کے پاس تم سے زیادہ ہے، ایسا کرنے سے تم اپنی قسمت پر قانع تر رہو گے"

گھریلو زندگی میں اکثر جھگڑے اسی بات کو لے کر ہوتے ہیں کہ فلاں کے گھر یہ ہے اور وہ ہے، اور ہمارے پاس یہ سب نہیں ہے، لہٰذا امام معصومؑ کے اس حکمت آمیز کلام پر عمل کرتے ہوئے ہمیں چاہئے کہ جو لوگ تنگدستی میں بھی خوش و خرم زندگی گذار رہے ہیں اپنے گھر والوں کو اُن کے یہاں لے جائے تاکہ وہ اُن کی طرزِ زندگی کو دیکھ کر درس لیں اور اپنی قسمت پر قانع رہیں اور اللہ کا شکر ادا کریں، ساتھ ہی ساتھ اُن کی غربت کو دیکھ کر انفاق اور ایثار کا جذبہ بھی بیدار ہو۔

قناعت اور کفاف کے آثار و برکات

۱۔ بے نیازی

اللہ نے حضرت داؤد پیغمبرؑ کو وحی کی ہے:

"وَضَعْتُ الْغِنَى فِي الْقَنَاعَةِ وَ هُمْ يَطْلُبُونَهُ فِي كَثْرَةِ الْمَالِ فَلَا يَجِدُونَه"[۲]

۱۔ میزان الحکمۃ، ری شہری، مادۂ "قنع"۔

۲۔ میزان الحکمۃ، ری شہری، مادۂ "قنع"۔

''میں نے تونگری اور بے نیازی کو قناعت میں رکھا اور لوگ اُسے کثرتِ مال میں تلاش کرتے ہیں اور اس میں نہیں پاتے ہیں''

۲۔ شکر گزاری

حضرت امام علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"أشْكَرُ النَّاس أقْنَعُهُمْ"

''شاکر ترین لوگ وہ ہیں جو قانع ترین ہیں''

۳۔ قیامت کے دن حساب وکتاب میں آسانی:

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"اقْنَعْ بِمَا أُوتِيتَهُ يَخِفَ عَلَيْكَ الْحِسَابُ"[1]

''جو کچھ تجھ کو عطا کیا گیا ہے اس پر قانع ہو جا، تاکہ (قیامت کے دن) تیرے لئے حساب وکتاب میں آسانی ہو''

۴۔ غموں سے نجات

حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "مَنْ قَنِعَ لَمْ يَغْتَمَ"[2]

''جو قناعت پسند ہوگا وہ غمزدہ نہیں ہوگا''

۵۔ خوشحال زندگی

حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: " أنْعَمُ النَّاسِ عَيْشاً مَنْ مَنَحَهُ اللَّهُ الْقَنَاعَةَ "

---

[1]۔ میزان الحکمۃ، مادۂ ''قنع''.

[2]۔ میزان الحکمۃ، مادۂ ''قنع''.

"لوگوں میں خوش حال زندگی ان کی ہے جنھیں اللہ سبحانہ نے قناعت کی دولت عطا کی ہے"

حضرت ابوذر کی قناعت پسندی

ابو بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن خلیفہ سوم عثمان نے ابوذر کے پاس (اپنے خلاف حق بیانی نہ کرنے کے لئے) دو غلاموں کے ذریعہ دو سو درہم بھجوایا اور کہلوایا: اے ابوذر یہ خلیفہ کا ہدیہ ہے تمہارے لئے تاکہ اس پونجی سے اپنے مشکلات کو حل کرسکے، حضرت ابوذر نے اُن غلاموں سے پوچھا کیا ایسا ہدیہ دیگر مسلمانوں بھی کو دیا گیا؟ تو غلاموں نے کہا خلیفہ نے اپنی ذاتی اور حلال ثروت سے صرف آپ کو عطا فرمایا ہے تو حضرت ابوذر نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کردیا کہ آج کے لئے میرے پاس دو روٹی موجود ہے بس میں آج کے لئے بے نیاز ہوں غلاموں نے اصرار کیا اور کہا ہم تو تمہارے گھر میں کچھ نہیں دیکھ نہیں رہے ہیں تم پھر بھی اپنے آپ کو بے نیاز اور غنی کہہ رہے ہو، ابوذر نے کہا: ہاں میں ولایتِ امیر المومنینؑ سے غنی اور اپنی قسمت کے رزق پر راضی ہوں، کل کی فکر کیوں کروں؟[1]

اگر ہم حقیقت میں اہلبیت اطہار علیہم السلام کے پیروکار ہیں تو حضرت ابوذر کی طرح اہل بیت علیہم السلام کی سیرتِ طیبہ سے درس لیں اور اُن کے عصمتی نقوش کو اپنے لئے مشعلِ راہ زندگی قرار دیتے ہوئے قناعت اور کفاف کے لباس سے خود کو زینت بخشیں۔ اہلبیتؑ کی قناعت و کفاف کے واقعات سے تاریخِ اسلام بھری پڑی ہے جنھیں پڑھ کر عمل

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۴۵۲.

کرنے کی ضرورت ہے، آج کے دن خداوند کریم کی بارگاہ میں یہی دعا ہے، خدایا! ہمیں اہلبیت اطہارؑ کے سچے پیروکاروں میں قرار دیتے ہوئے قناعت و کفاف کا لباس عطا فرما۔

تیسرا فقرہ: "وَاحْمِلْنی فِیهِ عَلَی الْعَدْلِ وَالْاِنْصافِ"

عدل و انصاف اردو میں مترادف سمجھے جاتے ہیں مگر عربی میں یہ دو لفظ اگرچہ مترادف نہیں ہیں مگر معنیٰ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہیں۔

عدل و انصاف

عدل کا لفظ قرآن کریم میں اپنے مشتقات کے ساتھ ۲۷/ مرتبہ آیا ہے، انصاف کے مقابل عدل کا دائرہ مفہومی اعتبار سے بہت وسیع ہے، عدل یعنی مساوات، برابری، میانہ روی کے ہیں۔[1] جس میں نہ افراط ہو اور نہ تفریط، بلکہ اعتدال ہو، لفظ اعتدال بھی اسی عدل سے ہے۔

لفظ ''قِسط'' بھی قریب قریب عدل کے معنیٰ میں ہے اور انصاف، نصف سے ہے جس کے معنیٰ بھی برابر سے تقسیم کے ہیں۔

شیعہ مذہب کے مطابق عدل، دین و مذہب کے اصول سے ہے، یعنی توحید الٰہی کے بعد عدل الٰہی کا ذکر ہوتا ہے جب کہ عدل کے علاوہ اور بھی صفات جمالی و کمالی خدا کے لئے ہیں، مگر صفتِ عدل کو خصوصی حیثیت حاصل ہے، نظام ہستی کے تمام

---

[1] مفردات راغب، مادۂ عدل.

قوانین اسی قانونِ عدلِ الٰہی پر استوار ہیں اور تمام موجودات اسی قانونِ عدل کے تحت ہیں اور پروردگار عالم اپنے بندوں سے بھی عدل وانصاف کی رعایت کا حکم دیتا ہے:

﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ﴾[1]

"بیشک اللہ عدل اور نیکی کا حکم دیتا ہے"

تجارت اور کاروبار میں بھی عدل وانصاف سے کام لینے کا حکم ہے:

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ﴾[2]

"اور ناپ تول کے معاملات میں عدل وانصاف سے کام لو"

کم فروشی، گرانفروشی، ذخیرہ اندوزی، جنس کی جھوٹی تعریف، غبن وغیرہ وغیرہ یہ تمام چیزیں عدل وانصاف کے خلاف ہیں اور اسلامی حکومت میں ان تمام چیزوں کے لئے سزا معین ہے، تاکہ لوگوں کی زندگی میں اعتدال باقی رہے۔

عدل کا دائرہ بہت وسیع ہے، عدل الٰہی سے متعلق گفتگو کلامی کتابوں میں ہوئی ہے جس کا ذکر یہاں ممکن نہیں ہے، عدلِ الٰہی کی محوریت کے اعتقاد کے پیش نظر، علم کلام میں مذہبِ شیعہ کو فرقۂ عدلیہ بھی کہا جاتا ہے۔

عدل کی ضد ظلم ہے، علمائے اخلاق نے ظلم کی تعریف یوں کی ہے: "وَضْعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَوْضِعِه" "ظلم یعنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹ کر رکھنا"۔ مثلاً مسندِ علم اور منبر، اہل علم کے لئے ہے اگر کوئی مسندِ علم پر اور منبر پر کسی جاہل کو

---

[1] سورۂ نحل، آیت ۹۰.

[2] سورۂ انعام، آیت ۱۵۲.

بٹھادے اور اہل علم کو ان جگہوں سے دور رکھے تو یہ اُن پر ظلم ہے، "تعرف الاشیاء باضدادھا؛ہر شئی اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے"۔ بلندی نہ ہو تو پستی سمجھ میں نہ آئے اندھیرا نہ ہوا تو روشنی سمجھ میں نہ آئے اس فارمولہ کے تحت عدل کو سمجھنا ہے تو ظلم کی مذکورہ تعریف سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ عدل کی تعریف گویا تعریفِ ظلم کی ضد ہے یعنی "وضع الشئ علی موضعہ؛ہر چیز کو اپنے مقام پر رکھنا عدل ہے"۔ یعنی اس چیز کے ساتھ کوئی زیادتی یا کمی نہ ہو کوئی افراط و تفریط نہ ہو جس کا جو مقام ہے اُسے وہ مقام دیا جائے، ہمارا سارا جھگڑا اسی بات پر ہے کہ رسول کے بعد اہلبیتؑ کا جو مقام تھا اُنھیں اس مقام سے ہٹا دیا گیا ہے، ہم قانونِ عدالت کے اجراء کے خواہاں ہیں۔ ہم اسی اعتقاد کی بنیاد پر شیعہ کہلاتے ہیں اگر کوئی ہم میں سے روز مرّہ کی زندگی میں اس نظامِ عدالت کی رعایت نہ کرے تو یہ بات ہمارے عقیدہ اور عمل میں تضاد اور تناقض کی نشاندہی کرتا ہے۔

اسی لئے ہمارے مذہب میں "عدالت" کی بڑی اہمیت ہے امام جماعت سے لے کر مرجعِ تقلید تک عدالت شرط ہے گواہی دینے والے کے لئے بھی عدالت شرط ہے۔

فقہی اصطلاح میں عادل اُسے کہتے ہیں جس سے گناہِ کبیرہ سرزد نہ ہو اور گناہانِ صغیرہ کی تکرار نہ ہوتی ہو، اس کے لئے حکم اس کے ظاہر پر لگایا جائے گا۔

کسی نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے سوال کیا: آقا! عدالت اور سخاوت میں کون افضل ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اَلْعَدْلُ يَضَعُ الْأُمُورَ مَوَاضِعَهَا وَ الْجُودُ يُخْرِجُهَا مِنْ جِهَتِهَا وَ الْعَدْلُ سَائِسٌ عَامٌّ وَ الْجُودُ عَارِضٌ خَاصٌّ فَالْعَدْلُ أَشْرَفُهُمَا وَ أَفْضَلُهُمَا"[1]

"عدل ہر شئ کو اُس کی منزل پر رکھتا ہے اور سخاوت اُسے اُس کی منزل سے باہر نکال دیتی ہے، عدالت سب کے کام آتی ہے اور سخاوت صرف اس کے کام آتی ہے جس کے شاملِ حال ہو جاتی ہے لہٰذا عدل و انصاف ان دونوں میں افضل واشرف ہے"

مولا کے اس کلام سے بھی عدل و انصاف کا مفہوم واضح ہے، عدل یعنی ہر کسی کو اس کا حق ملے ہر ایک کو اس کا اپنا مقام ملے، نظام تکوینِ الٰہی اسی قانون عدل پر استوار ہے اور پروردگار عالم، نظام تشریع میں بھی ہم سے عدل وانصاف سے کام لینے کا مطالبہ کرتا ہے:

﴿إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾[2]

"عدل وانصاف سے کام لو خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"

لہٰذا آج کی دعا میں خدا سے یہی درخواست ہے خدایا! ہمیں عدل و انصاف کے لئے آمادہ کر، تاکہ جب امامِ وقت کا ظہور ہو تو اس وقت ان کے لشکر کے سچے سپاہیوں میں ہمارا بھی شمار ہو سکے، کیونکہ جب امام تشریف لائیں گے تو زمین کو عدل وانصاف سے پُر کردینگے جیسا کہ روایت میں ہے: "يَمْلَأُ الْأَرْضَ قِسْطاً وَ عَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، نمبر ۴۳۷.
[2] سورۂ حجرات، آیت ۹.

ظُلْماً وَ جَوْراً" اسی لئے جمعہ کی صبح ہر دعائے ندبہ میں ہم اُنھیں یہ کہہ کر آواز دیتے ہیں: "أَيْنَ الْمُعَدُّ لِقَطْعِ دَابِرِ الظَّلَمَةِ؛ کہاں ہے وہ جسے سلسلۂ ظلم کو ختم کرنے کے لئے مہیا کیا گیا ہے"۔ "أَيْنَ الْمُرْتَجَى لِإِزَالَةِ الْجَوْرِ وَ الْعُدْوَانِ؛ کہاں ہے وہ جس سے ظلم و تعدّی کے خاتمہ کی امیدیں وابستہ ہیں"۔

چوتھا فقرہ: "وَآمِنِّي فِيهِ مِنْ كُلِّ مَا أَخافُ بِعِصْمَتِكَ يَا عِصْمَةَ الْخائِفِينَ"

دعا کے آخری جملہ میں بارگاہ ربّ العزت میں یہ التماس ہے: خدایا! مجھے ہر اس چیز سے محفوظ رکھ جس سے میں خوف کھاتا ہوں، گویا بندہ اپنی امان کے لئے خدا کی بارگاہ میں دست بہ سوال ہے۔

امن وامان

دورِ حاضر میں امن وامان، اللہ سبحانہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، آج ہر انسان چاہے وہ اسلامی معاشرہ میں ہی زندگی کیوں نہ بسر کررہا ہو اپنی جان، مال اور عزت، آبرو و ناموس کے مقابل خطرہ محسوس کررہا ہے امنیت اور عدالت دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اسی لئے دعا میں عدالت کے بعد امنیت کا ذکر ہے، امن و امان کا عدالتِ اجتماعی سے بہت گہرا تعلق ہے۔

مولائے کائنات اور طلبِ امن وامان کی دعا

حضرت علی علیہ السلام ہلالِ ماہِ مبارک رمضان پر نگاہ پڑتے ہی قبلہ رو ہو کر یہ دعا پڑھتے تھے:

"اللّٰهُمَ أَهِلَّهُ عَلَيْنَا بِالْأَمْنِ وَ الْأَمَانَةِ وَ الْإِيمَانِ وَ السَّلَامَةِ وَ الْإِسْلَامِ وَ الْمُسَارَعَةِ فِيمَا تُحِبُّ وَ تَرْضَى"[۱]

"خدایا اس چاند کو میرے لئے امن، ایمان، سلامتی، اسلام اور عافیت کا سبب قرار دے"

اور اواخر ماہ مبارک میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

" اللّهُمَّ انّي أَسْأَلُكَ الْغِنى يَوْمَ الْفَاقَة، وَ الامْنَ يَوْمَ الْخَوْفِ"[۲]

"خدایا! تجھ سے فاقہ کے دن بے نیازی اور خوف کے دن امن وامان چاہتا ہوں"

دنیا کا خوف وہراس آخرت کے خوف وہراس کے مقابل ہیچ اور ناچیز ہے لہٰذا ہمیں وہاں کے امان کے لئے آمادگی کرنی چاہئے۔

مولائے کائناتؑ کی مذکورہ دعا میں "یوم الفاقۃ" اور "یوم الخوف" سے مراد روزِ قیامت ہی ہے۔ امید ہے کہ یوسفِ زہرا وارث رسولؐ منتقم خونِ حسینؑ حضرت امام زمانہ (عج) کے ظہور کے بعد اس دنیا میں امن وامان کا راج ہوگا اور آخرت میں شفاعتِ محمدؐ وآل محمدؐ کے صدقہ میں ہر خوفزدہ چیز سے امن و امان نصیب ہوگی جن کا حساب دنیا میں درست نہ ہو وہ قیامت کے دن خوفزدہ رہیں گے، چنانچہ ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

﴿وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ﴾[۳]

"اور لوگ بدترین حساب سے ڈرتے ہیں"

۱۔ صحیفۂ علویہ، سید ہاشم رسولی محلاتی، ص۲۱۷، و۵۵۳.
۲۔ صحیفۂ علویہ، سید ہاشم رسولی محلاتی، ص۲۱۷، و۵۵۳.
۳۔ سورۂ رعد، آیت۲۱.

تیرہویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ طَهِّرْنی فِیهِ مِنَ الدَّنَسِ وَالْاَقْذارِ وَصَبِّرْنی فِیهِ عَلَی کائِناتِ الْاَقْدارِ، وَوَفِّقْنی فِیهِ لِلتُّقی وَصُحْبَةِ الْاَبْرارِ، بِعَوْنِكَ یا قُرَّةَ عَیْنِ الْمَساکِینِ».

”خدایا! مجھے آج کے دن گندگی اور کثافت سے پاک رکھ اور اس دن میں مجھ کو قضاو قدر کی کائنات پر صبر عطافرمااور آج کے دن مجھ کواپنی مدد سے اہلِ تقویٰ اور نیک لوگوں کی صحبت کی توفیق عطافرما، اے مسکینوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک“

اہم مطالب:

آج کی دعامیں خداوند کریم سے چنداہم چیزوں کی درخواست ہے:

۱۔ گندگی اور کثافت سے دوری کی۔

۲۔ تقدیر شدہ مشکلات پر صبر و تحمل کی۔

۳۔ صاحبانِ تقوااور نیک لوگوں کی ہمنشینی کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ طَهِّرْنِی فِيهِ مِنَ الدَّنَسِ وَالْاَقْذارِ"

دعا کے اس جملہ میں خالق کائنات سے گندگی اور کثافت سے دوری کی التجا ہے، ماہِ مبارک رمضان وہ مہینہ ہے جس میں خاص طور پر انسان خود کو ظاہری اور باطنی گناہوں سے پاک و پاکیزہ رکھے؛ کیونکہ خداوند عالم نے اس مہینے میں اپنے نیک بندوں کے لئے خاص اہتمام کیا ہے اسی لئے اس مہینے کو ضیافتِ خدا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماہِ رمضان کی فضیلت سے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"شَهْرُ رَمَضَانَ شَهْرُ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ....وَ هُوَ شَهْرُ الْمَغْفِرَةِ"[۱]

''ماہِ رمضان، ماہِ خدا ہے...... اور یہ ماہِ مغفرت بھی ہے''

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے صحیفۂ سجادیہ میں ماہِ مبارک رمضان کی آمد سے متعلق دعا میں ماہِ رمضان کو ''شہر الطہور'' کے نام سے بھی یاد کیا ہے یعنی پاک کرنے والا مہینہ، لہٰذا اس مہینے میں انسان کو خدا کے اس لطفِ خاص سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ظاہری اور باطنی گناہوں، گندگیوں اور کثافتوں سے پاک و پاکیزہ رہنا چاہیے پھر اس ماہ کے بعد بھی اس طہارت کو دوام دے۔

طہارت کی دو قسمیں

طہارت کی دو قسمیں ہیں:

الف) جسمانی طہارت

۱۔ بحار الانوار، ج۹۶، ص۳۴.

ب) نفسانی طہارت جسے طہارتِ روح اور طہارتِ قلب بھی کہا جاتا ہے، جسم سے متعلق چیزوں کی طہارت، ظاہری طہارت ہے، نفس و قلب کی طہارت، باطنی طہارت ہے اور جسم کی طہارت نفس و روح کی طہارت کے لئے مقدمہ ہے۔

دنس اور قذر کے معنی

"دَنس" عربی میں ناپاک اور آلودہ جگہوں کو کہتے ہیں[1]۔ جیسے وہ جگہیں جہاں پر کسی مومن کی غیبت کی جارہی ہے یا جہاں شراب اور غنا کی محفل سجی ہے، جہاں باطل کی حمایت اور حق کی مخالفت میں گفتگو ہورہی ہے، جہاں باطل اور کفر و شرک کی باتیں ہورہی ہے ایسی تمام جگہیں لغوی معنی کے اعتبار سے "دنس" کے حکم میں ہیں۔

"قذر" گندگی اور کثافت کو کہتے ہیں[2]۔ چاہے ظاہری ہو یا باطنی، مجمع البحرین میں مفہومِ قذر کی وضاحت کے لئے امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس حدیث سے استفادہ کیا گیا ہے:

"كُلُّ مَاء طَاهِرٌ إِلَّا مَا عَلِمْتَ أَنَّهُ قَذِرٌ"[3]

"ہر پانی پاک ہے جب تک کہ تمہیں اس کے قذر ہونے کا علم نہ ہو؛ آگے توضیح دی گئی ہے کہ قذر یعنی نجاست"

---

[1]۔ فرہنگ ابجدی، ص ۳۹۷.

[2]۔ فرہنگ ابجدی، ص ۸۵۰.

[3]۔ مجمع البحرین، ج ۲، ص ۴۵۳.

اس کا مطلب واضح ہے کہ صرف ظاہری نجاستوں سے متعلق گفتگو نہیں ہے، بلکہ دعا کے اس فقرے میں ہر قسم کی برائی اور کثافت، چاہے وہ ظاہری ہو یا باطنی ان دونوں سے پاک و پاکیزہ رہنے کے لئے خدا کی بارگاہ میں درخواست ہے، بسا اوقات انسان برائی کی تشخیص نہیں دے پاتا ہے جیسے کوئی انسان شراب کو شربت سمجھ کر پی جاتا ہے۔ خدا سے یہی دعا ہے کہ ہمیں اس قسم کی غلطیوں سے بھی محفوظ رکھے۔ اگرچہ کہ اس نے گناہ نہیں کیا، نادانی میں برائی اور گندگی کو تشخیص نہ دے سکا۔

بسا اوقات انسان خباثت اور برائی کی صحیح تشخیص اور اس برائی کے مرتکب ہونے کے عواقب و نتائج کو جاننے کے باوجود، خود کو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا رہتا ہے جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا بعض لوگ بڑی جرأت سے مسجد و محراب میں بھی غیبت کرنے سے باز نہیں آتے ہیں، مگر جب ان کو کوئی اس کارِ حرام سے روکتا ہے تو وہ کہتے ہیں یہ غیبت تھوڑی ہے؟ بس بات میں بات آگئی تو کہدیا، جبکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ غیبت ہے، بہر حال ماہِ مبارک رمضان ہمارے لئے بہترین موقعہ ہے جس میں ہم توبہ اور استغفار کے ذریعہ تمام برائیوں سے نجات پا سکتے ہیں اور اللہ کی محبت اور کرم کے حقدار بن سکتے ہیں؛ کیونکہ یہ اس کا اعلان ہے:

﴿وَاللهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِینَ﴾[1]

"اور اللہ پاک و پاکیزہ لوگوں کو دوست رکھتا ہے"

---

[1] سورۂ توبہ، آیت ۱۰۸.

دوسرا فقرہ: "وَصَبِّرْنِی فِیهِ عَلَی کائِنَاتِ الْاَقْدارِ"

"اقدار" قدر کی جمع ہے، قدر کے معنیٰ اندازہ اور سر نوشت کی تعین کے ہیں، شبِ قدر کو شبِ قدر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس بابرکت رات میں انسانوں کی قسمت اور سر نوشتوں کا تعین ہوتا ہے۔

یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد مرتبہ آیا ہے۔

قضا و قدر الٰہی

علمِ کلام کی اصطلاح میں قضا و قدر الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات کا علم ازل ہی سے اللہ کے پاس موجود ہے اور وہ واقعات حتمی طور پر وقوع پذیر ہوں گے مگر اللہ کے کچھ فیصلے غیر حتمی بھی ہوتے ہیں جس طرح کسی انسان کا گرفتارِ بلا ہونا، اس کی قسمت میں قضا و قدرِ غیر حتمی کے طور پر ہے جو صدقہ دینے یا کسی نیک کام کے انجام دینے سے ٹل بھی جاتا ہے، رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"الصَّدَقَةُ تَدْفَعُ الْبَلَاءَ"[1]

"صدقہ بلا و مصیبت کو دور کر دیتا ہے"

مگر جو مقدرات، اللہ کی جانب سے یقینی اور حتمی ہوتے ہیں ایسے حوادث اور مشکلات پر صبر اور تحمل سے کام لینا بندۂ مومن کی نشانی ہے؛ کیونکہ کبھی کبھی

---

[1] میزان الحکمۃ، ج۶، ص۲۱۹.

خداوند کریم مشکلات اور سخت ترین حالات کے ذریعہ بندہ کا امتحان لیتا ہے تاکہ اس کو معنوی مقامات عطا کرے۔

چنانچہ پرروردگار عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ، الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾[1]

''اور ہم یقیناً تھوڑے خوف، تھوڑی بھوک اور اموال، نفوس اور ثمرات کی کمی سے آزمائیں گے اور (اے رسول) ان پر صبر کرنے والوں کو بشارت دیدیں، جو مصیبت پڑنے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں''

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"إِنَّ فِي كِتَابِ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ بَلَاءً النَّبِيُّونَ، ثُمَّ الْوَصِيُّونَ، ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ؛ وَ إِنَّمَا يُبْتَلَى الْمُؤْمِنُ عَلى قَدْرِ أَعْمَالِهِ الْحَسَنَةِ، فَمَنْ صَحَّ دِينُهُ وَ حَسُنَ عَمَلُهُ، اشْتَدَّ بَلَاؤُهُ"[2]

''کتاب علی علیہ السلام میں آیا ہے: تمام لوگوں میں سب سے زیادہ بلاو مصیبت میں گرفتار افراد انبیاء ہوں گے ان کے بعد ان کے اوصیاء، پھر ان کے بعد

---

[1]۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۵، و۱۵۶.

[2]۔ اربعین، امام خمینی، ص ۲۳۵.

نیک افراد، پھر ان سے نیچے والے نیک افراد اور مومن بقدر اعمالِ صالحہ گرفتارِ بلا ہوتے ہیں اُن کے لئے بلا و مصیبت سخت ہے"

صبر

لفظِ صبر قرآن مجید میں اور معصومین علیہم السلام کی احادیث میں اپنے مشتقات کے ساتھ متعدد مرتبہ آیا ہے، صبر انبیائے کرام اور اولیائے الٰہی علیہم السلام کا شیوہ ہے، صبر کے معنیٰ ہر گز یہ نہیں ہے کہ انسان آسانی سے ظلم کو قبول کرلے اور اسی کو مقدر اور قسمت جان کر راضی ہوجائے۔ درحقیقت صبر، مصیبتوں اور سختیوں کے مقابل استقلال اور استقامت دکھانے کا نام ہے[1]۔ چاہے وہ مشکلات اور مصائب اللہ کی طرف سے ہوں یا ظالم کے ظلم کی بنا پر ہو۔ درحقیقت صبر، شجاعت کا نام ہے چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ربّ العزت ہو رہا ہے:

﴿وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِي قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾[2]

"اور بہت سے ایسے نبی گذرے ہیں جن کے ساتھ بہت سے اللہ والوں نے اس شان سے جہاد کیا ہے کہ راہِ خدا میں پڑنے والی مصبتوں سے نہ کمزور ہوئے اور نہ بزدلی کا اظہار کیا اور نہ دشمن کے سامنے ذلّت کا مظاہرہ کیا اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"

---

[1]۔ جامع السعادات، نراقی، ج۳، ص ۲۸۴.

[2]۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۶.

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"الْعَجْزُ آفَةٌ وَ الصَّبْرُ شَجَاعَةٌ"[۱]

''عاجزی آفت ہے اور صبر شجاعت ہے''

مذکورہ آیۂ کریمہ اور حدیث سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ صبر عاجزی کا نام نہیں ہے، بلکہ شجاعت کا نام ہے؛ کیونکہ عاجزی انسان کو ناکارہ بنا دیتی ہے اور صبر انسان کو حوصلہ بخشتا ہے، اسی لئے امام علی علیہ السلام نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا ہے:

"الصَّبْرُ أَدْفَعُ لِلْبَلَاءِ"[۲]

''صبر بلا و مصیبت کے دفع کرنے کا بہترین وسیلہ ہے''

علمائے اخلاق نے احادیث معصومین علیہم السلام کی روشنی میں مختلف حالات کے پیش نظر صبر کے متعدد مصادیق قرار دیئے ہیں جیسے جنگ و جدال کے حالات میں صبر، شجاعت ہے۔ غیظ و غضب کے عالم میں صبر، حلم ہے۔ شہوت پر صبر، عفت ہے۔ مالِ دنیا پر صبر، زہد ہے۔ معصیت پر صبر، تقویٰ ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے صبر کا دائرہ بہت ہی وسیع و عریض ہے۔

تین مقامات پر صبر کی تاکید کی گئی ہے:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت ۴.

۲۔ غرر الحکم، ح ۷۶۲.

"الصَّبْرُ ثَلَاثَةٌ صَبْرٌ عِنْدَ الْمُصِيبَةِ وَ صَبْرٌ عَلَى الطَّاعَةِ وَ صَبْرٌ عَنِ الْمَعْصِيَةِ"[۱]

"صبر کی تین قسم ہیں ۱۔مصیبت پر صبر، ۲۔اطاعت پر صبر ۳۔معصیت پر صبر"

۱۔ معصیت پر صبر

کبھی انسان بے حیائی کی بناپر نفسانی شہوت کا شکار ہوتا ہے یا بھوک کی وجہ سے چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے یا جاہ طلبی اور حبِّ ریاست کی وجہ سے مختلف گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ ان تمام حالات میں استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے نفس کو گناہوں سے بچانا اور محفوظ رکھنا ہی معصیت پر صبر کرنا ہے۔

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"الصبر إما صبر على المصيبة أو على الطاعة أو عن المعصية و هذا القسم الثالث أعلى درجة من القسمين الأولين".[۲]

"صبر یا معصیت و گناہ کے انجام دینے پر کیا جاتا ہے یا اطاعت و عبادت کرنے میں صبر کیا جاتا ہے یا گناہ و معصیت سے رُک کر صبر کیا جاتا ہے لیکن تیسری قسم کا صبر صبر کی پہلی دو قسموں پر برتری رکھتی ہے"

---

[۱]۔ کافی، ج۲، ص۶۱۔

[۲]۔ میزان الحکمۃ، ج۶، ح۱۰۲۵۶، ص۱۸۵۔

۲۔ اطاعت پر صبر

انسان کے لئے اللہ کی عبادت سخت ہے مثال کے طور پر صبح سویرے اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرکے نماز پڑھنا یا ماہِ رمضان میں روزہ رکھنا، اپنی جمع پونجی سے خمس وزکات نکالنا، راہِ خدا میں انفاق کرنا کاروبار کے وقت، نماز کا وقت آنے پر کاروبار کو چھوڑ کر مصلے پر آجانا بہت ہی سخت ہے مگر جو اپنے نفس کو اِن امور کے مقابل اطاعت خداوندی کے لئے آمادہ کرے وہی صابر ہے، کسی نے رسول اسلام ﷺ سے سوال کیا صبر کرنے والے کون لوگ ہیں توآپ نے فرمایا:

"اَلَّذِینَ یَصْبِرُونَ عَلَی طَاعَةِ اللّٰهِ وَ عَنْ مَعْصِیَتِهِ"[۱]

"صابر وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت اور اس کی معصیت پر صبر کرتے ہیں"

۳۔ مصیبت پر صبر

انسان حوادثِ روزگار کے مقابل ناتواں اور عاجز ہو جاتا ہے اگر وہ مومن نہ ہو تو دامنِ صبر کو ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے لیکن صاحبِ ایمان، پُرآشوب حالات، مشکلات اور مصائب کے مقابلہ میں استقامت اور ثابت قدمی دکھاتا ہے۔

مقدراتِ الٰہی پر صبر خواہ خیر ہو یا شر، انبیاء اور اولیائے الٰہی کے صفات سے ہے آج کی دعا میں خداوند کریم سے یہی التجا ہے کہ خدایا! ہمیں اپنے مقدرات یعنی وہ مشکلات جو ہماری تقدیر میں ہیں پر صبر کرنے کی توفیق عطا فرما۔

---

[۱]۔ بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۹۳.

تیسرا فقرہ: "وَوَفِّقْنِي فِيهِ لِلتُّقى وَصُحْبَةِ الْاَ بْرارِ"

دعا کے اس جملہ میں بارگاہ الٰہی میں تقویٰ اور نیک لوگوں کی سنگت کی توفیق کی التجا ہے، ماہِ رمضان میں اللہ کی طرف سے ہم پر روزوں کو فرض قرار دیئے جانے کا مقصد بھی تقویٰ حاصل کرنا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہورہا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ....لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾[1]

"اے ایمان لانے والو تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں .... تاکہ تم تقویٰ اختیار کرسکو"

تقویٰ کیا ہے؟

تقویٰ مادۂ "وقایہ" سے حفظ و نگہداری کے معنیٰ میں ہے، قرآن مجید میں ہوتا ہے:

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ....﴾[2]

"اور تمہارے لئے (اللہ نے) ایسے پیراہن بنائے جو گرمی سے حفاظت کرسکیں"

راغب اصفہانی اپنی کتاب "مفردات الفاظ القرآن" میں لفظ تقویٰ کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

"الْوِقَايَةُ: حفظُ الشيءِ ممّا يؤذيه و يضرّه. و التَّقْوَى جعل النّفس في وِقَايَةٍ مما يخاف... ثمّ يسمّى الخوف تارة تَقْوًى، و التَّقْوَى

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۳.

[2] سورۂ نحل، آیت ۸۱.

خوفاً حسب تسمية مقتضى الشيء بمقتضيه و المقتضي بمقتضاه، و صار التَّقْوَى في تعارف الشّرع حفظ النّفس عمّا يؤثم"[۱]

"وقایہ، یعنی جس چیز سے اذیت اور ضرر ہوتی ہے اُس سے کسی چیز کی حفاظت کرنا ہے اور "تقویٰ" یعنی نفس کی حفاظت و نگہداری کرنا اُن امور سے جن سے خوف ہوتا ہے۔ لہٰذا خوف اور ڈر کو بھی تقویٰ کہا جاتا ہے"

اسی لئے "اتَّقُوا اللَّهَ" سے مراد اللہ سے ڈرو یعنی اللہ کی معصیت سے ڈرو، اللہ کی معصیت سے اپنے نفس کو بچاؤ۔

جس طرح انسان کے جسم کی صحت اور سلامتی کے لئے ضرر رساں چیزوں سے حفاظت کی ضرورت ہے اسی طرح روح کی صحت اور سلامتی کے لئے بھی ضرر رساں چیزوں سے محافظت ضروری ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کی روح کو ضرر اور خطرہ گناہوں سے ہوتا ہے اور گناہ کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے: ۱۔ ترکِ واجبات ۲۔انجام محرمات، لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقوا کا کمترین درجہ، واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے پرہیز کرنا ہے۔ تقویٰ کے مختلف درجات ہیں اور اس کا اعلیٰ ترین درجہ مقامِ عصمت ہے؛ کیونکہ عصمت کے معنٰی بھی حفاظت اور بچانے کے ہیں اور مقامِ عصمت کبریٰ، عصمت کا سب سے اعلیٰ ترین درجہ ہے جس میں ترکِ اولیٰ کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا ہمارے چہاردہ معصومین علیہم السلام اسی درجۂ عصمت پر فائز ہیں۔

۱۔ مفردات راغب، راغب اصفہانی، مادۂ "وقی"

تقویٰ کے نتائج

آیات وروایات میں تقویٰ اور صاحبان تقویٰ کی فضیلت اور ان کے مقام و مرتبہ سے متعلق متعدد جگہوں پر ذکر ہوا ہے اور ان میں تقویٰ کے ثمرات اور آثار سے متعلق بھی گفتگو ہوئی ہے، لہٰذا اختصار کے پیش نظر یہاں پر سب کا بیان کرنا ممکن نہیں ہے اُن میں سے چند کا ذکر کرتے ہوئے بات کو یہیں پر ختم کردینا مناسب ہے۔

۱۔ کرامت

خداوند کریم کا ارشاد گرامی ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ﴾[۱]

"تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم اور مکرم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے"

آیہ کریمہ سے یہ بات واضح ہے کہ اللہ کے پاس کرامت، شرافت و عزت کا معیار نہ قوم وقبیلہ ہے نہ شہرت وثروت ہے، بلکہ صرف تقوا ہے۔

۲۔ بصیرت وآگاہی

﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ﴾[۲]

۱۔ سورۂ حجرات، آیت ۱۳.

۲۔ سورۂ اعراف، آیت ۲۰۱.

''جو لوگ صاحبان تقویٰ ہیں جب اُن کے دل میں کوئی شیطانی خیال بھی آتا ہے تو وہ خدا کو یاد کرتے ہیں اور راہ حق کو دیکھنے لگتے ہیں''

اسی لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ". [۱]

''مومن کی فراست سے ڈرو؛ کیونکہ وہ نور خود سے دیکھتا ہے''

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی اطاعت و معرفت نیز معصیت سے دوری کی بناپر مومن، آئینہ کی طرف شفاف ہو جاتا ہے پھر انوارِ الٰہیہ کی شعائیں اُس کے دل پر پڑتی ہیں تو اس کے انعکاس سے اس کا سارا وجود روشن اور نورانی ہو جاتا ہے پھر وہ ہر چیز کو نورِ خدا سے دیکھنے لگتا ہے اور یہی بصیرت ہے۔

۳۔ نزولِ رحمت و برکت

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَي آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَات مِنْ السَّمَاءِ وَالأَرْض﴾ [۲]

''اور اگر اہلِ قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے''

اس آیۂ کریمہ سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ایمان اور تقویٰ کا اثر صرف آخرت میں نہیں ہوتا، بلکہ دنیا میں بھی اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۶۷، ص ۶۱، ح ۵.

۲۔ سورۂ اعراف، آیت ۹۶.

۴۔گناہوں کی بخشش

﴿وَمَنْ یَتَّقِ اللهَ یُکَفِّرْ عَنْهُ سَیِّئَاتِهِ وَیُعْظِمْ لَهُ أَجْراً﴾[۱]

''اور جو بھی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اس کے اجر میں اضافہ کر دیتا ہے''

۵۔اعمال کی قبولیت

﴿إِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللهُ مِنْ الْمُتَّقِینَ﴾[۲]

''خدا صرف صاحبانِ تقویٰ کے اعمال کو قبول کرتا ہے''

۶۔وسعتِ رزق

﴿وَمَنْ یَتَّقِ اللهَ یَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجاً، وَیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لاَ یَحْتَسِبُ﴾[۳]

''اور جو بھی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے نجات کی راہ پیدا کر دیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جس کا اسے خیال بھی نہیں ہوتا ہے''

۷۔بہشت

﴿إِنَّ الْمُتَّقِینَ فِي جَنَّات وَنَهَر، فِي مَقْعَدِ صِدْق عِنْدَ مَلِیك مُقْتَدِر﴾[۴]

''بیشک صاحبان تقویٰ باغات اور نہروں کے درمیان ہوں گے اس پاکیزہ مقام پر صاحبِ اقتدار بادشاہ کی بارگاہ میں ہے''

---

[۱]۔ سورۂ طلاق، آیت ۵.

[۲]۔ سورۂ مائدہ، آیت ۲۷.

[۳]۔ سورۂ طلاق، آیت ۲۔۳.

[۴]۔ سورۂ قمر، آیت ۵۴و۵۵.

۸۔اللہ کی نشانیوں کی عظمت

﴿ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ الله فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَي الْقُلُوبِ﴾[۱]

''یہ ہمارا فیصلہ ہے اور جو بھی اَللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے گا یہ تعظیم اس کے دل کے تقویٰ کا نتیجہ ہو گی''

اللہ کی خاص نشانیوں کی حفاظت اور اُن کا احترام، اسلامی اقدار کی پاسداری صرف صاحبانِ تقویٰ ہی کی نشانی ہے۔آج جو لوگ اسلام کا نام لے کر اللہ کی خاص نشانیوں کی بے احترامی کر رہے ہیں، اصحاب پیغمبر اور اولیائے الٰہی کے قبروں کو مسمار کر کے بے گناہ مومنین کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں وہ در حقیقت دولتِ ایمان اور زیورِ تقویٰ سے بہت دور ہیں صرف لمبی لمبی داڑھی رکھ کر "اِتقوا اِتقوا" کہنے سے کوئی متقی نہیں ہو جاتا، صاحبانِ تقویٰ اپنی خاص نشانیوں سے پہچانے جاتے ہیں اور ان میں بصیرت ہوتی ہے لہٰذا وہ بے وقوفیاں نہیں کرتے وہ اللہ کی نشانیوں کا احترام کرتے ہیں، اولیائے الٰہی کی قبریں شعائر اللہ ہیں لہٰذا وہ انھیں مسمار نہیں کرتے بلکہ ان کا احترام کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ، صاحبان تقویٰ کی اور بھی نشانیاں اور اثرات و برکات، آیات و روایات میں مذکور ہیں، نہج البلاغہ میں ایک مکمل خطبہ، خطبۂ متقین یا خطبۂ ہمام کے نام سے موجود ہے جس میں مولائے کائناتؑ نے صاحبان تقویٰ کی علامتوں کا ذکر

۱۔ سورۂ حج، آیت ۳۲.

فرمایا، مختصر یہ ہے کہ جن کا امام، امام المتقین ہو، اس کے پیرکار اور شیعہ کو متقی ہونا ضروری ہے اسی لئے ہماری دعا ہے: خدایا! ہمیں صاحب تقویٰ بننے کی توفیق عطا فرما۔

نیک لوگوں کی ہمنشینی

اس دعا میں نیک لوگوں کی ہمنشینی کی توفیق کی درخواست بھی ہے، انسان کی تربیت اور کردار سازی میں نیک لوگوں کی صحبت اور ہمنشینی کا اہم کردار ہوتا ہے، لہٰذا ہمیشہ اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرنا چاہئے اور اولاد کی تربیت میں بھی اس بات کا خیال رکھے کہ اُن کا اٹھنا، بیٹھنا کس قسم کے افراد کے ساتھ ہے، اچھے اصحاب کی چاہت اور تمنا ائمہ معصومین علیہم السلام کو بھی رہی ہے جہاں امام حسین علیہ السلام نے اپنے اصحاب کے خیر ہونے پر یہ کہہ کر فخر و مباہات فرمائی: "إنّي لَا أَعْلَمُ أَصْحَاباً أَوْفَى وَ لَا خَيْراً مِنْ أَصْحَابِي [1]؛ میں نے اپنے اصحاب سے زیادہ وفادار اور بہتر کسی کے اصحاب کو نہیں دیکھا"۔ وہیں مولائے کائنات ؑ نے بعض اصحاب کی سستی اور حکمِ جہاد پر کان نہ دھرنے پر رنجیدہ خاطر ہو کر یہ کہہ کر ان کی مذمت بھی کی: "یا أشباهَ الرِّجالِ ولا رِجال [2]؛ تم مرد نما ہو مگر تم میں مردانگی و شجاعت نہیں ہے"۔ ایک اور مقام پر فرمایا: "لَا غَنَاءَ فِي كَثْرَةِ عَدَدِكُم [3]؛ تمہارا کثرت میں ہونا بھی میرے لئے بے سود ہے"۔ لہٰذا وہ شخص خوش قسمت ہوتا ہے جنھیں اچھے لوگوں کی صحبت نصیب ہوتی ہے۔

---

[1]۔ اولین مقتل سالار شہیدان، ص۲۰۱.
[2]۔ نہج البلاغہ، خ۲۷.
[3]۔ نہج البلاغہ، خ۱۱۹.

نیک لوگوں کی خصوصیتیں قرآن کریم کی روشنی میں

ا۔ اہلِ ایمان

﴿وَإِنَّ كَثِيراً مِنْ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَي بَعْض إِلاَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَا هُمْ﴾

''اور بہت سے شرکاء ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پر ظلم کرتا ہے علاوہ ان لوگوں کے جو صاحبانِ ایمان اور عمل صالح ہیں اور وہ بہت کم ہیں''

۲۔ صاحبان تقوا

﴿الأَخِلاَّءُ يَوْمَئِذ بَعْضُهُمْ لِبَعْض عَدُوٌّ إِلاَّ الْمُتَّقِينَ﴾[1]

''آج کے دن صاحبانِ تقویٰ کے علاوہ تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے''

یہ آیۂ کریمہ قیامت سے متعلق ہے ''یومئذ'' سے مراد قیامت کا دن ہے جہاں کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں ہے ہر ایک اپنا اپنا نامۂ اعمال لے کر پریشان رہے گا صرف صاحبانِ تقویٰ ہی ہوں گے جو اپنے دوستوں کے کام آئیں اور ان کی بخشش و شفاعت میں مددگار واقع ہوں گے لہٰذا صاحبانِ تقویٰ کو دوست بنائے تاکہ آخرت میں فائدہ ہو۔

---

[1] سورۂ زخرف، آیت ٦٧.

۳۔اہلِ عبادت واطاعت

﴿وَلاَ تَطْرُدْ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾[۱]
"اور وہ لوگ جو صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور خدا ہی کو مقصود بنائے ہوئے ہیں، انھیں اپنی بزم سے دور نہ کرو"

ان کے علاوہ دیگر آیات وروایات میں نیک لوگوں کی علامتوں کا ذکر ہے، انسان کو چاہئے کہ اچھے لوگوں کو دوست بنائے تاکہ یہ دوستی قیامت کے دن بھی کام آسکے؛ کیونکہ نیک لوگوں کا مقام جنت ہے ﴿إِنَّ الأَبْرَارَ لَفِي نَعِيم﴾[۲] "بیشک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے"۔

۱۔ سورۂ انعام، آیت ۵۲.
۲۔ سورۂ انفطار، آیت ۱۳.

چودھویں تاریخ کی دعا

اَللّٰھُمَّ لاَ تُؤاخِذْنی فِیهِ بالْعَثَراتِ وَأَقِلْنی فِیهِ مِنَ الْخَطایا وَالْهَفَواتِ وَلاَ تَجْعَلْنی فِیهِ غَرَضاً لِلْبَلایا وَالأَفاتِ، بِعِزَّتِكَ یَا عِزَّ الْمُسْلِمینَ

”خدایا! آج کے دن میری لغزشوں پر مواخذہ نہ فرمااور میری خطاؤں اور غلطیوں کے عذر کو قبول فرمااور آج کے دن مجھے بلا وآفت کا ہدف قرار نہ دے اپنی عزت کے واسطہ سے اے مسلمانوں کی عزت وآبرو“

اہم مطالب:

اس دعامیں بارگاہِ رب العزت میں تین اہم چیزوں کی درخواست ہے:

۱۔ لغزشوں پر مواخذہ نہ کرنے کی۔

۲۔ عذرِ خطاکی قبولیت کی۔

۳۔ بلاومصیبت سے محافظت کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ لاَ تُؤَاخِذْنِی فِیهِ بِالْعَثَرَاتِ"

عثرات، عثرہ کی جمع ہے، عثر کے معنیٰ بغیر چاہے کسی چیز سے مطلع ہونے کے ہیں مگر یہاں عثرہ کے معنیٰ لغزش کے ہیں کبھی انسان اطاعتِ الٰہی کی راہ پر چلتے ہوئے بھی لغزش کرتا ہے یعنی اس کے سامنے کچھ ایسے حالات بن جاتے ہیں کہ وہ معصیت سے دوچار ہو جاتا ہے اسی کو علمِ اخلاق کی اصطلاح میں ''عثرہ'' کہتے ہیں۔

''لغزش'' اس خطا کو کہتے ہیں جس کا ارادہ انسان پہلے سے نہیں کرتا ہے، بلکہ اس کا ارادہ تو اللہ کا اطاعت گذار بن کر راہِ حق پر گامزن رہنے کا رہتا ہے مگر اچانک کچھ حالات ایسے پیش آجاتے ہیں جن کی بناپر معصیت کر بیٹھتا ہے جس طرح برفیلی چٹانوں پر چڑھنے والا بڑی احتیاط سے آگے بڑھتا ہے مگر اچانک تھوڑی سی غفلت کی بناپر اس کے قدم پھسل جاتے ہیں چنانچہ خداوند عالم قرآن کریم میں اہل ایمان کی دعا کو یوں نقل کررہاہے:

﴿رَبَّنَا لاَ تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِینَا أَوْ أَخْطَأْنَا﴾[1]

''اے ہمارے پروردگار ہم سے اگر بھول ہو جائے یا غلطی ہو جائے تو اس کا ہم سے مواخذہ نہ کرنا''

سہو ونسیان انسان کے اختیار میں نہیں ہے، لہٰذا اُن کے مواخذہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر یہاں سہو ونسیان سے مراد وہی غفلت اور لاپرواہی ہے جس کی بناپر انسان معصیت کر بیٹھتا ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۶.

انسان کی لغزشیں کبھی میدانِ عمل میں ہوتی ہیں تو کبھی مقامِ فکر میں ہوتی ہیں، کبھی انسان مذہبی امور میں خطا کرتا ہے جیسے بنام دین خرافات کی ترویج کرتا ہے تو کبھی عبادی امور میں خطا کرتا ہے جیسے شرک خفی یا جلی کا مرتکب ہونا تو کبھی اقتصادی مسائل میں خطا کرتا ہے جیسے ذخیرہ اندوزی اور کم فروشی و.... لیکن بغیر قصد وارادہ اگر لغزش وخطا سرزد ہو جائے تو فوراً ہشیار ہو جائے، توبہ واستغفار کے ذریعہ دوبارہ راہِ حق پر لوٹ آئے۔

مقاماتِ لغزش

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان کی لغزشیں ایک جیسی نہیں ہوتی ہیں کیونکہ شیطان ہر انسان کو اس کے اعتبار سے بہکاتا ہے، ایک مرتبہ ایک استادِ اخلاق نے درس کے درمیان فرمایا: جان لو ہمارا شیطان بازاری نہیں ہے، بلکہ ہمارا شیطان حوزوی ہے جو شرح لمعہ اور مکاسب جیسی کتابوں کو ہم سے اچھا پڑھا ہوا ہے، لہٰذا ہشیار رہیں کیونکہ وہ ہمیں ان ہی چیزوں میں بہکائے گا، ہمیں محراب میں بہکائے گا ہمیں منبر پر بہکائے گا، ہمیں وہ شراب خانے یا سینما حال جانے کی تشویق نہیں کرے گا، یہ کام تو عام لوگوں کے ساتھ شیطان کرتا ہے، ہاں ہمارا شیطان رضائے مخلوق کے لئے منبر سے غلط باتیں کہنے پر مجبور کرے گا۔

جناب سید مرتضیٰؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جماعت کی نماز نہیں پڑھاتے تھے مگر جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو آمادہ ہو گئے جب یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تو سب لوگ مسجد میں آ گئے بالآخر سید نے نماز پڑھائی، نمازیوں سے مسجد بھر گئی

تھی، صفیں مسجد سے باہر نکل گئیں، سید جب گھر لوٹے تو کہہ دیا بس آج کے بعد نماز نہیں پڑھاؤں گا، جب وجہ دریافت کی گئی تو کافی اصرار کے بعد یہ پتہ چلا کہ جب وہ رکوع کی حالت میں تھے تو کسی ماموم کی بڑی دور سے یااللہ کی آواز سنی تو دل میں ایک لمحہ کے لئے یہ خیال آیا کہ میرے آنے سے صفیں کس قدر طولانی ہو گئیں ہیں کہ کافی دور سے یااللہ کی صدا سن رہا ہوں، اس خیال کا دل میں آنا تھا آپ نے استغفار کیا، بہرحال ہر انسان کی لغزش اس کے مقام اور مرتبہ اور اس کے سِن وسال کے اعتبار سے ہوتی ہے لہٰذا انسان ہر عمر میں اور ہر حالت میں اور ہر کیفیت میں چوکنا رہے یعنی غفلت سے کام نہ لے ورنہ شیطان ہماری غفلت کا فائدہ اٹھا کر ہمارے پائے فکر و عمل میں لغزش پیدا کر دیتا ہے۔

لہٰذا آج کے دن اپنے خالق کی بارگاہ میں یہی دعا ہے خدایا! ہمیں اِن لغزشوں سے محفوظ رکھ اگر ہم سے کوئی لغزش ہو بھی گئی ہے تو تجھے تیری رحمت و کرامت کا واسطہ ان لغزشوں پر ہمیں مواخذہ نہ فرما۔

دوسرا فقرہ: "وَأَقِلْنِی فِیهِ مِنَ الْخَطایا وَالْهَفَواتِ"

اقالہ کے معنیٰ:

"أقلنی "یعنی میرا عذر قبول فرما، "أقلنی " مادۂ "اِقاله " سے ہے، فقہ کی اصطلاح میں "اِقاله " (جو کہ قول سے ہے) کسی بھی معاملہ میں بیچنے والے یا خریدار کا پشیمان ہو کر معاملہ فسخ کرنا یعنی معاملہ کو ختم کر دینا گویا یہ کہنا کہ میں یہ معاملہ کر کے شرمندہ

ہوں لہٰذا بڑی شرمندگی سے فسخ کی درخواست کررہا ہوں قبول فرمالیجئے۔ اس دعا میں بھی ''اقالہ'' اسی معنیٰ میں ہے یعنی بندہ اپنے خدا سے درخواست کررہا ہے مجھ سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے اس پر اب میں شرمندہ ہوں اس خطا کو فسخ فرمادے اور اس خطا کی بناپر مجھ پر عذاب نہ فرما۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام دعائے کمیل میں فرماتے ہیں:

"وَ أَقِلْنِي عَثْرَتِي وَ اغْفِرْ زَلَّتِي فَإِنَّكَ قَضَيْتَ عَلَى عِبَادِكَ بِعِبَادَتِك"

''میری لغزش کو قبول فرمااور میری خطا کو معاف کر اس لئے کہ تو نے اپنے بندوں کے بارے میں طے کیا کہ وہ تیری عبادت کریں''

زیارت ناحیہ میں بھی محمد وآل محمد پر صلوات کے بعد یوں وارد ہے:

"وَ اقْبَلْ تَوْبَتِي، وَ ارْحَمْ عَبْرَتِي، وَ أَقِلْنِي عَثْرَتِي"

''خدایا! میری توبہ قبول فرما، میرے اشکوں پر رحم فرمااور میری لغزشوں کو درگذر فرما''

دعا کے اس جملہ میں ''خطایا'' کے بعد ''ھفوات'' کا ذکر آیا ہے، لغت میں ''ھفوات'' ہوا اور بھوک کو کہتے ہیں، جب انسان بھوکا ہوتا ہے تو اُسے مادی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اُسی طرح انسان کی روح کو جب روحانی غذا نہ ملے تو اس کی روح بھی معنویت سے خالی ہوجاتی ہے جس سے روح بیمار پڑ سکتی ہے اور روح کی بیماری گناہ ہے۔ دراصل یہاں ھفوات اسی خطا واشتباہ کی تاکید ہے۔[1]

---

[1] صبح رضوان، ذبیح اللہ آخوندی، ج۲، ص۱۴۰۔

لہٰذا خالق کائنات سے آج کے دن یہی درخواست ہے خدایا! ہمیں لغزشوں سے درگذر فرمااور یہ صرف توبہ اور استغفار سے ممکن ہے۔

تیسرا فقرہ: "وَلاَ تَجْعَلْنِی فِیهِ غَرَضاً لِلْبَلایا وَالأَفاتِ"

خدایا مجھے بلا و آفت کا ہدف قرار نہ دے، مگر یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ انسان کی زندگی بلا و آفت کے بغیر ممکن نہیں ہے، آیات اور روایات سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ بلاؤں اور آفتوں کے ذریعہ پروردگار عالم اپنے بندہ کا امتحان لیتا ہے چنانچہ ارشادرب العزت ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنْ الأَمْوَالِ وَالأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرْ الصَّابِرِينَ﴾[1]

"اور ہم تمہیں تھوڑے خوف تھوڑی بھوک اور اموال، نفوس اور ثمرات کی کمی سے آزمائیں گے (اے رسول(اُن صبر کرنے والوں کو بشارت دیدیں"۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال اٹھے خداوند کریم تو ہر چیز سے بخوبی آگاہ ہے پھر اُسے کسی کو جاننے کے لئے آزمانے کی ضرورت کیوں؟

شہید مطہریؒ فرماتے ہیں: ایک دقت امتحان کسی نامعلوم چیز کا علم حاصل کرنے کے لئے ہے مثلاً جب کسی چیز کو ترازو میں رکھ کر تولا جاتا ہے تو صرف مقصد

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۵.

اس کا وزن معلوم کرنا ہوتا ہے اس امتحان سے نہ اُس چیز کے وزن میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ کمی آتی ہے، صرف اس چیز کا وزن جو معلوم نہیں تھا اس کا علم ہو جاتا ہے مگر یہاں امتحان اور آزمائش اور آزمائش کے یہ معنیٰ نہیں ہے، بلکہ یہاں امتحان اور آزمائش کے ایک اور معنیٰ بھی ہے، خداوند کریم کسی سے امتحان لیتا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہے کہ بندہ جس کمال کی لیاقت رکھتا ہے اُسے بلا و مصیبت سے امتحان و آزمائش کے ذریعہ اس کمال تک پہونچاتا ہے گویا یہاں پر امتحان کے ذریعہ اس کا وزن اور درجات میں اضافہ کرتا ہے، اب یہ بندہ کی لیاقت کی بات ہے کہ وہ امتحانات الٰہی میں کامیابی حاصل کرکے کس حد تک بلند ہونا چاہتا ہے۔[1]

مگر سوال یہ ہے کہ جب بلا و آفت کے ذریعہ آزمائش درجات کی بلندی کے لئے ہے تو پھر دعا میں کیوں کہا جا رہا ہے خدایا مجھے بلا و آفت کا ہدف قرار نہ دے، یہاں پر غور طلب بات یہ ہے کہ دعا میں اس جملہ سے پہلے جو ذکر ہوا ہے اس میں خدا سے درخواست ہے کہ ہماری لغزشوں پر مواخذہ نہ کرنا اور ہماری خطاؤں کو درگذر فرما پھر اس کے بعد یہ جملہ ہے ہمیں آفت و بلا کا ہدف قرار نہ دے یعنی کچھ بلائیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نزول بطور آزمائش نہیں، بلکہ گناہوں کی بنا پر ہوتا ہے، دراصل یہ بلائیں بُرے عمل کی سزاؤں کے طور پر نازل ہوتی ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

---

[1] بیست گفتار، شہید مطہریؒ، ص ۱۴۸۔

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَة فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِير﴾[۱]

''اور تم تک جو مصیبت بھی پہنچی ہے وہ تمھارے ہاتھوں کی کمائی ہے اور وہ (اللہ) بہت سی باتوں کو معاف کردیتا ہے''

کبھی بلائیں سزا یا کسی عمل کے ردّ عمل کے طور پر ہوتی ہیں اور کبھی انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ہوتی ہیں تو کبھی امتحان وآزمائش کے لئے ہوتی ہے۔

علمائے اخلاق کا کہنا ہے کہ ہمیں ہمیشہ بلا و مصیبت پر بھی اللہ کا شکر کرنا چاہئے کیونکہ وہ چاہتا تواس سے بھی بدتر بلا نازل کرسکتا تھا، یا پھراس بات پر شکر کرنا چاہیے کہ اس نے اِن بلاؤں کے ذریعہ ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کردیا ورنہ ہم اُسی طرح خواب غفلت میں پڑے رہتے یا یہ سوچ کر اللہ کا شکرادا کرے کہ شاید یہ مصیبتیں آخرت کی بلاؤں میں کمی اور تخفیف کاسبب قرار دینے کے لئے ہیں، لہٰذا بلا و مصیبت میں بھی صبر و شکرسے کام لیں اور راضی بہ رضائے الٰہی رہیں۔

۱۔ سورہ شوریٰ، آیت ۳۰.

پندرھویں تاریخ کی دعا

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی فِیہِ طاعَةَ الْخاشِعِبنَ، وَاشْرَحْ فِیہِ صَدْرِی بِإنابَةِ الْمُخْبِتِینَ، بِأَمانِكَ یَا أَمانَ الْخائِفِینَ

''خدایا آج کے دن خاشعین کی سی اطاعت نصیب فرما اور اس دن میں خدا کی بارگاہ میں عاجز لوگوں جیسی بازگشت کے لئے میرے سینے کو کُشادہ کر دے، اے خوف زدہ لوگوں کی پناہ گاہ''

اہم مطالب:

آج کی دعا میں خداوند کریم کی بارگاہ میں دو اہم چیزوں کی درخواست ہے:

۱۔ خاشعین جیسی اطاعت کی۔

۲۔ اِنابۂ مخبتین کے لئے شرحِ صدر کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی فِیہِ طاعَةَ الْخاشِعِبنَ"

دعا کے مذکورہ فقرہ میں بندہ اپنے رب کی بارگاہ میں خاشعین جیسی اطاعت کا طلبگار ہے، اطاعت یعنی اللہ کے امر و نہی کی پیروی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ خاشعین جیسی اطاعت کی طلب کیوں ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے سب سے پہلے خاشعین کسے کہتے ہیں اور خاشعین کی اطاعت کیسی اطاعت ہوتی ہے اس کا جاننا ضروری ہے۔

خضوع و خشوع

خاشعین، خاشع کی جمع ہے، خاشع، خشوع سے ہے۔

خشوع کے معنیٰ لغت میں تضرع، تواضع اور خضوع کے ہیں، قرآنی اصطلاح میں خشوع کے مفہوم کو علامہ محمد حسین طباطبائی سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۵/ میں ﴿وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ﴾ کے ذیل میں یوں لکھتے ہیں: خشوع یعنی عظمت الٰہی کے مقابل خود کو قلبی طور پر ذلیل و خوار جاننا، خضوع یعنی عظمتِ الٰہی کے پیش نظر ظاہری طور پر بھی اعضاء و جوارح کے ذریعہ اپنے رفتار و عمل کے ذریعہ ذلیل و خوار سمجھنا ہے[۱]

آیۃ اللہ مکارم شیرازی تفسیر نمونہ میں لکھتے ہیں: تکبر، غرور اور حبّ دنیا یہ تمام چیزیں خضوع و خشوع کی ضد ہیں۔[۲]

اللہ کی عظمت اور بزرگی کے پیش نظر خود کو ذلیل و خوار جانتے ہوئے تضرّع و زاری کے ساتھ اطاعت و عبادت الٰہی کا انجام دینا بندۂ مومن کے مضبوط یقین اور ایمان کا ثمرہ ہے، جس قدر معرفت الٰہی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اُسی قدر بندہ میں خضوع و خشوع کا بھی اضافہ ہوگا۔

یاد رکھو جو اس دنیا میں خضوع و خشوع کے ساتھ اللہ کی اطاعت کرنے سے رو گردانی کرے گا وہ قیامت کے دن ذلیل و خوار ہوگا چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے:

۱۔ تفسیر المیزان، علامہ طباطبائی، ج۱۶، ص ۳۱۴.

۲۔ تفسیر نمونہ، آیۃ اللہ مکارم شیزاری، ج۱۷، ص۳۱۱.

﴿وَتَرَاهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا خَاشِعِينَ مِنْ الذُّلِّ يَنْظُرُونَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍ﴾[1]

"اور تم اُنھیں دیکھوگے کہ وہ جہنم کے سامنے پیش کیئے جائیں گے تو ذلت سے ان کے سر جھکے ہوئے ہوں گے اور وہ کَنْ انکھیوں سے دیکھتے بھی جائیں گے"

لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ سبحانہ پر پختہ ایمان و یقین کے ذریعہ خود میں خضوع وخشوع کی حالت کو پیدا کرے تاکہ قیامت کی ذلت وخواری سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔

خضوع وخشوع اور اولیائے الٰہی

خضوع وخشوع انبیاء اور اولیائے الٰہی کی نشانی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو خوف اور خضوع و خشوع الٰہی سے ان چہرہ کا رنگ متغیر اور آواز میں کرب پیدا ہو جاتا تھا۔[2]

اور اسی طرح امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں بھی منقول ہے کہ نماز اور عبادت کے موقعہ پر آپ کا وجود کانپ اٹھتا تھا۔[3]

اسی طرح حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے لئے بھی روایت میں وارد ہوا ہے کہ جب عبادت کے قصد سے محراب میں کھڑی ہوتیں تھیں تو خوف وخشیت الٰہی سے آپ کا جسم مبارک کانپ اٹھتا تھا جسے دیکھ کر خداوند کریم اپنے مقرب فرشتوں سے

۱۔ سورۂ شوریٰ، آیت ۴۵.

۲۔ فلاح السائل، سید بن طاؤس، ص۱۶۱.

۳۔ بحار الانوار، ج۸۴، ص۲۴۸.

کہتا اے فرشتوں دیکھو یہ میری کنیزِ خاص ہے وہ کس طرح میری عبادت انجام دے رہی ہے۔[1]

امام زین العابدین علیہ السلام اور دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کی عبادت کا بھی یہی عالم تھا خضوع و خشوع کی بناپر عبادت میں وہ لذّت حاصل ہو جاتی ہے کہ جس کی بناپر انسان کا دل اور سارا وجود خدا کے لئے خالص ہو جاتا ہے، خدا کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی ہے اسی لئے جب کسی جنگ میں جناب امیر علیہ السلام کے پیر میں تیر لگا تو درد کی وجہ سے وہ کسی کو تیر نکالنے نہیں دے رہے تھے تب رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشورہ دیا کہ جب علی علیہ السلام نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں تب اُن کے پیروں سے تیر نکالنا چنانچہ تیر نکالا گیا مگر خضوع و خشوعِ الٰہی کی لذت کے مقابلہ میں آپ کو پیروں سے تیر نکالنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔[2]

نماز میں خضوع و خشوع

خداوند کریم نے قرآن مجید میں کامیاب مومنین کے خاص اوصاف میں سے ایک صفت یہ بتائی ہے کہ وہ نماز میں خاشع ہوتے ہیں:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ، الَّذِينَ هُمْ فِي صَلاَتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾[3]

''یقیناً وہ صاحبان ایمان کامیاب ہوگئے جو اپنی نمازوں میں خاضع و خاشع ہیں''

---

[1] بحار الانوار، ج۶، ص ۸۳.

[2] بحار الانوار، ج۶، ص ۸۳.

[3] سورۂ مومنون، آیت ۱ او ۲.

مولائے کائنات علی علیہ السلام نے اپنے صحابی کمیل بن زیاد سے خطاب کرکے فرمایا:
اے کمیل!

"لَيسَ الشَّأْنَ أَنْ تُصَلِّيَ وَ تَصُومَ وَ تَتَصَدَّقَ إِنَّمَا الشَّأْنُ أَنْ تَكُونَ الصَّلَاةُ فُعِلَتْ بِقَلْبٍ نَقِيٍّ وَ عَمَلٍ عِنْدَ اللَّهِ مَرْضِيٍّ وَ خُشُوعٍ سَوِيٍّ وَ إِبْقَاءٍ لِلْجِدِّ فِيهَا"[1]

"شانِ عبادت یہ نہیں ہے کہ تم نماز پڑھ لو، روزہ رکھ لو اور صدقہ دیدو، شانِ نماز وعبادت یہ ہے کہ آپ پاک دل اور مرضیٔ الٰہی کے مطابق عمل کے ذریعہ، خضوع وخشوع کے ساتھ اُسے انجام دیں"

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ خضوع وخشوع کا تعلق قلب وروح سے ہے مگر اس کا اثر انسان کے اعضاء وجوارح سے بھی ظاہر ہوتا ہے لہٰذا جن حالات میں انسان خضوع وخشوع کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتا، اُن حالات میں نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے چنانچہ حکم پروردگار ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَقْرَبُوا الصَّلاَةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَي حَتَّي تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾[2]

"اے ایمان والو! نشہ کی حالات میں نماز کے قریب بھی مت جانا جب تک کہ تمھیں یہ ہوش نہ آجائے کہ تم کیا کہہ رہے ہو"

---

[1] بحار الانوار، ج۸۴، ص۲۳۰.
[2] سورۂ نساء، آیت ۴۳.

شرعی حکم یہ ہے کہ انسان جب شراب کے نشہ میں ہو تو نماز نہ پڑھے اور جب اُسے اچھی طرح ہوش آجائے تب طاہر ہو کر نماز ادا کرے، اگرچہ شراب کا نشہ ''سُکر'' کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہے مگر حقیقی نماز کے لئے ضروری ہے کہ انسان ہر طرح کے نشہ سے باہر آئے تاکہ خضوع و خشوع اور خشیتِ الٰہی کے ساتھ عبادتِ الٰہی انجام دے سکے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام امیر المومنین علیہ السلام سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"السُّكْرُ أَرْبَعُ سُكْرَاتٍ سُكْرُ الشَّرَابِ وَ سُكْرُ الْمَالِ وَ سُكْرُ النَّوْمِ وَ سُكْرُ الْمُلْكِ"[1]

''مستی اور نشہ چار طرح کے ہوتے ہیں: ۱۔شراب کا نشہ ۲۔مال و دولت کا نشہ ۳۔نیند کا نشہ ۴۔اقتدار کا نشہ''

اگر انسان کو حقیقی نماز ادا کرنا ہے تو ضروری ہے کہ وہ خضوع و خشوع کے ساتھ ادا کرے یعنی خدا کی بارگاہ میں اس کی عظمت و جلالت کے مقابل خود کو ناچیز اور ذلیل و خوار سمجھے یہ چیز اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ اقتدار، دولت و ثروت، تکبر اور گھمنڈ و.... کے نشہ سے پاک و پاکیزہ نہ ہو، جب تک خدا کے حضور اس کا دل خاشع نہ ہو اس کے اعضاء و جوارح پر اس کا اثر دکھائی نہیں دیتا۔

۱۔ سیری در رسالہ، حقوقیہ امام سجاد علیہ السلام، ص۲۶۶.

روایت میں آیا ہے کہ ایک دن رسول اسلام ﷺ واردِ مسجد ہوئے کیا دیکھا ایک شخص نماز کی حالت میں اپنی داڑھی سے کھیل رہا تھا، آپ نے فرمایا: "أَمَا إِنَّهُ لَوْ خَشَعَ قَلْبُهُ لَخَشَعَتْ جَوَارِحُهُ"[۱] اسے دیکھو اگر اس شخص کا دل خاشع ہوتا تو یقیناً اس کے اعضاء وجوارح بھی خضوع وخشوع کے حامل ہوتے۔

آثارِ خشوع

۱۔ صبر و تحمل

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلاَّ عَلَي الْخَاشِعِينَ﴾[۲]

''صبر اور نماز کے ذریعہ مدد مانگو اور نماز (حضور قلب کے ہمراہ) بہت مشکل ہے سوائے خاشعین کے لئے''

جن کے پیش نظر عظمت الٰہی ہے ان کے لئے نماز پڑھنا سخت نہیں ہے، بلکہ انھیں تو عبادت میں لذت وحلاوت محسوس ہوتی ہے۔

۲۔ کامیابی

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ، الَّذِينَ هُمْ فِي صَلاَتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾[۳]

''یقیناً وہ صاحبان ایمان کامیاب ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں''

۱۔ ماہِ وصال، ماشاء اللہ صدیقی، ص ۲۴۸.

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۴۵.

۳۔ سورۂ مومنون، آیت ۱ و ۲.

۳۔ ہر چیز اس کے مقابل خاضع و خاشع ہو جائے گی

حدیث قدسی میں آیا ہے:

﴿مَا عَرَفَنِي عَبْدٌ وَ خَشَعَ لِي إِلَّا خَشَعَ لَهُ كُلُّ شَيْءٍ﴾[۱]

''کوئی بھی میری معرفت اور میرا خضوع و خشوع کا حامل نہیں ہوگا مگر یہ کہ ہر شئی اس کے لئے خاضع و خاشع ہو جائے گی''

لہٰذا آج کے دن خالق کائنات کی بارگاہ میں ہم یہی دعا کر رہے ہیں کہ خدایا! ہمیں اپنی عظمت سے آگاہ اور اپنی جلالت کو ہماری نگاہوں میں مُجَسّم فرما تاکہ ہمارے قلب و نظر اور اعضا و جوارح تیرے حضور میں خاضع و خاشع ہو جائیں۔

دوسرا فقرہ: "وَاشْرَحْ فِيهِ صَدْرِي بِإِنابَةِ الْمُخْبِتِينَ"

دعا کے اس جملہ میں ''شرح صدر''، ''انابہ'' اور ''مُخْبِتین'' کے معنی و مفہوم کا جاننا ضروری ہے تاکہ دعا کا یہ جملہ پوری طرح واضح ہو جائے۔

شرح صدر

شرح صدر، عرفانی اور اخلاقی مفاہیم میں سے ہے قرآن کریم اور تعلیماتِ اہلبیت علیہم السلام میں اس کی بڑی تاکید ہوئی ہے، درحقیقت شرح صدر، تبلیغِ رسالت کے لئے پیغمبروں کو عطا کردہ نعمت ہے جس کے معنیٰ سینہ کُشادہ ہونے کے ہیں، شرح صدر دراصل کمال اور سعادت تک رسائی کے لئے اور روحی اور معنوی استعداد کے حصول

۱۔ میزان الحکمۃ، مادہ ''خشع''۔

کے لئے کنایہ ہے، ایک مُبلّغ، مدیر، رئیس اور عبادت گذار کے دل کا وسیع اور کشادہ ہونا ضروری ہے یعنی اس میں صبر، تحمل، استقامت، حِلم و بردباری اور خوفِ خدا وغیرہ کا ہونا ضروری ہے اگر یہ تمام صفاتِ حسنہ کسی کے پاس ہوں تو اس کے پاس گویا شرح صدر ہے۔

شرح صدر، آیات وروایات کی روشنی میں

۱۔ شرح صدر، پیغمبروں کا تبلیغی آلہ اور وسیلہ

﴿قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي﴾[۱]

''موسیٰ نے عرض کی اے میرے پروردگار میرے سینے کو کشادہ کردے''

جب جناب موسیٰ علیہ السلام کو ظالم اور سرکش بادشاہ فرعون کی طرف جانے کا حکم ہوا تو اس وقت جناب موسیٰ نے خدا سے دعا مانگی خدایا مجھے شرح صدر عطا کر تاکہ میں اپنی رسالت اور ذمہ داری کو اچھی طرح نبھا سکوں اور اس کے ظلم، سرکشی اور باطل دعووں کی وجہ سے سینہ تنگ نہ ہو۔

۲۔ ذات الٰہی سرچشمۂ شرح صدر

﴿فَمَنْ يُرِدْ اللهُ أَنْ يَهدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلاَمِ﴾[۲]

''پس خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کردیتا ہے''۔

۱۔ سورۂ طٰہٰ، آیت ۲۵.

۲۔ سورۂ انعام، آیت ۱۲۵.

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا جس سینے میں قابلیت اور صلاحیت دیکھتا ہے اُسے کشادگی عطا کرتا ہے اور شرح صدر ایک الٰہی عطیہ ہے اور اس آیۂ کریمہ میں بعد والے جملہ سے یہ بھی واضح ہے کہ شرح صدر کی ضد، ضیقِ صدر ہے یعنی سینے کا تنگ ہونا۔ اللہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی "شرح صدر" کی نعمت سے نوازا ہے چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:

﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾[1]

"(اے رسول) کیا ہم نے آپ کے سینے کو کُشادہ نہیں کیا"

یہاں پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ "شرح صدر" کے مراتب اور درجات ہیں اور اس کے اعلیٰ ترین درجہ پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلبیت علیہم السلام فائز ہیں۔

شرح صدر، خاصان خدا کی نشانی

حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

"إِنَ الْعَبْدَ إِذَا اخْتَارَهُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ لِأُمُورِ عِبَادِهِ شَرَحَ صَدْرَهُ لِذَلِك"[2]

"یقیناً اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کو اپنے بندوں کے امور کی اصلاح کے لئے چُن لیتا ہے تو اسے شرح صدر عطا کرتا ہے"

پس شرح صدر ایک نعمت الٰہی ہے خدا جسے اس کے لائق دیکھتا ہے اُسے عطا کرتا ہے۔

---

[1] سورۂ شرح، آیت ۱

[2] امالی، شیخ صدوق، ص ۶۸۰.

اِنابہ کیا ہے؟

"انابہ" مادۂ "نوب" سے ہے جس کے معنیٰ "الرجوع بالتوبة و اخلاص العمل" اللہ کی طرف بازگشت، توبہ اور اخلاصِ عمل کے ذریعہ چنانچہ قرآن کریم میں وارد ہے:

﴿مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلاَةَ وَلاَ تَكُونُوا مِنْ الْمُشْرِكِينَ﴾[1]

"تم اپنی توجہ خدا کی طرف رکھو اور اسی سے ڈرتے رہو، نماز قائم کرو اور خبردار مشرکین میں سے نہ ہو جانا"

﴿وَأَنِيبُوا إِلَي رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ مِنْ قَبْل أَنْ يَأْتِيَكُمْ الْعَذَابُ ثُمَّ لاَ تُنْصَرُونَ﴾[2]

"اور تم سب اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اس کے لئے سراپا تسلیم ہو جاؤ قبل اس کے کہ تم تک عذاب آجائے تو پھر تمھاری مدد نہیں کی جا سکتی ہے"

﴿رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾[3]

"خدایا ہم نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور تیری ہی طرف بازگشت بھی ہے"

۱۔ سورۂ روم، آیت ۳۱.
۲۔ سورۂ زمر، ص ۵۳.
۳۔ سورۂ ممتحنہ، آیت ۴.

ان آیات کریمہ کی روشنی میں "انابہ" کا مفہوم واضح اورروشن ہوگیا ہے کہ "انابہ" یعنی توبہ واستغفار کے ذریعہ خدا کی بارگاہ سے رجوع کرنا ہےاور یہ مومنین و متقین کی صفت ہے۔

"مُخبتین" کون ہیں؟

"مُخبتین" "اِخبات" سے ہے جس کا مادہ "خبت" ہے جس کے معنیٰ اطمینان اور تواضع کے ہیں۔[1]

چنانچہ قرآن کریم میں آیا ہے:

﴿وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ﴾[2]

"اور اس لئے بھی صاحبانِ علم کو معلوم ہوجائے کہ یہ (وحی، قرآن) تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے پس وہ اس طرح ایمان لئے آئیں پھر ان کے دل اللہ کے لئے عاجزی کا اظہار کریں"

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَي رَبِّهِمْ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾[3]

---

[1]۔ مفردات راغب، مادۂ خبث

[2]۔ سورۂ حج، آیت ۵۴.

[3]۔ سورۂ ہود، آیت ۲۳.

"یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے اور اپنے رب کی بارگاہ میں تواضع اور انکساری سے پیش آئے وہی جنت کے حقدار ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں"

ان آیات کریمہ کی روشنی میں واضح ہے کہ "مخبتین" خدا کی بارگاہ میں ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ خود کو عاجزی، تواضع اور انکساری کے ساتھ پیش کرنے والے لوگ ہیں، ان کا مقام آخرت میں جنت ہے گویا اخبات (خدا کی بارگاہ میں تواضع اور عاجزی) انسان کو بہشت نصیب کرتی ہے۔

تواضع کی علامتیں

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

"مِنَ التَّوَاضُعِ أَنْ تَرْضی بِالْمَجْلِسِ دُونَ الْمَجْلِسِ، وَ أَنْ تُسَلِّمَ عَلی مَنْ تَلْقی، وَ أَنْ تَتْرُكَ الْمِرَاءَ وَ إِنْ كُنْتَ مُحِقّاً، وَ لَاتُحِبَّ أَنْ تُحْمَدَ عَلَی التَّقْوی"[1]

تواضع اور انکساری کی نشانیوں میں سے یہ ہیں:

۱۔ مجلس اور نشست میں نچلے اور کمترین جگہ پر بیٹھنے پر راضی ہو جانا

۲۔ جس سے بھی ملاقات ہو جائے اس کو سلام کرنا

۳۔ لڑائی جھگڑا نہ کرنا اگرچہ حق پر ہی کیوں نہ ہو

۴۔ اپنے نیک اور متقی ہونے کی تعریف کو پسند نہ کرنا۔

---

[1] اصول کافی، ج۴، ص۳۶۷.

اگر کوئی متواضع اور مُحبت ہونا چاہتا ہے تو اُسے امام معصومؑ کے اس قول زرین کے ذریعہ اپنے کردار کو سنوارنا چاہئے اور امامؑ کے اس قول کو آئینہ بنا کر اپنے وجود کو دیکھنا چاہئے کہ آیا مجھ میں یہ صفات موجود ہیں کہ نہیں؟۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے تواضع کی مثال

ایک دن دو آدمی جو آپس میں باپ بیٹا تھے مولا کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولا نے ان دونوں کو اپنے گھر میں صدرِ مجلس میں جگہ دی اور خود ان کے سامنے بیٹھ گئے، قنبر کو دستر خوان چُننے کا حکم دیا، جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تب امامؑ نے ہاتھ دھونے کے لئے طشت اور لوٹا لانے کا حکم دیا، قنبر جب لے کر حاضر ہوئے تو امامؑ نے قنبر سے طشت اور لوٹے کو لے لیا اور اُن دونوں کو ہاتھ دُھلانے کے لئے خود بڑھ گئے، یہ دیکھ کر وہ دونوں کھڑے ہو گئے اور کہا: آقا! یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ہمیں ہاتھ دُھلائیں؟ امامؑ نے فرمایا: آپ دونوں اپنی جگہ بیٹھ جائیں میں اس خدمت کا اجر خدا سے لوں گا اور تمہیں قسم ہے اگر تمہیں کوئی غلام ہاتھ دُھلاتا تو تم جس طرح اس کے ذریعہ ہاتھ دھوتے بالکل اُسی طرح مجھ سے بھی ہاتھ دُھلنا۔[1]

یہ واقعہ ہمارے لئے بہترین نصیحت ہے کہ ہم ہمیشہ دوسروں کے سامنے انکساری سے پیش آئیں، خدا تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے، تواضع خاصان خدا اور محمدؐ و آل محمدؐ کی سیرت ہے اگر ہمیں اُن سے محبت کا دعویٰ ہے تو پھر یہ بھی غور کریں کیا ہم میں اُن کی یہ صفت موجود ہے یا نہیں؟

---

[1]۔ شہر رمضان، ج۱، ص ۳۱۴.

خلاصہ یہ ہے کہ آج کی دعا میں بندہ اپنے پروردگار سے درخواست کر رہا ہے کہ خدایا! ''انابہ مُخبتین'' کے لئے یعنی انکساری اور عاجزی کے ساتھ تیری بارگاہ میں لوٹنے کے لئے تجھ سے شرح صدر یعنی سینے کی کشادگی کی درخواست کر رہا ہوں، اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ خدا کی بارگاہ میں تواضع اور انکساری، شرح صدر کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔

سولہویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنی فِیهِ لِمُوافَقَةِ الْاَ بْرارِ، وَجَنِّبْنی فِیهِ مُرافَقَةَ الْاَشْرارِ وَآوِنی فِیهِ بِرَحْمَتِكَ إلی دارِ الْقَرارِ، بِإلٰهِیَّتِكَ یَا إلٰهَ الْعالَمِینَ».

''خدایا مجھ کو اس دن میں نیک بندوں کی دوستی اور صحبت کی توفیق عطا فرما اور بدکاروں کی رفاقت سے مجھ کو دور رکھ اور اس دن میں مجھ کو اپنی رحمت سے جنّت الفردوس میں آرام کی جگہ عطا فرما تجھے تیری اُلوہیت کا واسطہ اے دو جہاں کے معبود''

اہم مطالب:

اس دعا میں بندہ اپنے خالق سے تین چیزوں کی درخواست کر رہا ہے:

۱۔ نیک بندوں کی دوستی وصحبت کی توفیق کی۔

۲۔ بُرے لوگوں کی رفاقت سے دوری کی۔

۳۔ اپنے لئے بہشت میں مقام کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِی فِیهِ لِمُوافَقَةِ الْاَ بْرارِ"

لغت میں ''بِر'' (زیر کے ساتھ) ہر نیک کام کو کہتے ہیں اور اس کا اطلاق تمام واجبات، مستحبات اور ہر قسم کی اطاعت و عبادت پر ہوتا ہے اور اس کی جمع ''ابرار'' اور ''بَرَرَہ'' ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہر نیکی اور خیر کو ''بِر'' کہا جاتا ہے اور نیکی کرنے والے کو ''بَر'' (زبر کے ساتھ) یا ''بار'' کہتے ہیں ''بَر'' کی جمع بھی ''ابرار'' ہے۔[1]

مذکورہ دعا میں ابرار سے مراد نیک امور انجام دینے والے افراد ہیں، اگر ہمیں اپنے عمل، فکر اور ارادہ کو ''ابرار'' کے مطابق و موافق کرنا ہے تو سب سے پہلے ''ابرار'' کی شناخت اور ان کی معرفت ضروری ہے اور ''ابرار'' کے کامل ترین مصداق انبیائے کرام اور ائمہ اہلبیت علیہم السلام ہیں اور ان کی کماحقّہ معرفت عام انسان کی عقل و خرد سے بالا ہے، لہٰذا باطنی اور ظاہری طہارت کی بناپر ہماری فکر جتنی بلند ہوگی مقام ابرار کا ادراک بھی اسی حد تک ممکن ہے۔

موافقت

لغت میں ''موافقہ'' سے مراد دو چیز یا دو آدمی کا ایک جگہ جمع ہونا[2]۔ رائے اور اردہ کے مطابق، عمل اور رفتار و کردار کے مطابق دو آدمیوں یا دو گروہوں یا دو چیزوں کا ایک ہونا ہے ان مذکورہ صفات میں اتفاق ہو تو گویا دونوں میں موافقت پائی جاتی ہے،

---

[1]۔ صبح رضوان، ذبیح اللہ، ج ۳، ص ۳۸.

[2]۔ کتاب العین، ج ۵، ص ۲۲۶.

اگرچہ زمان و مکان کے لحاظ سے ایک دوسرے سے دور ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن کریم میں ﴿وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ سے مراد "موافقة الابرار" ہی ہے۔

اس وضاحت کے بعد یہ بات روشن ہو چکی ہے کہ مقامِ ابرار تک رسائی اور ان کی موافقت و معیت کے لئے صرف اُن کے ہمراہ اٹھنا، بیٹھنا کافی نہیں ہے، بلکہ فکر و عمل میں بھی ہمراہی ضروری ہے ورنہ زمانۂ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو آپ کے ہمراہ رہتے تھے مگر فکر و عمل کے اعتبار سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت دور تھے۔

ابو نصر بزنطی کا امام رضا علیہ السلام کی ہمراہی پر افتخار کرنا اور امام کی نصیحت

احمد بن ابو نصر بزنطی، امام علی رضا علیہ السلام کے خاص صحابیوں میں سے تھے جن سے متعدد احادیث امام رضا علیہ السلام سے منقول ہیں، جو اپنے دور کے بڑے عالم تھے، ایک دن خراسان میں ابو نصر نے امام علیہ السلام سے خواہش کی کہ آقا میں چاہتا ہوں کہ ایسے وقت میں آپ کے گھر آؤں جب کوئی نہ ہو اور حکومت کی طرف سے بھی آپ کو کوئی پریشانی نہ ہو، تاکہ میں آپ سے کچھ اہم سوالات کر سکوں، امام علیہ السلام نے فرمایا: ٹھیک ہے مناسب موقعہ پر میں خود تمہیں بلالوں گا۔ اس کے چند دن بعد، نصف شب کے قریب امامؑ نے اپنے غلام کے ہمراہ اپنی مخصوص سواری کو ابو نصر کے گھر بھیج کر اپنے گھر بلوایا، بہت دیر تک سوال و جواب کا سلسلہ چلتا رہا، جب گفتگو تمام ہو گئی، ابو نصر اجازت لے کر اپنے گھر واپس جانا چاہتے تھے تو امامؑ نے فرمایا: اے ابو نصر! رات کافی ہو چکی ہے لوگ سو چکے ہیں اب کہاں گھر جاؤ گے؟ میرے پاس ہی رک جاؤ۔

یہ سن کر ابو نصر خوش ہو گئے، امامؑ نے غلام کو حکم دیا ابو نصر کے لئے میرا مخصوص بستر لگا دینا، یہ میرے خاص مہمان ہیں ابو نصر نے مولا کے بستر پر بیٹھ کر کہا: آقا میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ اس وقت دینا میں مجھ سے بڑا کوئی سعادتمند نہیں ہوگا کیونکہ امامؑ نے خود مجھے اپنی مخصوص سواری بھیج کر اپنے گھر دعوت دی اور تنہا میرے لئے وقت نکالا اور اپنے مخصوص بستر پر مجھے آرام کرنے کا شرف بخشا، یہ سن کر امام رضاعلیہ السلام نے فرمایا: اے بزنطی! ان چیزوں کو تم کبھی بھی اپنے افتخار کا سبب مت سمجھو اور اس بات کو لے کر کبھی بھی دوسروں پر خود کو افضل نہ جاننا؛ کیونکہ صعصہ بن صوحان میرے جد امجد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب خاص میں سے تھے جب وہ بیمار ہوئے تو حضرت علی علیہ السلام خود بنفسِ نفیس صعصہ بن صوحان کی عیادت کو ان کے گھر گئے، لہٰذا ان چیزوں کو اپنے باکمال ہونے کی دلیل نہ بناؤ، یہ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا یہ میرا اخلاقی اور شرعی فریضہ تھا جسے میں نے انجام دیا ہے۔[1]

یہ واقعہ دَور حاضر میں ہمارے لئے بہترین درس ہے؛ کیونکہ بعض لوگوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ وہ یہ افتخار کرتے نظر آتے ہیں کہ میں نے دس مرتبہ کربلا کی زیارت کی ہے، میں نے بیس مرتبہ زیارت کی یقیناً زیارت، ایک عظیم شرف ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا مگر یہ کہ اس کی زیارت حقیقی زیارت ہو، جس کے لئے ضروری ہے کہ جس امامعلیہ السلام کے روضہ کی زیارت کرکے ہم نازاں ہیں، ایمان و عمل اور رفتار و

---

[1] تحفۃ الواعظین، ج ۴، ص ۳۲.

کردار میں بھی ان کا مطیعِ محض بن جائے تاکہ "موافقہ الابرار" کی بولتی تصویر ہوسکے۔

ابرار کا مقام و منزلت قرآن کریم کی روشنی میں

۱. ﴿وَمَا عِنْدَ اللهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ﴾[۱]

"اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے سب نیک افراد کے لئے خیر ہی خیر ہے"

۲. ﴿إِنَّ الأَبْرَارَ لَفِي نَعِيم، عَلَي الأَرَائِكِ يَنظُرُونَ﴾[۲]

"بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے، تختوں پر بیٹھے ہوئے نظارے کررہے ہوں گے"

۳. ﴿إِنَّ الأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْس كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوراً﴾[۳]

"یقیناً نیک بندے اس پیالہ سے پئیں گے جس میں شراب کے ساتھ کافور کی آمیزش ہوگی"

ان کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جن میں دنیا وآخرت میں ابرار کے مقام و منزلت کا ذکر ہے۔

۱۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۹۸.

۲۔ سورۂ مطففین، آیت ۲۲و۲۳.

۳۔ سورۂ دہر، آیت ۵.

"بر" و نیکی کی برکاتیں

۱۔ طول عمر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَا يَزِيدُ فِي الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ"[۱]

"عمر میں زیادتی نہ ہوتی مگر نیکی سے"

۲۔ وسعت رزق

"إنّ البرّ و الصّلة يستطيلان الأعمار"[۲]

"نیکی اور صلہ رحم عمروں کو طویل کرتے ہیں"

۳۔ فقر و فاقہ کی دوری

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"الْبِرُّ وَ صَدَقَةُ السِّرِّ يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ"[۳]

"نیکی اور پوشیدہ صدقہ، فقر کو دور کرتے ہیں"

ابرار (نیک افراد) کی نشانیاں

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روایت میں ابرار کی دس نشانیوں کا ذکر فرمایا:

۱۔ میزان الحکمۃ، مادہ "بر"

۲۔ نہج الفصاحۃ، (اقوال پیغمبر)، ص۲۷۶.

۳۔ بحار الانوار، ۷۱، ص۸۱.

" عَلَامةُ البَار فَعَشرَةٌ يُحِبُّ فِي اللَّهِ وَ يُبْغِضُ فِي اللَّهِ وَ يُصَاحِبُ فِي اللَّهِ وَ يُفَارِقُ فِي اللَّهِ وَ يَغْضَبُ فِي اللَّهِ وَ يَرْضَى فِي اللَّهِ وَ يَعْمَلُ لِلَّهِ وَ يَطْلُبُ إِلَيْهِ وَ يَخْشَعُ لِلَّهِ خَائِفاً مَخُوفاً طَاهِراً مُخْلِصاً مُسْتَحِيِياً مُرَاقِباً وَ يُحسِنُ فِي الله"[۱]

نیک انسان کی دس علامتیں ہیں:

۱۔ دوستی اور محبت صرف خدا کے لئے کرتا ہے۔

۲۔ دشمنی اور عناد بھی صرف خدا کے لئے کرتا ہے۔

۳۔ کسی کے ساتھ نشست و برخاست بھی خدا کے لئے۔

۴۔ کسی سے دوری بھی خدا کے لئے۔

۵۔ کسی سے ناراضگی بھی خدا کے لئے۔

۶۔ کسی سے رضایت بھی خدا کی مرضی کے لئے۔

۷۔ کوئی بھی کام صرف خدا کی قربت کے لئے کرتا ہے۔

۸۔ اور وہ ہمیشہ خدا کی تلاش میں رہتا ہے۔

۹۔ خدا کے سامنے متواضع، خوفزدہ، ہراساں، پاک، مخلص، باحیا اور اپنے نفس کا محافظ ہوتا ہے۔

۱۰۔ اور صرف خدا کے لئے نیکی انجام دیتا ہے۔

۱۔ تحف العقول، ص۲۱؛ میزان الحکمۃ، مادۂ بر.

جن میں یہ صفات ہوں وہی افراد "ابرار" ہیں اور اہلبیت علیہم السلام اس حدیث کے کامل ترین مصداق ہیں، لہٰذا امام حسن علیہ السلام نے فرمایا:

"كل ما في كتاب الله عز و جل من قوله: ﴿إِنَ الْأَبْرارَ﴾ فو الله ما أراد به الا على بن أبى طالب و فاطمة و انا و الحسين عليهم السلام"[1]

"قرآن کریم میں جہاں بھی "انّ الابرار" آیا ہے خدا کی قسم اس سے خدا کی مراد، حضرت علی، حضرت فاطمہ، میں اور حسین علیہم السلام ہیں"

آج خدا سے ہماری یہی دعا ہے کہ خدایا! ہمیں محمد وآل محمد علیہم السلام کے ہمراہ محشور فرما۔

دوسرا فقرہ: "وَجَنِّبْنی فِیهِ مُرافَقَةَ الْاَشْرارِ"

دعا کے اس فقرہ میں "وَجَنِّبِنی" مادۂ "جنب" سے ہے جس کے معنیٰ پہلو نشین اور ساتھی کے ہیں جیسا کہ آیۂ کریمہ میں آیا ہے: ﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾[2] یعنی "پہلو نشین مسافر"۔ مگر "جنب" جب باب تفعیل میں آتا ہے تو بر عکس معنیٰ دیتا ہے یعنی دوری اور اجتناب برتنے کے معنیٰ دیتا ہے۔ یہاں پر "وَجَنِّبِنی" باب تفعیل سے صیغۂ امر ہے لہٰذا اس کے معنیٰ "مجھ کو دور رکھ" کے ہیں اور مرافقت: رفاقت و دوستی کو کہتے ہیں۔[3]

۱۔ تفسیر نور الثقلین، ج۵، ص ۵۳۳، ح ۳۳؛ مناقب آل ابی طالب علیہم السلام، ابن شہر آشوب، ج۴، ص: ۲.

۲۔ سورۂ نساء، آیت ۳۶.

۳۔ صبح رضوان، ج۳، ص ۴۵.

اشرار

"اشرار" شریر کی جمع ہے اور شریر صاحبِ شر کو کہتے ہیں، خیر و شر سے متعلق مکمل گفتگو تیسری تاریخ کی دعا میں "وَ اجْعَلْ لِي نَصِيباً مِنْ كُل خَيْرٍ تُنْزِلُ فِيه" کے جملہ کے ذیل میں گذر چکی ہے۔

اشرار کی ضد اخیار اور ابرار ہیں، مذکورہ دعا کے پہلے حصہ میں خدا سے ابرار سے رفاقت کی توفیق کی درخواست ہے گویا یہی "تولا" ہے اور دوسرے حصہ میں "ابرار" کی مخالفت اور دشمنی یعنی "اشرار" سے دور رکھنے کی درخواست ہے حقیقت میں یہی "تبرا" ہے۔

اشرار کو سمجھنے کے لئے نقطۂ مقابل کو جاننا ضروری ہے، اگر آپ نے اخیار اور ابرار کے مصادیق کو جان لیا تو پھر جو اُن کے مقابلہ میں ہیں، انھیں بھی جانا جا سکتا ہے۔

شہید مطہریؒ لکھتے ہیں: "اگر نیکیوں اور برائیوں کے درمیان تقابل نہ ہوتا تو نہ نیکی، نیکی کہلاتی اور نہ برائی، برائی کہلاتی؛ کیونکہ ہر چیز اپنے نقطۂ مقابل سے پہچانی جاتی ہے"[1]۔ اسی لئے خالق کائنات قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ﴾[2] "ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور ہم تو اچھائی اور برائی کے ذریعہ تم سب کو آزمائیں گے اور تم سب پلٹ کر ہماری بارگاہ میں ہی لائے جاؤگے"۔

---

[1] عدل الٰہی، ص ۱۶۵.

[2] سورۂ انبیاء، آیت ۳۵.

شر کبھی آیات قرآنی میں ضرر کے معنی میں آیا ہے مثلًا ﴿وَعَسَي أنْ تُحِبُّوا شَيْئاً وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ﴾[1] ''اور جسے تم دوست رکھتے ہو وہ تمھارے حق میں ضرر ہو'' اور کبھی شر، بُرا اور قبیح کے معنیٰ میں بھی آیا ہے جیسے ﴿أنْتُمْ شَرٌّ مَكَاناً﴾[2] ''تم بڑے بُرے لوگ ہو''۔ لہٰذا شریر یعنی، مُضر، مفسِد، ظالم اور جس میں ہر کسی قسم کی بُرائی ہو۔

اشرار کی علامتیں

۱۔ ظلم و ستم کے پیشوا

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"وَ إنَّ شَرَّ النَّاس عِنْدَ اللَّهِ إمَامٌ جَائِرٌ ضَلَّ وَ ضُلَّ بِهِ فَأمَاتَ سُنَّةً مَأْخُوذَةً وَ أحْيَا بِدْعَةً مَتْرُوكَةً"[3]

''یقیناً لوگوں میں بدترین شخص وہ ہے جو اللہ کی نظر میں ظلم و ستم کا پیشوا ہو، گمراہ ہو اور جس سے گمراہی پھیلتی ہو اور جس نے موجودہ سنت کو ختم اور متروکہ بدعت کو زندہ کیا ہو''

۲۔ دنیا کے عوض آخرت کو بیچنے والا

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"يَا عَلِيُّ شَرُّ النَّاس مَنْ بَاعَ آخِرَتَهُ بِدُنْيَاهُ"[1]

۱۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۱۶.

۲۔ سورۂ یوسف، آیت ۷۷.

۳۔ الحیاۃ، ج ۶، ص ۵۱۲.

"اے علی! بدترین شخص وہ ہے جس نے اپنی آخرت کو دنیا کے عوض بیچ دیا"[1]

۳۔ظالم کی مدد کرنے والا

مولائے کائنات ارشاد فرماتے ہیں:

"شَرُّ النَّاسِ مَنْ يُعِينُ عَلَى الْمَظْلُومِ"[2]

"بدترین شخص وہ ہے جو مظلوم کے خلاف ظالم کی مدد کرتا ہے"

۴۔ منافق

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"إِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذَا الْوَجْهَيْنِ"[3]

"بدترین شخص قیامت کے دن اللہ کی نظر میں وہ ہے جس کے دو چہرے ہوں"

ان کے علاوہ اور بھی روایات ہیں جن میں اشرار کے اوصاف کو بیان کیا گیا ہے جیسے خائن، عالمِ سوء، وغیرہ وغیرہ۔

اشرار سے دوستی کا نتیجہ

۱۔ تباہی وبربادی

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام ارشادفرماتے ہیں:

---

[1] ۔بحارالانوار، ج۷۴، ص۴۶.

[2] ۔غررالحکم، ص۴۵۶.

[3] ۔بحارالانوار، ج۷۲، ص۲۰۷.

"مُصَاحَبَةُ الْأَشْرَارِ تُوجِبُ التَّلَفَ"[1]

''اشرار کی دوستی تباہی کا سبب ہے''

جس کا دوست بُرا ہوگا یقیناً اس انسان کی دنیا و آخرت دونوں برباد ہے، ممکن ہے دنیا میں ظاہری فائدہ تو حاصل ہو جائے مگر یقینی طور پر اس کی آخرت برباد ہے، ایسے لوگ قیامت کے دن میدانِ محشر میں اپنی دوستی پر کفِ افسوس ملیں گے ﴿يَا وَيْلَتِي لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا﴾[2] ''ہائے افسوس، کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا''۔ لہٰذا کسی سے دوستی کرنے سے پہلے اس کے انجام کار کو دیکھئے، ہاں یہ اور بات ہے کہ اگر کوئی بروں کو راہِ راست پر لانے کی غرض سے دوستی کرے تو اُسے چاہئے کہ وہ خود پوری طرح علم و عمل سے آراستہ ہو پھر حجت تمام کرنے کی حد تک اس کے ہمراہ رہے۔ اگر آپ کی صحبت سے وہ سدھر جائے تو اس کا ثواب آپ کو بھی ملے گا اور اگر وہ راہِ راست پر نہ آیا تو پھر اتمام حجت کے بعد اس کے ہمراہ نہ رہے، بلکہ اس سے دوری اختیار کرے، ورنہ اس کی بُرائیوں میں آپ کی بھی شرکت ہو جائے گی اور آہستہ آہستہ اس کا رنگ آپ کے وجود پر بھی چڑھنے لگے گا چنانچہ مولائے کائنات کا ارشاد گرامی ہے۔

" مُصَاحَبَةُ الْأَشْرَارِ تُوجِبُ سوء الظن بالاخيار"[3]

''بُروں کی دوستی نیک لوگوں سے سوءِ ظن کا باعث بنتی ہے''

---

[1] ۔ غرر الحکم، ص ۴۳۲.

[2] ۔ سورۂ فرقان، آیت ۲۸.

[3] ۔ غرر الحکم، ص ۱۳۸.

ہم نے اپنے معاشرہ میں یہ مشاہدہ کیا ہے کہ کچھ لوگ، کچھ عالم نما، دنیا پرست جاہلوں کی بزم میں بیٹھ کر اولیائے الٰہی، مراجع تقلید، علماء اور خاصان خدا کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں اوراس طرح اپنی آخرت کو برباد کرلیتے ہیں۔

لہٰذا آج کے دن یہی دعا ہے کہ خدایا! ہمیں بُروں کی صحبت سے دور رکھ۔

تیسرا فقرہ: "وَآوِنی فِیهِ بِرَحْمَتِكَ إلی دارِ الْقَرارِ"

"آونی" عربی لغت میں "اُون" سے ہے جس کے معنٰی آرامش و اطمینان کے ہیں، یہ کلمہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی تکلیف دہ چیز آپ کی سدّ راہ نہ ہو اور آپ کے لئے آرام ہی آرام ہو۔[1]

رحمت، اللہ کے لطف و کرم اور اس کی محبت و عطوفت کو کہتے ہیں، رحمت کی ضد لعنت ہے، لعنت یعنی اللہ کی رحمت سے دوری، لہٰذا انسان یا مرحوم ہوتا ہے یا پھر ملعون، مرحوم کے معنٰی صرف مرنے والے کے نہیں ہے، بلکہ مرنے والا اگر رحمتِ الٰہی کا حامل ہوگا تو اُسے مرحوم کہا جاتا ہے، چونکہ ہم اہلبیت علیہم السلام کے چاہنے والوں پر اللہ کا خاص لطف و کرم ہے لہٰذا ہم اپنے مرنے والوں کو مرحوم کہتے ہیں۔

"دارالقرار" قرار یعنی ثبات، پائیداری چنانچہ قرآن کریم میں آیا ہے: ﴿وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ﴾[2] "اور یقیناً آخرت ہی دائمی رہنے کی جگہ ہے"۔

---

[1] لسان العرب، ج ۱۳، ص ۳۸.

[2] سورۂ غافر، ۳۹.

ان الفاظ کی تشریح کے بعد دعا کے اس جملہ کا مفہوم یہ ہے خدایا مجھے اس دن اپنی رحمت و عطوفت کے ذریعہ قرار وسکون کی جگہ میں مجھے آرام وسکون عطا فرما۔

یقیناً دنیا ''دار القرار'' نہیں ہے، بلکہ یہ ''دار الفرار'' ہے ہر کسی کو یہاں سے گذر جانا ہے یہ بات سب جانتے ہیں کہ یہ دنیا رکنے کی جگہ نہیں، بلکہ ''دار البقا'' اور ''دار القرار'' وہ مقام ہے جہاں ہمیں ہمیشہ رہنا ہے مگر پھر بھی ہم لوگ وہاں رہنے کے بجائے یہاں رہنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ آخرت اچھے اور بُرے ہر ایک کے لئے ''دار القرار'' ہے مگر اللہ کی رحمت کے ذریعہ جو ''دار القرار'' نصیب ہوگی وہ جنت ہے اور بُروں کو اللہ کی غضب کے ذریعہ جو ''دار القرار'' نصیب ہوگی وہ جہنم ہے، چنانچہ قرآن کریم میں کفرانِ نعمت کرنے والوں کے آخرت کے ٹھکانہ سے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾[1] ''وہ جہنم جس میں یہ سب واصل ہوں گے اور وہ بدترین جائے قرار ہے''۔

لہٰذا ہمیں اس دنیا میں اُن امور کو انجام دینے کی ضرورت ہے جن سے اللہ کی رحمت ہمارے شامل حال ہو، قیامت میں اللہ کی رحمت جن پر سایہ فگن ہوگی اُسی کو جنتِ دار القرار میں سکون واطمینان حاصل ہوگا۔

آج کی دعا میں، اخیار اور ابرار کی صحبت اور معیت کے علاوہ اشرار سے دوری کی التجا ہے اگر یہ توفیقات ہمیں حاصل ہو جائیں تو پھر اس کے لئے آخرت میں دار القرار کی شکل میں جنّت نصیب ہوگی انشاء اللہ۔

---

[1] سورۂ ابراہیم، آیت، ۲۹.

سترہویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ اهْدِنی فِیهِ لِصالِحِ الْاَعْمالِ، واقْضِ لِی فِیهِ الْحَوائِجَ وَالأَمالَ یَا مَنْ لا یَحْتاجُ إلَی التَّفْسِیرِ وَالسُّؤالِ، یَا عالِماً بِما فِی صُدُورِ الْعالَمِینَ، صَلِّ عَلَی مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِینَ».

خدایا! اس دن مجھے نیک اعمال بجالانے کی ہدایت فرمااور اس میں میری حاجتوں اور امیدوں کو برلا، اے وہ ذات جو سوال کرنے اور تشریح کرنے کی محتاج نہیں، اے وہ خدا جو دو عالم کے سینوں میں پوشیدہ رازوں کو جاننے والا ہے، درود و سلام نازل فرما محمدؐ اور آپ کی پاکیزہ آل پر"

اہم مطالب:

آج اس دعا میں بارگاہ الٰہی میں دو اہم چیزوں کی درخواست ہے:

۱۔ اعمالِ صالحہ کے بجالانے کے لئے ہدایت

۲۔ حاجتوں اور امیدوں کی برآوری

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ اهْدِنى فِيهِ لِصالِحِ الْاَعْمالِ"

انسان کو سعادت مند ہونے اور آخرت میں جنت کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے: ا۔ایمان ۲۔ عمل صالح، انسان ان دو پروں کے ذریعہ عروج حاصل کرتا ہے اور لقائے معبود کی چوکھٹ تک پہونچتا ہے اور وہ انسان گھاٹے میں ہے جس کے پاس یہ دو چیزیں نہیں ہیں، قرآن کریم میں سورۂ عصر کے علاوہ متعدد آیتیں اس بات کی گواہ ہیں، لہٰذا آج کی دعا میں ایمان کی دولت سے سرفراز بندۂ مومن، خدا کی بارگاہ میں التجا کر رہا ہے کہ خدایا! مجھے نیک اعمال انجام دینے کی طرف ہدایت فرما، سوال یہ ہے کہ کیا نیک عمل کی انجام دہی کے لئے ہدایت کی ضرورت ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہدایت سے متعلق مختصر گفتگو کی ضرورت ہے۔

ہدایت اور اس کے اقسام

اگرچہ ہدایت اور اس کے اقسام سے متعلق نویں تاریخ کی دعا کے "وَ اهْدِني فِيهِ لِبَراهِينِكَ السَّاطِعَة" کے ذیل میں کافی حد تک گفتگو ہو چکی ہے، لہٰذا یہاں پر ذکر شدہ سوال کے پیش نظر مختصر وضاحت کی جائے گی۔

ہدایت، صحیح سمت کی طرف رہبری اور رہنمائی کو کہتے ہیں، کلی طور پر ہدایت کی دو قسمیں ہیں: ا۔ہدایت تکوینی ۲۔ہدایت تشریعی۔

ا۔ ہدایتِ تکوینی

ہدایت کی اس قسم سے عالمِ ہستی کی کوئی بھی چیز مستثنیٰ نہیں ہے خدا کے قانونی نظام کے تحت ہر شئ فطری طور پر ہدایت شدہ ہے اسی لئے ہر شئ اپنا فریضہ نبھارہی ہے، سورج کا اپنے طور پر نکلنا اور ڈوبنا، ہواؤں کا چلنا، شب و روز کی آمد و رفت، موسموں کی تبدیلی، باغات میں پھل پھول کی پیداوار، یہ تمام چیزیں خدا کے قانونی نظام کے تحت ہدایت شدہ ہونے کی روشن دلیلیں ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ربّ العزت ہورہاہے:

﴿قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَي كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَي﴾[1]

"(موسیٰ نے) کہا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شئ کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے"

۲۔ ہدایتِ تشریعی

ہدایت تکوینی میں تمام اختیارات خدا کے ہاتھ میں ہیں، بندہ کو انتخاب کا حق حاصل نہیں ہے، مگر ہدات تشریعی میں خالق کائنات بندوں کو اپنے احکام کے ذریعہ ہدایت تو کرتا ہے کہ تمہیں ان چیزوں پر عمل کرنا ہے اور ان چیزوں سے رُک جانا ہے مگر انتخاب کا اختیار خود بندہ کے سپرد کردیتا ہے:

﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً﴾[2]

---

[1]۔ سورۂ طٰہٰ، آیت ۵۰.

[2]۔ سورۂ انسان، آیت ۳.

"یقیناً ہم نے انسان کو راستہ کی ہدایت دیدی ہے چاہے وہ شکر گذار ہو جائے یا کفر اختیار کرلے"

اس ہدایتِ تشریعی کے فریضہ کو انبیاء اور ائمہ معصومین علیہم السلام نے آسمانی کتابوں کی تعلیمات کے ذریعہ انجام دیا ہے اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے:

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا﴾[1]

"اور ہم نے اِن کو پیشوا اور امام قرار دیا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں"

ان دونوں ہدایتوں میں امتیازی فرق یہ ہے کہ ہدایتِ تکوینی مقام "کن فیکون" ہے یعنی اللہ کے ایک ارادہ سے شیٔ، عدم کے سناٹے سے عالم وجود میں ہدایت شدہ آجاتی ہے جس میں کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے مگر ہدایتِ تشریعی میں اللہ اپنے مرضی کے اظہار کے بعد انتخاب یا انکار کا اختیار بندہ کے سپرد کرتا ہے، مذکورہ دعا میں ہدایت سے مراد، ہدایتِ تشریعی ہی ہے۔

عملِ صالح کا مفہوم

عملِ صالح کا لفظ اس قدر واضح اور روشن ہے کہ جس کی مزید توضیح کی چنداں ضرورت نہیں ہے، "صالح" مادۂ "صَلاح" سے ہے جس کی ضد "فساد" بھی اور "سیّئہ" بھی ہے۔[2]

---

[1] سورۂ انبیاء، آیت ۷۳.

[2] مفردات راغب، مادۂ "صلح"

عملِ صالح یعنی نیک عمل، قرآن کریم میں متعدد آیات میں عملِ صالح، عملِ سوء کے مقابل میں ذکر ہوا ہے جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ عملِ صالح سے مراد نیک عمل ہے ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحاً فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا﴾[۱] ''جو نیک کام کرے گا اپنے فائدہ کے لئے کرے گا اور جو براکام کرے گا وہ اپنے ہی نقصان کے لئے کرے گا''۔

یوں تو تمام واجبات اور مستحبات، اعمال صالحہ کے دائرہ میں آتے ہیں مگر حقیقت میں وہی عمل، عملِ صالح کہلاتا ہے جس عمل سے اللہ راضی ہو، بسا اوقات انسان ایک کام کو عملِ صالح سمجھ کرانجام دیتا ہے، مگراس وقت خدا کی مرضی کسی اور عمل سے متعلق ہوتی ہے مثال کے طور پر نماز، اللہ کی عبادت ہے اور یقیناً عملِ صالح بھی ہے مگر آپ کسی ندی کے کنارے مصروفِ نماز ہوں اور ایک مومن اُسی وقت اُس ندی میں ڈوب رہا ہو اور کوئی بچانے والا بھی موجود نہ ہو اور آپ تیرنا بھی جانتے ہوں تو ایسے موقعہ پر خدا کی مرضی یہ نہیں ہے کہ آپ نماز پڑھتے رہیں، بلکہ اب آپ کے لئے عملِ صالح یہ ہے کہ آپ اس ڈوبتے ہوئے مومن کی جان بچائیں اور یہی خدا کی مرضی ہے، لہٰذا انسان بسا اوقات عملِ صالح کی تشخیص میں دھوکہ کھا جاتا ہے اس کے لئے قلبی بصیرت کی ضرورت ہے، جب انسان بصیرت سے عاری ہوتا ہے تو وہ نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی سمجھ بیٹھتا ہے اور اس کے نتیجہ میں گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے اور وہیں شیطان اس کے دل میں ٹھکانا بنالیتا ہے۔

۱۔ سورۂ جاشیہ، آیت ۱۵

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"ثَلَاثٌ لَا يُغِلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلَّهِ وَ النَّصِيحَةُ لِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَ اللُّزُومُ لِجَمَاعَتِهِم"[1]

تین چیزیں جس کے پاس ہوں وہ کبھی خیانت نہیں کرسکتا:

۱۔ صرف خدا کے لئے خالص عمل انجام دے

۲۔ ائمہ اطہار علیہم السلام کا مخلص[2] و مطیع رہے

۳۔ اور ہمیشہ ان کی جماعت میں رہے یعنی "کونوا مع الصادقین" کا مصداق بنا رہے۔

عملِ صالح کے اثرات

۱۔ بلندیٔ درجات

﴿وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِناً قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلاَ﴾[3]

"اور جو بھی اللہ کی بارگاہ میں مومن بن کر حاضر ہوگا اور اس نے نیک عمل کئے ہوں گے تو اس کے لئے بلند ترین درجات ہیں"

۱۔ نقل از گفتار، دکتر رفیعی.

۲۔ نصیحت اور نصوح، اخلاص کو کہتے ہیں اسی سے "توبہ نصوح" ہے جس کے معنی خالص توبہ ہے اور اگر کوئی کسی کو خلوص کے ساتھ کوئی بات بتائے تو اُسے بھی نصیحت کہتے ہیں۔

۳۔ سورۂ طٰہٰ، آیت ۷۵.

۲۔ بہشت میں داخلہ

﴿وَمَنْ يَعْمَلْ مِنْ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُوْلَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلاَ يُظْلَمُونَ نَقِيراً﴾[1]

"اور جو بھی نیک کام کرے گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ صاحب ایمان بھی ہو، ان سب کو جنت میں داخل کیا جائے گا اور ذرّہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا"

۳۔ حیاتِ طیّبہ

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً﴾[2]

"جو شخص بھی نیک کام کرے گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ صاحب ایمان ہو ہم اسے پاکیزہ زندگی عطا کرینگے"

۴۔ محبوبیت

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمْ الرَّحْمَنُ وُدّاً﴾[3]

"یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے عنقریب خداوند رحمٰن لوگوں کے دلوں میں ان کی مودت و محبت ڈال دے گا"

---

[1] ۔ سورۂ نساء آیت ۱۲۴۔

[2] ۔ سورۂ نحل، آیت ۹۷۔

[3] ۔ سورۂ مریم، آیت ۹۶۔

ان کے علاوہ قرآن کریم میں اور بھی آیات ہیں جن میں عمل صالح انجام دینے کا ذکر ہے، روایات معصومین علیہم السلام میں بھی اس کا ذکر موجود ہے، مگر یہاں پر قابل غور بات یہ ہے کہ قرآنی آیات میں جہاں بھی عملِ صالح کا ذکر آیا اکثر جگہوں پر اس سے پہلے ایمان کا ذکر ضرور ہوا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عملِ صالح اسی وقت اپنا اثر دکھاتا ہے جب اُسے حالتِ ایمانی میں انجام دیا گیا ہو۔

دوسرا فقرہ: "وَاقْضِ لِی فِیهِ الْحَوائِجَ وَالأَمالَ"

"واقض" مادۂ "قضی یقضی" سے ہے دراصل اس کے معنیٰ حکم کے ذریعہ فیصلہ کرنے کے ہیں اور یہ لفظ (قضی) قرآن مجید میں متعدد بار آیا اور مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے جن میں سے ایک معنیٰ "پورا کرنے اور تمام کرنے کے بھی ہیں"۔ ﴿فوَكَزَهُ مُوسَي فَقَضَي عَلَيْهِ﴾[1] "پس موسیٰ نے اُسے گھونسہ مارا اور اس کی زندگی کو تمام کردیا"۔ دعا کے اس جملہ میں "واقض" سے مراد پورا کرنے کے ہیں "حوائج" حاجۃ کی جمع ہے اور زندگی کی ہر ضرورت چاہے وہ مادی ہو یا معنوی اُسے حاجت کہتے ہیں۔ "آمال" "امل" کی جمع ہے جس کے معنیٰ امید وآرزو کے ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ إِلَي اللهِ وَاللهُ هُوَ الْغَنِي الْحَمِيدُ﴾[2]

"اے لوگو تم سب اللہ کے محتاج و فقیر ہو اور اللہ بے نیاز اور قابل حمد وثنا ہے"

---

[1] سورۂ قصص، آیت ۱۵.

[2] سورۂ فاطر، آیت .

جب ہم ہر اعتبار سے اللہ کے محتاج ہیں اور نیاز مند ہیں تو پھر ہم اپنی تمام ضرورتوں اور امیدوں کو پورا کرنے کے لئے اس کی طرف رجوع کریں؛ کیونکہ اس کی ذات بے نیاز ہے اور وہ اعلان کرتا ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾[1]

"مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعاؤں کو مستجاب کروں گا جو لوگ میری عبادت سے تکبر کی بناپر منھ موڑتے ہیں وہ عنقریب ذلت و خواری کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے"

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس آیۂ کریمہ کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا کہ اس آیت میں عبادت سے مراد دعا ہے[2]۔ اور دعا بہترین عبادت ہے چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "أَفْضَلُ الْعِبَادَةِ الدُّعَاءُ"[3] "بہترین عبادت دعا ہے"۔

لہٰذا امیدوں اور حاجتوں کی برآوری کے لئے صرف خدا ہی سے دعا مانگے۔

محمد بن عجلان سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے لئے زندگی بہت سخت اور اجیرن ہو گئی تھی، کیونکہ مجھ پر لوگوں کا بہت سارا قرض تھا اور وہ بڑی شدّت کے ساتھ اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کررہے تھے، میں حسن بن زید (جو اس وقت مدینہ کا گورنر تھا) سے مدد کی خاطر اس کے گھر کی طرف چلا، راستے میں محمد بن

---

[1]۔ سورۂ مومنون، آیت ۶۰.

[2]۔ تہذیب الاحکام، ج۲، ص ۱۰۴.

[3]۔ وسائل الشیعہ، ج۷، ص ۳۱.

عبداللہ بن علی بن الحسین علیہالسلام سے ملاقات ہوتی ہے جن سے میری گہری دوستی تھی، جیسے ہی انہوں نے مجھے دیکھا تو میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تمہاری تنگدستی کی مجھ کو خبر مل گئی ہے اب مجھے یہ بتاؤ کہ تم اپنی مشکل کو دور کرنے کے لئے کس پر امید اور بھروسہ رکھتے ہو؟ میں نے کہا: حسن بن زید سے، تو انہوں نے جواب دیا: سنو! تمہاری حاجت پوری ہونے والی نہیں ہے، اگر تم اپنی حاجت پوری ہونے کی تمنا رکھتے ہو تو ایسے آدمی کا دروازہ کھٹکھٹاؤ جو تمہاری مشکلات کی گرہ کھول سکے اور جو سب سے بڑا عطا کرنے والا ہو، جب تم اس کے پاس جاؤگے تو جو دل میں آئے مانگ لینا؛ کیونکہ میں نے اپنے چچازاد بھائی امام موسی بن جعفر علیہالسلام کو فرماتے سنا ہے: خدائے عزوجل نے اپنے بعض پیغمبروں پر اس طرح وحی نازل کی اور فرمایا:

"میں اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں: جو شخص تھوڑی سی بھی امید میرے علاوہ دوسروں سے رکھتا ہے تو میں ضرور اُسے ناامید کردوں گا اور لوگوں کے درمیان رسوا ہونے کے لئے ذلت و رسوائی کا لباس اس کو پہناؤں گا، اُسے اپنے فضل و فرج سے دور کردوں گا، کیا میرا بندہ یہ یقین نہیں رکھتا کہ مشکلوں کی گرہ میرے ہاتھوں سے کھُلتی ہیں تو میرے علاوہ کسی اور سے امید کیوں رکھتا ہے؟ جبکہ میں غنی اور بہت زیادہ عطا کرنے والا ہوں.... میں وہی خدا ہوں جو بغیر مانگے بھی اس کی حاجتوں کو پورا کرتا ہوں، یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی مجھ سے حاجت طلب کرے اور میں اس کی حاجت پوری نہ کروں...."

محمد بن عجلان کہتے ہیں: میں نے محمد بن عبد اللہ سے خواہش کرکے تین مرتبہ یہ حدیث سُنی اور طے کرلیا آج کے بعد خدا کے علاوہ کسی کے سامنے اپنی مشکل بیان نہیں کروں گا اس بات کو چند دن بھی نہ گذرے تھے کہ خداوند کریم نے مجھے روزی عطا فرمادیا۔[1]

البتہ جائز حاجتوں اور امیدوں کے برآنے کے لئے صرف دعا کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے کوشش اور محنت بھی کرے، پیغمبر اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "الدَّاعِي بِلَا عَمَلٍ كَالرَّامِي بِلَا وَتَر"[2] "بغیر عمل اور کوشش کے دعا کرنے والا بغیر تیر کے صاحب کمان کی طرح ہے"۔

دعا کے وقت اس کے تمام شرائط کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے منجملہ ان میں سے یہ ہیں:

۱۔ خدا سے ارتباط

۲۔ تہہ دل سے دعا کرنا

۳۔ خدا کے علاوہ دوسروں سے قطعِ امید

۴۔ تلاش وتدبیر کے ہمراہ

۵۔ حالت تضرع اور شکستہ دلی

۶۔ مکانِ دعا (وہ جگہیں جہاں دعائیں مستجاب ہوتی ہیں)

---

[1] ۔ بحار الانوار، ج ۹۰، ص ۳۰۳.

[2] ۔ عدۃ الداعی، ص ۹۷.

۷۔ زمانِ دعا(وہ مخصوص اوقات، دن اور مہینے جن میں دعائیں جلد مستجاب ہوتی ہیں)

۸۔توبہ واستغفار کے ساتھ

۹۔ظاہری اور باطنی طہارت کے ہمراہ

۱۰۔ان سب سے اہم محمدؐ وآل محمدؑ سے توسل،اول وآخران پر درود وسلام کے ساتھ۔

ان کے علاوہ اور بھی شرائط ہیں جن کا لحاظ کرنے سے دعائیں جلد از جلد مستجاب ہوتی ہیں، لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی دعاؤں سے دعا کرنے کا سلیقہ سیکھتے ہوئے اور اُنہی کے بتائے ہوئے شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے خالق کائنات کی بارگاہ میں دعا مانگے ماہِ رمضان، ماہِ استجابت دعا ہے، لہٰذا خداوند کریم کی بارگاہ میں ہماری دعا ہے کہ خدایا! ہماری دنیاوی اور اُخروی حاجتوں کو بطفیل محمد وآل محمد علیہم السلام برلا۔

تیسرا فقرہ: "يَا مَنْ لا يَحْتاجُ إلَى التَّفْسِيرِ وَالسُّؤالِ، يَا عالِماً بِما فِي صُدُورِ الْعالَمِينَ، صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ"

دعا کے اس آخری جملہ میں، اعمال صالحہ کے بجالانے کی طرف ہدایت اور حاجتوں اور امیدوں کی برآوری کی درخواست کے بعد اُس سے خطاب ہے جس کی بارگاہِ اقدس میں اِن دو چیزوں کی دعا مانگی گئی: اے وہ ذات جو سوال کرنے اور بیان کرنے کی محتاج نہیں، اے وہ ذات جو دو عالم کی مخلوقوں کے دلوں میں پوشیدہ رازوں کو جانتا ہے اور درود وسلام ہو محمدؐ وآل محمدؑ پر۔

یقیناًخدا کی بارگاہ میں شرح وتفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ ہمارے دل کے ہر راز سے آگاہ ہے وہی نہیں، بلکہ اُس نے اس صفت سے اپنے خاص بندے انبیاء اور ائمہ اطہار علیہم السلام کو بھی نوازا ہے اور وہ بھی بحکم خدا ہر انسان کے دل کے راز سے آگاہ ہیں، پھر بھی اس کا حکم ہے کہ ہم اپنی حاجت کو اس کی بارگاہ میں بیان کریں تاکہ ہمیں اپنے نیاز مند اور محتاج ہونے کا احساس ہو اور اس کے غنی بالذات ہونے کا اقرار، ورنہ وہ سب کچھ جانتا ہی ہے﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾[1] ''اور ہم اس سے رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں''۔اب یہاں رگِ گردن سے قریب تر ہونے سے مراد قربتِ مکانی نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہم کو ہم سے زیادہ جانتا ہے، کتنا زیادہ قریب ہے اس کا اندازہ لگایا نہیں جاسکتا؛ کیونکہ وہی ہمارا خالق ہے اور اس سے کائنات کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

﴿إِنَّ اللهَ لاَ يَخْفَي عَلَيْهِ شَيءٌ فِي الأَرْضِ وَلاَ فِي السَّمَاءِ﴾[2]

''بے شک خدا کے لئے آسمان وزمین کی کوئی شئ پوشیدہ نہیں ہے''

﴿إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَي﴾[3]

''وہ ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جانتا ہے''

۱۔ سورۂ ق، آیت ۱۶.

۲۔ سورۂ آل عمران، آیت ۵.

۳۔ سورۂ اعلیٰ، آیت ۷.

اٹھارویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ نَبِّهْنی فِيهِ لِبَرَكاتِ أَسْحارِهِ، وَنَوِّرْ فِيهِ قَلْبِی بِضِياءِ أَنْوارِهِ، وَخُذْ بِكُلِّ أَعْضائِی إِلَی اتِّباعِ آثارِهِ، بِنُورِكَ يَا مُنَوِّرَ قُلُوبِ الْعارِفِينَ».

"خدایا! مجھ کو اس دن میں اس ماہ کے سحروں کی برکتوں کے لئے بیدار رکھ اور اس میں میرے دل کو اس کے انوار سے منور کردے اور میرے اعضاء و جوارح کو اس ماہ کے احکام پر عمل کرنے کی طرف لگادے تجھے تیری نورانیت کا واسطہ اے عارفین کے دلوں کو روشن کرنے والے"

اہم مطالب:

اس دعا میں اُن تین چیزوں کا ذکر ہے جو اس ماہ مبارک سے متعلق ہیں:

۱۔ ماہِ رمضان کی سحروں کی برکتوں کا ادراک

۲۔ روشنیٔ قلب

۳۔ اس ماہِ مبارک کے احکام و آثار کی پیروی کے لئے اعضاء و جوراح کی آمادگی

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ نَبِّھْنِی فِیهِ لِبَرَکاتِ أَسْحارِهِ"

"نَبِّھْنِی" مادۂ "نبہ" سے ہے، اس سے مراد، تنبیہ ہے جس کا اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے مگر عربی میں "تنبیہ" کے معنی بیدار ہونے، آگاہ ہونے اور متوجہ ہونے کے ہیں

برکت کی جمع برکات ہیں، برکت یعنی "ثبوت الخیر الالھي في الشئ"[1] "کسی بھی چیز میں خیر الٰہی کا باقی اور جاری رہنا"۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے:

﴿لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَات مِنْ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ﴾[2]

"یقیناً ہم ان کے لئے زمین و آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے"

یعنی زمین و آسمان سے خیر الٰہی کو دوام بخشنا اس میں زیادتی اور اضافہ کے ذریعہ۔

سحر کی جمع اسحار ہے، طلوع فجر سے تھوڑا پہلے وقتِ سحر شروع ہو جاتا ہے۔ سحر، تزکیۂ نفس اور تصفیۂ روح کے لئے بہترین وقت ہے، نیند سے بیداری کے بعد انسان کا ذہن صاف و شفاف رہتا ہے، لہٰذا اُس وقت جو بھی پڑھا جائے وہ مفید واقع ہوتا ہے۔ وقتِ سحر کو اللہ نے بابرکت قرار دیا ہے چنانچہ اس کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَمِنْ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ عَسَي أنْ يَبْعَثَكَ﴾[3]

"اور رات کے (آخری) حصہ میں قرآن کے ہمراہ بیدار رہیں یہ آپ کے لئے اضافۂ خیر ہے، عنقریب آپ کا پروردگار اسی طرح آپ کو مقام محمود تک پہنچادے گا"

---

[1] مفردات راغب، مادۂ "برک"۔

[2] سورۂ اعراف، آیت ۹۶.

[3] سورۂ اسراء، آیت ۷۹.

مذکورہ آیت میں قرآن کے ہمراہ بیداری سے مراد نماز شب ہے جسے ''نافلۂ تہجد'' بھی کہتے ہیں؛ کیونکہ نافلہ اور تہجد دونوں کا ذکر اس آیۂ مبارکہ میں موجود ہے، جس کے معنٰی بیداری کے بعد واجبات سے ہٹ کر اضافی عبادت ہے اور یہ پیغمبر کے لئے ایک اضافی واجب عبادت تھی جس کا نتیجہ مقامِ محمود یعنی منزلِ شفاعت ہے، ہمیں یہاں پر نماز شب کی فضیلت سے متعلق گفتگو نہیں کرنا ہے؛ کیونکہ اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے مختصر یہ کہ جب نمازِ شب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مقامِ محمود ہے تو پھر اس کی فضیلت کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔

احادیثِ معصومین علیہم السلام میں نماز شب کی بہت زیادہ فضیلت کا ذکر ہے اور یہ نماز، نصفِ شب کے بعد سے طلوع فجر تک پڑھی جا سکتی ہے مگر اس کا وقتِ فضیلت ہنگامِ سحر ہے، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"ثَلَاثَةٌ هُنَّ فَخْرُ الْمُؤْمِنِ وَ زِينَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ الصَّلَاةُ فِي آخِرِ اللَّيْلِ وَ يَأْسُهُ مِمَّا فِي أَيْدِي النَّاسِ وَ وَلَايَةُ الْإِمَامِ مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ(ص)"[1]

تین چیزیں مومن کے لئے دنیا وآخرت میں فخر وزینت کا سبب ہے:

۱۔ نماز، رات کے آخری حصہ میں (سحر)

۲۔ جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے توجہی اور ناامیدی

۳۔ ولایتِ امام آل محمدؐ۔

---

[1] ماہِ وصال، ماشاء اللہ صدیقی، ص ۲۷۷.

سحر خیزی اولیائے الٰہی، علمائے باعمل اور اللہ کے مقرب بندوں کی نشانی رہی ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں یوں آیا ہے:

﴿وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ ع بِالأَسْحَارِ﴾[۱]

"اور یہ سب صادقین، قناعت گذار، راہِ خدا میں خرچ کرنے والے اور ہنگامِ سحر استغفار کرنے والے ہیں"

ایک اور جگہ پر ارشاد ہو رہا ہے:

﴿كَانُوا قَلِيلا مِنْ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ، وَبِالأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾[۲]

" یہ رات کے وقت بہت کم سوتے تھے۔ اور سحر کے وقت اللہ کی بارگاہ میں استغفار کیا کرتے تھے"۔

بندۂ مومن وقتِ سحر، استغفار، خدا سے راز و نیاز اور مناجات کے ذریعہ معنویات اور دنیا و آخرت میں اعلیٰ درجات کو حاصل کر سکتا ہے اور اولیائے الٰہی کے نزدیک بھی دعا کے لئے سحر کا وقت بہترین وقت ہے

پیغمبر اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

"خَيْرُ وَقْتٍ دَعَوْتُمُ اللَّهَ عَزَّ وَ جَلَّ فِيهِ الْأَسْحَارُ وَ تَلَا هَذِهِ الْآيَةَ فِي قَوْلِ يَعْقُوبَ ع ﴿سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي﴾[۳] وَ قَالَ أَخَّرَهُمْ إِلَى السَّحَرِ".[۱]

۱۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۷.

۲۔ سورۂ ذاریات، آیت ۱۶ و ۱۷.

۳۔ سورۂ یوسف، آیت ۹۸.

''تمہارے لئے خداوند عالم سے دعا کرنے کا بہترین وقت، سحر ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس آیہ کریمہ کی تلاوت فرمائی جس میں حضرتِ یعقوبؑ کی دعا کا واقعہ ہے: ''میں تمہارے لئے پروردگار سے ابھی مغفرت کرتا ہوں'' تو خدا نے کہا: اسے سحر کے وقت تک کے لئے ٹال دو''

جناب یعقوبؑ کا یہ جملہ اس وقت کا ہے جب جناب یوسفؑ کی نسبت ان کے بھائیوں کی خیانت آشکار ہو چکی تو انہوں نے اپنے والد حضرت یعقوبؑ کے قدموں میں خود کو گرا دیا اور کہا: بابا آپ ہمیں معاف کر دیجئے آئندہ ہم ایسا نہیں کریں گے تو حضرت یعقوبؑ نے فرمایا: ﴿سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي﴾ ''میں عنقریب تمہارے لئے اپنے پروردگار سے مغفرت کر دوں گا''۔ تفسیر منہج میں اس آیہ کریمہ کے ذیل میں آیا ہے کہ اللہ نے استغفار کا وقت شب جمعہ کی سحر کو قرار دیا اور حضرت یعقوب کا اپنے اولاد کے ہمراہ یہ وظیفہ بن چکا تھا کہ آپ ہر شب جمعہ کی سحر میں بیس سال تک اپنے بچوں کی خیانت پر استغفار کرتے رہے اور آپ کے بچے آمین کہتے رہے یہاں تک کہ خدا نے ان کی توبہ کو قبول فرمایا۔

لہٰذا ہمیں وقت سحر کی فضیلت اور اس کی نورانیت اور اس کے برکات کی جانب متوجہ ہونے کی ضرورت ہے تاکہ استغفار اور خدا کی عبادت کے ذریعہ ہم اپنی عاقبت کو سنوار سکیں حتّیٰ رزق دنیا بھی سحر خیزوں کو نصیب ہوتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

۱۔ بحار الانوار، ج ۹۰، ص ۳۴۳.

"أَجِيبُوا داعِيَ اللَّهِ وَ اطْلُبُوا الرِّزْقَ فِيمَا بَيْنَ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلَى طُلُوعِ الشَّمْسِ فَإِنَّهُ أَسْرَعُ فِي طَلَبِ الرِّزْقِ مِنَ الضَّرْبِ فِي الْأَرْضِ وَ هِيَ السَّاعَةُ الَّتِي يَقْسِمُ اللَّهُ فِيهَا الرِّزْقَ بَيْنَ عِبَادِهِ"[1]

"اللہ کے حکم پر لبیک کہو اور طلوعِ فجر و طلوعِ آفتاب کے درمیان رزق مانگو اس وقت زمین میں تلاش اور کوشش سے بہت پہلے ہی رزق عطا ہو جاتا ہے اور یہ وہی وقت ہے جس میں اللہ سبحانہ اپنے بندوں کے درمیان رزق تقسیم کرتا ہے"

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"..... فَعَلَيْكُمْ بِالدُّعَاءِ فِي السَّحَرِ ..... تُقَسَّمُ فِيهَا الْأَرْزَاقُ وَ تُقْضَى فِيهَا الْحَوَائِجُ الْعِظَامُ".[2]

"پس تم سحر کے وقت دعا کرو؛ کیونکہ رزق اسی وقت تقسیم ہوتا ہے اور اسی وقت عظیم حاجتیں پوری ہوتی ہیں"

مذکورہ آیات اور احادیث سے وقتِ سحر کی برکتیں کسی حد تک روشن ہو چکی ہیں ماہِ رمضان خود بابرکت مہینہ ہے اور اس ماہ کی سحروں کی برکتیں "نورٌ علیٰ نورٌ" کی حیثیت رکھتی ہیں، لہٰذا ہمیں ان برکتوں کی طرف متوجہ رہنا چاہئے۔

---

[1] ـ خصال صدوق، ج ۲، ص ۱۱۶، ح ۱۰۰.

[2] ـ کافی، ج ۲، ص ۴۷۸.

دوسرفقرہ:"وَنَوِّرْ فِيهِ قَلْبِي بِضِياءِ أَنْوارِهِ"

مذکورہ دعا کے پہلے جملہ میں آیا ہے کہ خدایا ہمیں اس ماہ کے سحروں کی برکتوں کی جانب متوجہ فرما، پھر اس کے بعد یہ دعا ہے خدایا ہمیں اس ماہ میں اس مہینے کی انوار کی روشنی سے ہمارے دلوں کو روشن کردے، یقیناً دل کی روشنی ظاہری آنکھوں کی روشنی سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اگر کوئی ظاہری آنکھوں سے اندھا ہے تو اس کے لئے صرف دنیا تاریک ہے مگر کوئی دل کا اندھا ہو تو اُس کی آخرت تاریک اور برباد ہو جاتی ہے، لہٰذا سحر خیزی کے ذریعہ اللہ کی عبادت و بندگی اور توبہ و استغفار کرکے انوارِ قرآن، انوارِ رحمتِ الٰہی سے اپنے دلوں کو روشن بنالیں تاکہ عاقبت بخیر اور آخرت روشن و منور ہوسکے۔

نور کی تفسیر

ماہِ رمضان، نورانی مہینہ ہے؛ کیونکہ یہ اللہ کا خاص مہینہ ہے اور ذاتِ الٰہی خود نور ہے ﴿اللهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ﴾[1] "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے"۔ نور سے مراد وہ موجود ہے جس سے اندھیرے میں چھپے ہوئے اشیاء ہمیں نظر آجاتے ہیں، علامہ طباطبائی نے نور کی تعریف کچھ یوں کی ہے: "ظَاهِرٌ بنفسِهِ و مُظهِرٌ غَيرِهِ"[2] یعنی "بنفس نفیس خود ظاہر ہوتا ہے اور اپنے غیر کو ظاہر کرتا ہے"۔ یعنی خود کے ظہور کے لئے کسی غیر کا محتاج نہیں ہے ہاں یہ حقیقت ہے "شدت ظہور، باعث خفا" ہے جس کی بناپر

۱۔ سورۂ نور، آیت ۳۵.

۲۔ تفسیر المیزان، ج۱۵، ص۱۶۹.

اُسے دیکھنے کے وسیلے کی ضرورت پڑتی ہے، اگر آپ کسی وسیلہ کے بغیر سورج کو دیکھو گے تو اندھیرا نظر آئے گا لہٰذا آنکھوں اور آفتاب کے دیکھنے کے لئے چشمے (عینک) کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح اللہ نور ہے مگر وہ نور جس میں شدّت ہے لہٰذا اس کی معرفت کے لئے انبیاء اور ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی ضرورت ہے اسی لئے اس نے حدیث قدسی میں اعلان کیا: «كنت كنزا مخفيا فأحببت أن أعرف، فخلقت الخلق لأعرف»[۱] ''میں چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا خود کو پہچنواؤں تو میں نے خاص مخلوق کو پیدا کیا''۔

یہاں پر دو نکتے قابل غور ہیں ایک یہ ہے کہ وہ پوشیدہ تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حقیقت میں پوشیدہ نہیں تھا؛ کیونکہ وہ نور ہے، بلکہ شدّتِ ظہور کی بنا پر نگاہِ قلب سے پوشیدہ ہوگیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ لغت میں ''خِفا'' کے متضاد معنٰی ہیں، خفا کے معنٰی چھُپے ہوئے کے بھی ہیں اور آشکار کے بھی، جس طرح ''طُھر'' اور ''عدل'' متضاد معنوں کے لئے ذکر ہوئے ہیں۔ یہ عربی زبان کا خاصہ ہے کہ جس میں بعض الفاظ کے دو متضاد معنی ہوتے ہیں، ایک اور بات یہ ہے کہ حدیث قدسی میں ''الخلق'' یعنی خلق پر ''الف لام ہے جو معرفہ ہے لہٰذا یہاں پر تمام مخلوق کی بات نہیں ہے، بلکہ خاص مخلوق کا تذکرہ ہے اور احادیث معصومین علیہم السلام سے یہ ثابت ہے کہ وہ خاص مخلوق محمدؐ آل محمدؐ ہیں۔

---

[۱] بحار الانوار، ج ۸۴، ص ۳۴۴، ۸۴.

یہاں پر اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ اگر نور، نورِ حسّی ہو تو اُسے محسوس کیا جاسکتا ہے یعنی ہم ظاہری آنکھوں سے محسوس کرسکتے ہیں۔ اگر نور، حسّی و مادّی نہ ہو، بلکہ ماورائے مادہ ہو تو پھر اُسے محسوس کرنے اور دیکھنے کے لئے اسے آنکھوں کی نہیں، بلکہ دل کی آنکھوں کی ضرورت ہے اسی لئے مولائے کائنات نے ذعلب یمانی کے سوال کے جواب میں فرمایا: میں اس خدا کی عبادت نہیں کرتا جسے دیکھا نہ ہو، ہاں مگر اُسے ظاہری آنکھوں سے نہیں، بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔

الغرض خدا نور ہے اس کا کلام نور ہے، اس کی وحی نور ہے اسی لئے مولاؑ نے فرمایا: "أَرَى نُورَ الْوَحْيِ"[۱] ''میں نورِ وحی کو دیکھتا ہوں''۔ گویا علیؑ تھے جو نزولِ وحی کے موقعہ پر بھی حقیقتِ وحی سے آگاہ تھے، اُس حقیقتِ وحی کو یا مُرسِل (خدا) جانتا تھا یا مُرسَل (نبی) جانتے تھے اِن کے علاوہ اس رسالتِ وحی کی حقیقت سے کوئی اور آگاہ تھا تو وہ علیؑ کی ذات والا صفات تھی اسی لئے جب یہودیوں نے "لستَ مرسلاً" کہہ کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا انکار کیا تو اللہ نے اقرارِ رسالت کی گواہی یہ کہہ کر دی: ﴿قُلْ كَفَى بِاللهِ شَهِيداً بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾[۲] ''اے رسول کہہ دیجیے، رسالت کی گواہی کے لئے اللہ کافی ہے اور وہ کافی ہے جس کے پاس کتابِ خدا کا علم ہے''۔ اور امیر بیان حضرت علی علیہ السلام نے یہ کہہ کر ثابت کردیا: "أنا الّذي مَن عنده عِلم الكتاب" ''میں ہی وہ ہوں جس کے پاس پوری کتاب کا علم موجود ہے اور اللہ کے

۱۔ نہج البلاغہ، خ ۱۲۰۔
۲۔ سورہ رعد، آیت ۴۳۔

اولیاء بھی نور ہیں"۔ اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُورِي"[۱]، "أَنَا وَ عَلِيٌّ مِنْ نُورٍ وَاحِد"[۲] "اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو خلق کیا میں اور علیؑ ایک ہی نور سے ہیں"۔

اور اس نور کا سلسلہ قیامت تک رہے گا: ﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللهُ مُتِمُّ نُورِهِ﴾[۳] "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھادیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا"۔

قلب کی نورانیت

آیات و روایات میں "قلب" سے مراد گوشت کا وہ حصّہ نہیں ہے جو انسان کے پہلو میں دھڑکتا ہے، بلکہ وہ مرکزِ قوت و قدرت ہے جہاں سے انسان کے بدن کے تمام اعضاء و جوارح پر حکومت ہوتی ہے جسے کبھی نفس کبھی روح اور کبھی عقل کہا گیا ہے، اگر انسان کا یہ قلب نورانی ہوگا تو اس کے افکار، رفتار، گفتار اور کردار میں بھی نورانیت نظر آتی ہے؛ کیونکہ قلب تمام اعضاء و جوارح پر حاکم ہوتا ہے اور اپنا اثر چھوڑتا ہے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"إِنَّ مَنْزِلَةَ الْقَلْبِ مِنَ الْجَسَدِ بِمَنْزِلَةِ الْإِمَامِ مِنَ النَّاس"[۴]

۱۔ بحار الانوار، ج ۲۵، ص ۲۲
۲۔ بحار الانوار، ج ۳۳، ص ۴۸۰
۳۔ سورۂ یوسف، آیت ۸.
۴۔ علل الشرایع، شیخ صدوقؒ، ج، ص ۱۰۹.

"بے شک جسد سے قلب کا جو رشتہ اور مرتبہ ہے وہی رشتہ اور مرتبہ امام کا لوگوں کے درمیان ہے"

یعنی جس طرح قلب، جسم پر حاکم ہے اسی طرح امام بھی لوگوں کا حاکم و رہبر ہیں اسی لئے امام معصوم کو "قلب عالم امکان" کہا جاتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ایک او مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلْقَلْبُ حَرَمُ اللَّهِ فَلَا تُسْكِنْ حَرَمَ اللَّهِ غَيْرَ اللَّه"[1]

"قلب اللہ کا حرم ہے، لہٰذا اللہ کے حرم میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو جگہ مت دو"

یعنی مومن کا دل اگر دھڑکے تو صرف خدا کے لئے دھڑکے، دل میں صرف اللہ کی یاد ہو، انسان کسی سے دوستی یا دشمن کرتا ہے تو اسی قلب سے کرتا ہے، مگر جس کا دل صرف خدا کا ہوتا ہے وہ دوستی اور دشمنی بھی خدا کے لئے ہی کرے گا، دوستی اور دشمنی کا معیار نفسانی خواہشات کو قرار نہیں دے گا؛ کیونکہ مومن کا دل حرمِ خدا ہے یعنی "کعبۃ اللہ" کی طرح ہے اور جہاں دوستی اور دشمنی صرف خدا کے لئے ہو وہیں اصلِ دین محفوظ ہوگا؛ کیونکہ کسی نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا: دین کیا ہے؟ تو آپ نے پھر فرمایا: "هَلِ الدِّينُ إِلَّا الْحُبُّ وَ الْبُغْض"[2] "کیا دین حُب و بغض کے علاوہ

---

[1]۔ جامع الاخبار، تاج الدین شعیری، ص۱۹۵.
[2]۔ تفسیر فرات کوفی، ص۴۳۰.

بھی کوئی چیز ہے؟" جب حُب و بغض کا میعار خدا کی مرضی بن جائے تو اُسی حُب و بغض کو شریعت میں "تولّا و تبریٰ" کہتے ہیں۔

قلب کی مختلف حالتیں قرآن اور احادیث کی روشنی میں

۱۔ قلبِ سلیم

جو قلب شیطانی وسوسوں اور نفسانی خواہشات کے حملوں سے محفوظ اور سالم رہے وہی قلب "قلب سلیم" ہے چنانچہ ارشاد رب العزت ہے:

﴿وَلاَ تُخْزِني يَوْمَ يُبْعَثُونَ، يَوْمَ لاَ يَنْفَعُ مَالٌ وَلاَ بَنُونَ، إِلاَّ مَنْ أَتَي اللهَ بِقَلْب سَلِيم﴾[۱]

"اور مجھے اُس دن رسوانہ کرنا جب سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے، جس دن مال اور اولاد کام نہ آئے گی، مگر وہ جو قلبِ سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو"

در حقیقت مال اور اس دنیا میں اولاد انسان کے لئے بہترین سرمایہ ہے جو انسان کی زندگی میں ظاہری طور پر کام آتے ہیں مگر قیامت کے دن یہ سب چیزیں کام نہیں آئیں گے اور اگر محشر کے دن انسان کو کوئی چیز کام آئے گی تو وہ اس کا قلبِ سلیم ہوگا، ہاں یہاں پر اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں وہ مال اور اولاد مراد نہیں ہے جو مال راہ خدا میں خرچ ہوا ہے یا وہ اولاد صالح جو اپنے والدین کے لئے

۱۔ سورہ شعراء، آیت ۸۷ سے ۸۹ تک

دعائے خیر کرتی ہیں، روایات کی روشنی میں ثابت ہے کہ یہ تو مرنے والے کے لئے فائدہ بخش ہیں، بلکہ اس آیۂ کریمہ میں وہ مال مراد ہیں جو راہِ خدا میں خرچ نہ ہو اور وہ اولاد جو صالح نہ ہو۔

۲۔ قلبِ مطمئن

قلبی اطمینان سے مراد ایسا سکون و اطمینان ہے جس کے ہوتے ہوئے خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو، نہ دشمن کا خوف، نہ مصیبتوں کا خوف، نہ دنیا سے متعلق کسی بھی چیز کا خوف، نہ ہی فقر و تنگدستی کا خوف، جب انسان کا دل اس قسم کے خوف و وحشت سے مطمئن رہتا ہے تو اُسے قلبِ مطمئن کہتے ہیں اور قلب و دل کو یہ سکون و اطمینان، صرف ذکر و یادِ الٰہی سے حاصل ہوتا ہے۔

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللهِ أَلاَ بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾[1]

"(یہ لوگ ہیں) جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دلوں کو یادِ خدا سے اطمینان حاصل ہوتا ہے اور آگاہ ہو جاؤ کہ اطمینان یادِ خدا سے ہی حاصل ہوتا ہے"

۳۔ نورانی قلب

متعدد روایات میں نورانی قلب کا ذکر ہے مثلًا:

﴿فَمَنْ يُرِدْ اللهُ أَنْ يَهدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلاَمِ﴾[2]

۱۔ سورۂ رعد، آیت ۲۸.

۲۔ سورہ انعام، آیت ۱۲۶.

''پس خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اُس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کردیتا ہے''

مرحوم طبرسی، تفسیر مجمع البیان میں مذکورہ آیۂ کریمہ کے ذیل میں فرماتے ہیں: روایت صحیحہ میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو کسی نے ''شرح صدر'' سے متعلق سوال کیا تو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا:

"نُورٌ يَقْذِفُهُ اللَّهُ فِي قَلْبِ الْمُؤْمِنِ فَيَشْرَحُ صَدْرَهُ وَ يَنْفَسِح"[۱]

''شرح صدر؛ نور ہے جسے خداوند کریم مومن کے دل میں ڈال دیتا ہے تو اس سے اس کا سینہ کُشادہ اور نورانی ہو جاتا ہے''

اس طرح کی متعدد احادیث ہیں جیسے علم کو بھی نور کہا گیا ہے جس سے قلب منور ہو جاتا ہے، یہاں پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ قلب کے یہ مختلف نام اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کیفیت اور صفات کے اعتبار سے بھی مختلف ہوں گے ایسا نہیں ہے، بلکہ قلب کی یہ تمام صفتیں ایک ہی جہت میں ہیں یعنی یہ سب ایک ہیں صرف الگ الگ صفت کی بناپر الگ الگ نام سے یاد کیا گیا ہے، چاہے وہ قلب سلیم ہو، یا قلب مطمئن۔ یہ بھی نورانی ہیں؛ کیونکہ جب تک نورانی نہیں ہوں گے تو اس وقت تک اُن میں سلامت و اطمینان کی صفت نہیں آسکتی۔

قرآن کریم اور احادیث میں اُن قلوب کا ذکر بھی ہے جو اِن صفاتِ ممدوحہ سے عاری ہیں جیسے قلبِ مریض ﴿فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللهُ مَرَضاً﴾[۱] ''یا قلبِ

۱۔ مجمع البیان، ج ۴، ص ۵۱۶۔

مُقَفّل" (جن پر تالے پڑے ہوئے ہیں) ﴿خَتَمَ اللہُ عَلَي قُلُوبِهِمْ﴾[۲] یا سخت قلب ﴿قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً﴾[۳]

ہماری آج کی دعا میں خداوند کریم سے یہی التجا ہے خدایا! اس ماہِ پُر نور کی روشنی سے ہمارے دلوں کو پُر نور کردے تاکہ ہمارے دل خدا کے لئے خالص ہوکر سلامت و اطمینان کی دولت سے مالامال ہو جائے۔

تیسرا فقرہ: "وَخُذْ بِكُلِّ أَعْضائِی إِلَی اتِّباعِ آثارِهِ"

جب ماہِ مبارک رمضان کے سحر گاہوں کی دعا، مناجات، توبہ، استغفار اور عبادت و اطاعت الٰہی کے ذریعہ دل روشن ہوجائے تو اس کی بارگاہ میں یہی دعا ہے خدایا! اب دل کے بعد اعضاء و جوراح کی باری ہے، لہٰذا اس دل کی نورانیت کا اثر اعضاء و جوارح پر بھی ہو تاکہ یہ تیری اطاعت و عبادت کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے اور تیری قدرت و کبریائی کے سامنے مطیع و فرمانبردار ہوجائے ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ دِيناً مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لله وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾[٤] "اور اس سے بہتر دین کس کا ہو سکتا ہے جس نے اپنے سر تسلیم کو خم کردیا خدا کی طرف اور وہ نیک کردار بھی ہے"۔

۱۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۰.

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۷.

۳۔ سورۂ مائدہ، آیت ۱۳.

۴۔ سورۂ نساء، آیت ۱۲۵.

"وَخُذْ أَعْضائِي إِلَى اتِّباعِ آثارِهِ" "اے خدا میرے اعضا کو قرار دے تو اپنے آثار کی پیروی اور اطاعت کی راہ پر"۔ آثار سے مراد نشانی اور راستہ ہے۔ ﴿وَقَفَّيْنَا عَلَي آثَارِهِمْ بِعِيسَي ابْنِ مَرْيَمَ﴾[۱] "اور ہم نے اُنھی گذشتہ انبیاء کی راہ اور نقش قدم پر عیسیٰ بن مریم کو چلادیا"۔

اعضاء، عضو کی جمع ہے جن میں آنکھ، کان، منہ، پیٹ وغیرہ شامل ہیں، انسان کے جسم کا ہر حصّہ کو قلبِ منور کا تابع اور مطیع ہونا ضروری ہے تاکہ خدا کی اطاعت اور راہ ہدایت سے انحراف نہ کرے، قیامت کے دن ان تمام اعضاء سے خدا کے سامنے سوال کیا جائے گا چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہو رہا ہے:

﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُوْلَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولا﴾[۲]

"یقیناً کان، آنکھ اور دل سب کے بارے میں سوال کیا جائے گا"۔

ان تمام اعضاء کو دنیا میں اپنے اپنے کاموں کا حساب دینا پڑے گا:

﴿الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَي أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾[۳]

"آج ہم ان کے منہ پر خاموشی کی مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور پاؤں گواہی دیں گے اس کے بارے میں جو کچھ کرتے رہے ہیں"۔

۱۔ سورۂ مائدہ، آیت ۴۶.

۲۔ سورۂ اسراء، آیت ۳۶.

۳۔ سورۂ یٰسین، آیت ۶۵.

اگر یہ اعضاء دنیا میں راہ خدا پر اللہ کے مطیع و فرمانبر دار رہے ہوں تو وہ قیامت میں اللہ کے سخت عذاب سے محفوظ ہیں ورنہ روایات میں ہر عضو کے لئے اس کی غلط کارکردگی اور معصیت الٰہی کی بنا پر الگ الگ عذاب کا ذکر آیا ہے جیسے نامحرم کی طرف تلذذ کی نیت سے دیکھنا، غیبت کرنا، غنا سننا، ہاتھوں سے ظالم کی حمایت کرنا، اِن تمام موارد کے لئے روایات میں جہنم کے مختلف طرح کے عذاب و عتاب کا ذکر ہے۔

خدایا! ہمارے دل کو منور بنانے کے ساتھ ساتھ ہمارے تمام اعضاء و جوارح کو تو اپنا مطیع و فرمانبر ار قرار دے تاکہ آخرت کے سخت عذاب سے تیری پناہ مل سکے۔

انیسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ وَفِّرْ فِيهِ حَظِّى مِنْ بَرَكَاتِهِ، وَسَهِّلْ سَبِيلِى إلى خَيْرَاتِهِ، وَلاَ تَحْرِمْنِى قَبُولَ حَسَنَاتِهِ، يَا هادِياً إلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ».

''خدایا! آج کے دن اس ماہ کی برکتوں کو میرے نصیب میں زیادہ قرار دے اور میری راہ کو آسان کردے اس ماہ کی نیکیوں تک پہنچنے کے لئے اور مجھے محروم نہ رکھ اس ماہ کی نیکیوں کے قبول کرنے سے، اے روشن حق کی طرف ہدایت کرنے والے''

اہم مطالب:

اس دعا میں بارگاہ الٰہی میں اہم امور کی درخواست ہے:

۱۔ ماہِ رمضان کی برکتوں سے زیادہ سے زیادہ فیضیابی کی دعا

۲۔ ماہِ رمضان کی نیکیوں کی طرف آگے بڑھنے کی راہ کو آسان قرار دینے کی دعا

۳۔ نیکیوں کو قبول نہ کرکے محروم نہ رکھنے کی دعا

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ وَفِّرْ فِیهِ حَظِّی مِنْ بَرَکاتِهِ"

"وَفِّر" کے معنٰی "کامل کر اور زیادہ کر" کے ہیں اور "حِظّ" کے معنٰی "نصیب اور فیضیابی" کے ہیں۔ بندہ اپنے رب کی بارگاہ میں دعا گو ہے: خدایا! تو مجھے اس دن میں اس ماہ کی برکاتوں سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب کر یعنی زیادہ سے زیادہ برکتوں کو میرے لئے نصیب فرما۔ یقیناً ماہ مبارکِ رمضان معنوی برکتوں والا مہینہ ہے وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے جو اس ماہ میں زیادہ سے زیادہ برکتوں کو اپنے حصہ میں قرار دے لے۔

گذشتہ تاریخ کی دعا میں "برکات" کا ذکر آیا تھا جس کے ذیل میں برکت کے معنٰی و مفہوم کے بارے میں عرض کیا جاچکا ہے۔ برکت ایک خیر الٰہی ہے جو ہر چیز کی ظرفیت اور اس کی استعداد کے اعتبار سے اس چیز میں پوشیدہ ہے جیسے نسل میں برکت یعنی نسل کا باقی اور جاری رہنا، وقت میں برکت یعنی تمام ضروری امور کی انجام دہی کے لئے وقت کا کافی ہونا اسی طرح رزق میں برکت، علم میں برکت اور دیگر چیزوں میں بھی اسی چیز کے اعتبار سے برکت ہے، البتہ ہر چیز میں زیادتی برکت نہیں ہے، بلکہ برکت کا تصور وہیں ہوتا ہے جہاں خیر ہو۔

الف: افرادِ بابرکت

ا۔ انبیاء

قرآن کریم میں خداوند حکیم حضرت نوح سے فرمارہا ہے:

﴿قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلاَمٍ مِنَّا وَبَرَكَات عَلَيْكَ﴾[۱]

”کہا گیا، اے نوح (کشتی سے) اترو ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ“

جناب نوح کے علاوہ اُن دیگر پیغمبروں کا بھی قرآن میں ذکر ہے جو اللہ کی برکتوں سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔

۲۔ ائمہ معصومین علیہم السلام

امام صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

«بِنَا أَثْمَرَتِ الْأَشْجَارُ وَ أَيْنَعَتِ الثِّمَارُ وَ جَرَتِ الْأَنْهَارُ وَ بِنَا يَنْزِلُ غَيْثُ السَّمَاءِ وَ يَنْبُتُ عُشْبُ الْأَرْضِ....»[۲]

”ہمارے وجود کی برکت سے درخت ثمر دار ہوتے ہیں، نہریں جاری ہوتی ہیں، آسمان سے پانی برستا ہے، زمین سے پودے اُگتے ہیں...“

۳۔ صاحبان ایمان

ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

﴿قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلاَمٍ مِنَّا وَبَرَكَات عَلَيْكَ وَعَلَي أُمَمٍ مِمَّنْ مَعَكَ﴾[۳]

۱۔ سورۂ ہود، آیت ۴۸۔
۲۔ اصول کافی، ج۱، ص ۲۸۹۔
۳۔ سورۂ ہود، آیت ۴۸۔

"کہا گیا، اے نوح؟ کشتی سے) اترو، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اور (یہ سلامتی اور برکتیں) اُس قوم پر بھی ہیں جو آپ کے ساتھ ہے"

ظاہر سی بات ہے جو لوگ حضرت نوح کے ساتھ ان کی کشتی میں سوار تھے وہ حضرت نوح کی پیغمبری پر ایمان لائے تھے، لہٰذا پروردگار نے انھیں طوفان کے عذاب سے سلامتی اور نعمتوں میں برکتیں عطا کی۔

انبیاء، ائمہ اور صاحبان ایمان یہ وہ ہیں جن پر ہمیشہ برکتوں کا نزول رہا ہے لہٰذا جو بھی اِن کی راہ پر آگے بڑھتا رہے گا اُس پر اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے اور یاد رہے برکت کے مقابل نحوست ہے، جس کے معنیٰ اللہ کی نعمتوں اور برکتوں کا منقطع ہو جانا ہے چنانچہ جو بھی راہِ انبیاء وائمہ سے مُنہ موڑ لے گا اور خدا اور رسول کے احکام کی مخالفت کرے گا اس سے برکتیں ختم ہو جائیں گی۔

ب: بابرکت چیزیں

ا۔ قرآن

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

«الْبَيْتُ الَّذِي يُقْرَأُ فِيهِ الْقُرْآنُ وَ يُذْكَرُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ فِيهِ تَكْثُرُ بَرَكَتُهُ»[1]

"جس گھر میں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے خداوند کریم اس گھر میں بے شمار برکتوں کا نزول فرماتا ہے"

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۴۱۴.

۲۔ عقل

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

«لَا غِنَى مِثْلُ الْعَقْلِ» [1]

"عقل کی طرح کوئی چیز پُر خیر و برکت نہیں ہے"

۳۔ کعبہ

قرآن کریم میں ارشاد ہو رہا ہے:

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْت وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكاً وَهُدي لِلْعَالَمِينَ﴾ [2]

"بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے مبارک ہے اور عالمین کے لئے سببِ ہدایت ہے"

۴۔ سلام

ارشاد الٰہی ہے:

﴿فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتاً فَسَلِّمُوا عَلَي أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِنْ عِنْدِ اللهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً﴾ [3]

"......جب گھروں میں داخل ہو تو پس اپنے اوپر سلام کرو یہ اللہ کی طرف سے نہایت ہی بابرکت اور پاکیزہ تحفہ ہے"

---

[1]۔ الحدیث، محمد تقی فلسفی، ج۱، ص ۳۸۲.

[2]۔ سورۂ آل عمران، ۹۶.

[3]۔ سورۂ نور، آیت ۶۱.

۵۔ بارش

ارشادالٰہی ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا مِنْ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكاً فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَنَّات وَحَبَّ الْحَصِيدِ﴾[۱]

''اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا ہے پھر اس سے باغات اور کھیتی کا غلہ اگایا ہے''

ان کے علاوہ اور بھی اشیاء ہیں جنھیں آیات وروایات میں بابرکت قرار دیا گیا ہے، یہ تمام چیزیں بابرکت ہیں اگر انسان چاہتا ہے کہ وہ اللہ کی برکتوں سے بہرہ مند ہو تو اُسے جن لوگوں پر اللہ کی رحمتوں، نعمتوں اور برکتوں کا نزول ہوا اُن کی راہ پر چلنا چاہیئے، یہ وہ فطرتِ بشر کی تمنا ہے جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری دعا کی شکل میں سورۂ حمد کا حصہ قرار دیا ﴿اهْدِنَا الصِّرَطَ الْمُسْتَقِيمَ، صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ''ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت فرما تا جو اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر تو نے نعمتیں نازل کی ہیں''۔

تفسیر صافی میں اس آیۂ کریمہ کے ذیل میں نبی مکرم سے مروی ہے کہ ﴿الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد '' شِيعَةُ عَلِيٍّ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ بِوِلَايَةِ عَلِي بْن أَبِي طَالِبٍ ع" ہے لہٰذا برکتوں کے نزول کے لئے ضروری ہے کہ راہِ اہلبیت علیہم السلام، راہِ ولایت پر گامزن رہے، ۱۹ر رمضان المبارک کی شب، شبِ قدر اور شبِ ضربت بھی ہے یعنی قرآنِ صامت کے نزول اور قرآنِ ناطق کے عروج کا دن ہے، خدایا ہمیں

۱۔ سورۂ ق، آیت ۹.

توفیق عطا فرما، راہِ قرآن اور راہِ علیؑ پر چلنے کی کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہیں، چنانچہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "علي مع الحق والقرآن مع علي؛ علیؑ قرآن کے ساتھ اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے"۔

دوسرا فقرہ: "وَسَهِّلْ سَبِيلِى إلى خَيْرَاتِهِ"

دعا کے اس فقرہ میں بندۂ مومن اپنے خدا کی بارگاہ میں یوں سوال کر رہا ہے، خدایا میری راہ کو آسان فرما اس ماہ کی نیکیوں تک پہنچنے کے لئے۔

خیر کی تعریف

خیرات، خیر کی جمع ہے۔ خیر، اس چیز کو کہتے ہیں جسے ہر کوئی پسند اور اپنے لئے طلب کرتا ہے[۱]۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس کی طلب سچی ہو یعنی فطری ہو؛ کیونکہ کبھی کبھی انسان غیر فطری طلب کے سبب غلط کو صحیح مان کر، بد کو خیر سمجھ کر اپنے لئے طلب کرتا ہے۔ ابو علی سینا نے بھی خیر کی یہی تعریف کی ہے: خیر یعنی وہ چیز جس میں ہر کسی کی رغبت ہوتی ہے جیسے عقل، عدالت، عزت اور شرافت وغیرہ وغیرہ[۲]۔ مثالوں سے بات واضح ہے کہ رغبت سے مراد فطری رغبت ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے لہٰذا اسلام نے کبھی بھی کسی فطری طلب و رغبت سے انسان کو نہیں روکا، اسی لئے رہبانیت (دنیا اور دنیا کی تمام ضرورتوں کو چھوڑ چھاڑ کر شادی ازدواج وغیرہ کو ترک

---

[۱]۔ اسفار اربعہ، ملا صدرا، ج ۷، ص ۵۷.

[۲]۔ الٰہیات، شفا، ص ۳۵۵

کرکے جنگلوں، صحراؤں اور پہاڑوں پر جاکر تارک الدنیا بن جانا) کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اسلام کے اکثر مسائل اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں، چنانچہ خیر سے مراد وہ چیز ہے جس میں انسان کی فطری طور پر رغبت ہوتی ہے اور اس کی ضد شر ہے۔ شر، کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ خیر کا نہ ہونا ہی شر ہے۔ علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں: "ليس الشر الا عدم الخير" اس کی تفصیل دعا نمبر ۳ کے ذیل میں گذر چکی ہے۔[1]

سوال یہ ہے کہ جب خیر میں فطری طور پر انسان کی رغبت ہوتی ہے اور انسان اُسے فطری طور پر چاہتا ہے تو پھر خیر تک پہونچنے کے لئے راہ دشوار اور مشکل کیوں ہو جاتی ہے؟

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کسی بھی چیز میں انسان کی رغبت کا ہونا اور اس چیز تک پہونچنے کے لئے راہ کا مشکل یا آسان ہونا یہ دو الگ الگ باتیں ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ انسان صرف اپنے مشکل امور سے متعلق ہی اللہ سے دعا مانگے ایسا نہیں ہے، بلکہ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے چاہتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے متعلق بھی دعا کرے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ بندہ اپنی ہر ضرورت کو خدا سے طلب کرے یہاں تک کہ بندِ کفش (شوز کی فیتے) ہی کیوں نہ ہوں۔ دستِ طلب کو اسی کی بارگاہ میں دراز کریں؛ کیونکہ جب تک وہ آسان نہیں کرے گا کوئی چیز آسان نہیں ہوگی۔[2]

۱۔ تفسیر المیزان، ج۳، ص۱۳۴.

۲۔ میزان الحکمۃ، ج۴، ص۲۴.

تیسری اور ہم چیز یہ ہے کہ کبھی کبھی کسی چیز میں انسان کی رغبت اور چاہت کے باوجود شیطان کاکام یہ ہے کہ وہ غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط کرکے دکھاتا ہے:

﴿وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنْ السَّبِيلِ فَهُمْ لاَ يَهْتَدُونَ﴾[1]

''شیطان نے ان کے لئے اُن کے اعمال کو خوشنما بنادیا پس اس طرح اُن کے لئے راہِ ہدایت بند کردیا، پس وہ ہدایت نہیں پا سکیں گے''

وہ چیزیں جن کی وجہ سے شیطان انسان کے عزم وارادہ پر مسلط ہو جاتا ہے، تین ہیں: ا۔ شہوت ۲۔ غضب ۳۔ نفسانی خواہشات

شہوت جانوروں کی خصلت ہے جس کا وجود انسان میں بھی ہے جس کے بے جا استعمال سے انسان راہِ حق و خیر سے منحرف ہو جاتا ہے اور انسانیت کے لئے یہ ایک عظیم آفت ہے۔ غضب درندوں کی خصلت ہے جس کے عقل پر غالب آجانے سے انسان جانوروں سے بدتر ہو جاتا ہے، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو کھو بیٹھتا ہے، یہ شہوت سے زیادہ بڑی مصیبت ہے اور نفسانی خواہشات شیطانی خصلت ہے جو مذکورہ دونوں چیزوں سے بھی بہت بڑی مصیبت ہے جس کی بناپر انسان دین کو دنیاکے عوض بیچ دیتا ہے اور برائی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے، شہوت کے ذریعہ انسان خود پر ظلم کرتا

---

[1] سورۂ نمل، آیت ۲۴.

ہے، غضب کے ذریعہ دوسروں پر ظلم کرتا ہے اور نفسانی خواہشات کی بناپر انسان اپنے خدا پر بھی ظلم کرتا ہے۔[1]

شبِ قدر، خیر وبرکت کی شب

انیسویں ماہِ رمضان کی تاریخ جہاں شبِ ضربت مولائے کائنات ہے وہیں یہ شب، شبِ قدر بھی ہے اور شبِ قدر، خیر وبرکت کی شب ہے۔﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾[2] ”شب قدر، ہزار مہینوں سے بہتر ہے“۔ گویا جتنی خیر و برکت انسان، ہزار مہینوں کی راتوں میں حاصل کرسکتا ہے اگر توفیق الٰہی شاملِ حال ہو تو بندہ اس سے زیادہ شبِ قدر میں حاصل کرسکتا ہے، غور طلب بات یہ ہے کہ انسان اگر ایک لمبی عمر زندگی کرے گا تو اسی وقت ہی وہ اپنی زندگی میں ہزار مہینوں کو پاسکتا ہے یعنی پوری زندگی میں جس مقدار میں خیر و برکت کا حصول ممکن ہے اس سے کہیں زیادہ شبِ قدر حاصل کرسکتا ہے، شبِ قدر کو درک کرنے سے مراد صرف رات بھر جاگنا نہیں ہے اور نہ ہی صرف بطورِ عادت عبادت کرنا ہے، بلکہ معرفت اور اس کے شرائط کے ساتھ رات بھر جاگ کر عبادت کرنا ہے، اگرچہ کما حقہ شبِ قدر کا ادراک کسی بھی غیر معصوم کے لئے ناممکن ہے۔

---

[1] تفسیر ام الکتاب، سید حسن میر جہانی، ص ۹۳.
[2] سورۂ قدر، آیت ۳.

شب قدر، بابرکت شب ہے: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ﴾[۱] ''ہم نے اس قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل کیا ہے''۔ اور وہ مبارک رات یعنی پُر برکت رات شبِ قدر ہی ہے؛ کیونکہ ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾[۲] ''ہم نے اس قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے''۔ اس تفسیر القرآن بالقرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ مبارک رات شبِ قدر ہی ہے جس میں اللہ نے قرآن کریم کو نازل کیا ہے۔ برکت یعنی خیر کثیر کا تسلسل ہے۔ شبِ قدر، نزولِ قرآن کریم کی بناپر پُر خیر و برکت ہے، انیسویں تاریخ کی اس دعاکے پہلے فقرہ میں اللہ سے عاجزانہ درخواست یہ ہے خدایا! اس ماہ کی برکتوں کو میرے حصّے میں قرار دے، اور دوسرے فقرہ میں التجا ہے، خدایا! اس ماہ کی خیرات اور نیکیوں کی طرف میری راہ کو آسان کردے، گویا آج کی دعا میں اللہ سے خیر و برکت کی امید میں بندہ اس کی بارگاہ میں دستِ بدعا ہے اور شبِ قدر، شبِ پُر خیر و برکت ہے، لہٰذا خالق کی بارگاہ میں دعا ہے خدایا! تجھے واسطہ اس سر شگافتہ کا جس کے خون سے محرابِ مسجد، خونین ہوگیا اور جہاں سے "فزت و رب الکعبة" کی صدا بلند ہوئی اور فضا میں ایک اور آواز گونجی، "قد تھدمت ارکان الھدی" خدایا تجھے ان آوازوں کا بھی واسطہ اس ماہِ مبارک بالخصوص، اس شب کے خیر و برکت سے ہمیں محروم نہ فرما۔

---

[۱]۔ سورہ دخان، آیت ۳.

[۲]۔ سورہ قدر، آیت ۱.

تیسرا فقرہ: "وَلاَ تَحْرِمْنِی قَبُولَ حَسَنَاتِهِ"

خالق کائنات کی بارگاہ میں التجا ہے: خدایا! اس ماہ کی نیکیوں کی قبولیت سے مجھے محروم نہ فرما۔

حسنہ کی تعریف

"حَسَنَہ"، نیکی کو کہتے ہیں جس کی جمع "حَسَنات" ہے۔ حسنہ کی تعریف میں راغب اصفہانی لکھتے ہیں: حسنہ ہر اُس نعمت کو کہتے ہیں (چاہے وہ دنیوی ہو یا اُخروی) جس کے پانے سے انسان کی روح اور جسم کو سرور حاصل ہوتا ہے[1]۔ اور اس کی ضد "سیّئہ" ہے:

﴿فَمِنْ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الآخِرَةِ مِنْ خَلاَقٍ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾[2]

"پس لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں ہی نیکی عطا کردے اور ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں ہے اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو یہ کہتا ہے اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی نیکی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور ہم کو جہنم کی آگ سے محفوظ فرما"

۱۔ مفردات راغب، مادۂ "حسن"۔

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۰۰ و ۲۰۱۔

اِن دو آیتوں سے لوگوں کے طرزِ تفکر کا اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں صرف دنیا ہی کی فکر ہے اور اپنی زبانِ حال سے صرف اور صرف دنیا کی نعمتیں ہی خدا سے چاہتے ہیں اور آخرت کی انھیں فکر نہیں ہوتی، لہٰذا خداوند کریم نے اُن کے لئے کہہ دیا: ﴿مَا لَهُ فِي الآخِرَةِ مِنْ خَلاَقٍ﴾ ''ان کے لئے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں ہے''۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ کی نعمتوں سے سرشار رہنا چاہتے ہیں، لہٰذا دنیا و آخرت میں ہر وہ چیز جو رضائے معبود کا سبب ہے اُسے طلب کرتے ہیں، امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

" أَنَّهَا(حَسَنَة) السَّعَةُ فِي الرِّزْقِ وَ الْمَعَاشِ وَ حُسْنُ الْخُلُقِ فِي الدُّنْيَا وَ رِضْوَانُ اللَّهِ وَ الْجَنَّةُ فِي الْآخِرَةِ"[1]

''حسنہ یعنی رزق و روزی میں وسعت، دنیا میں حُسنِ خُلق، اللہ کی رضایت اور آخرت میں جنت''

گویا امام معصوم نے مذکورہ حدیث میں ''حَسَنہ'' کے مصادیق کو شمار کیا ہے اور اس کے علاوہ دیگر احادیث میں ان کے اور مصادیق کا بھی ذکر ہے جیسے اللہ کا شکر بجالانے والا دل، ذکرِ حق کرنے والی زبان، باایمان زوجہ یہ سب حسنات میں سے ہیں۔ ان سے واضح ہے خیر و حسنہ کے مفہوم میں اشتراک ہے مگر مفہومی اعتبار سے ''حسنہ'' کا دائرہ وسیع ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، ج۱، ص۲۹۷.

جب قلب کا شاکر ہونا اور زبان کا ذاکر ہونا دوسروں کے ساتھ حُسنِ خُلق کے ساتھ پیش آنا مسلّماً نیکی و حسنہ ہے تو اِن امور کو خلوص دل سے بارگاہ خداوندی میں پیش کرے تاکہ اِن نیکیوں کو سندِ قبولیت عطا ہوسکے اور ایک نیکی کے عوض اللہ کی بارگاہ سے اس کی مانند دس نیکیاں حاصل کرسکے ﴿مَنْ جاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾[۱] ''جو بھی (خدا کی بارگاہ میں) ایک نیکی لے کر آئے گا پس اس کو اسی کے مانند دس نیکیاں ملیں گی''۔

حسنات (نیکیاں) قبول ہونے کے شرائط

اعمال و عبادات کے لئے دو اہم شرط ہیں: ۱۔شرطِ صحت ۲۔شرطِ قبولیت

پہلی شرط یہ ہے کہ بندہ دستور الٰہی کے مطابق عمل بجالائے، مثلاً نماز کو اس کے تمام اجزاء و شرائط کے ساتھ موانع سے اجتناب کرتے ہوئے بجالائے تو اس کی نماز صحیح ہے البتہ دوسری شرط یہ ہے کہ عمل اور عبادت کی قبولیت کے لئے چند چیزوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے ان میں سے کچھ امور مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ایمان

﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْأِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ﴾[۲]

''اور جو بھی ایمان کا منکر ہوگا پس اس کا عمل ضائع ہوگا''

۱۔ سورۂ انعام، آیت ۱۶۰.

۲۔ سورۂ مائدہ، آیت ۵

اس آیہ کریمہ سے یہ بات واضح ہے کہ خود عمل کا نیک ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ صاحب عمل کا باایمان ہونا بھی ضروری ہے بغیر ایمان کے اللہ کے نزدیک کوئی بھی عمل قابل قبول نہیں ہے۔

۲۔ تقویٰ

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنْ الْمُتَّقِينَ﴾[1]

''خدا صرف صاحبانِ تقویٰ کے اعمال کو قبول کرتا ہے''

اعمال کی قبولیت کا دارومدار تقویٰ پر ہے اور اخلاص تقویٰ کی نشانی ہے اگر عمل انجام دینے کا مقصد دوسروں کو دکھانا ہے تو وہ عمل بارگاہِ الٰہی میں قابل قبول نہیں ہے۔

۳۔ ولایت

امام معصومؑ کا ارشاد ہے:

"فَمَنْ لَمْ يَتَوَلَّنَا لَمْ يَرْفَعِ اللَّهُ لَهُ عَمَلًا"[2]

''جو بھی ہماری ولایت کو قبول نہیں کرے گا خدا اس کے عمل کو قبول نہیں کرسکتا''

ان کے علاوہ آیات و روایت میں اور بھی شرائط کا ذکر موجود ہے جیسے حقوق الناس کی رعایت، حُسنِ خُلق، صلۂ رحمی وغیرہ جو قبولیت اعمال کے لئے ضروری ہے۔ خدا کی بارگاہ میں دعا ہے: اے مالک سب سے پہلے ہمیں نیک اعمال بجالانے کی توفیق عطا فرما، پھر انھیں سندِ قبولیت عطا فرما۔

---

[1]۔ سورۂ مائدہ، آیت ۲۷

[2]۔ کافی، ج۱، ص ۴۳۳

بیسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِی فِیهِ أَبْوابَ الْجِنانِ، وَأَغْلِقْ عَنِّی فِیهِ أَبْوابَ النِّیرانِ وَوَفِّقْنی فِیهِ لِتِلاوَةِ الْقُرْآنِ، یَا مُنْزِلَ السَّکِینَةِ فِی قُلُوبِ الْمُؤْمِنِینَ».

"خدایا! آج میرے لئے جنت کے دروازوں کو کھول دے اور مجھ پر جہنم کے دروازوں کو بند کردے اور اس دن میں مجھے تلاوتِ قرآن کی توفیق عطا فرما۔ اے صاحبانِ ایمان کے دلوں پر تسلّی وسکون نازل کرنے والے"

اہم مطالب:

اس دعا میں بارگاہ الٰہی میں تین حاجتوں کا ذکر ہے:

۱۔ جنت میں جانے کی تمنا اور آرزو۔

۲۔ جہنم سے نجات۔

۳۔ تلاوتِ قرآن کریم کرنے کی توفیق۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِی فِیهِ أَبْوابَ الْجِنانِ"

"ابواب الجنان" باب کی جمع ابواب ہے اور عربی میں باب کے معنیٰ دروازہ کے ہیں "جِنان" زیر کے ساتھ باغ اور بہشت کے معنیٰ میں ہے۔

آج کی دعا یہ ہے کہ خدایا! آج کے دن میرے لئے جنت کے دروازوں کو کھول دے۔ "ابواب" جمع کے ساتھ اس لئے ذکر ہوا ہے کہ حدیثِ معراج اور دیگر احادیث سے یہ بات واضح ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہوں گے اور ہر دروازہ پر کلمہ "لاالٰہ الّا اللہ، محمد رسول اللہ، علی ولی اللہ" تحریر ہوگا۔ ظاہر سی بات ہے کہ ان کے بھی درجات اور مراتب ہوں گے اور اسی اعتبار سے وہ مخصوص دروازوں سے داخل بہشت ہوں گے۔

جنت انسان کے ایمان اور اعمال صالحہ کی جزا ہے جسے خداوند کریم آخرت میں بندۂ مومن کو عطا کرے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ربّ العزت ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ﴾[1]

"جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے بے شک ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب انہیں نعمتوں والی جنت کی راہ دکھائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی"

۱۔ سورۂ یونس، آیت ۹.

مذکورہ بالا آیۂ کریمہ اور اس کے مانند دیگر قرآنی آیات اور معصومین علیہم السلام کی احادیث سے یہ بات واضح ہے کہ جنت صرف دعا اور آرزوں سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ تکمیلِ آرزو و دعا کی شرط ایمان اور اعمال صالحہ ہے۔ خدایا! اس ماہ میں میرے لئے جنت کے دروازے کھول دے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پروردگارا مجھے میرے اُن گناہوں سے چھٹکارا عطا کر جن کے ہوتے ہوئے حصول جنت ناممکن ہے اور آئندہ گناہوں سے بچتے رہنے کی توفیق عطا فرما؛ کیونکہ جنت کا حصول ایمان اور اعمال صالحہ پر موقوف ہے مگر بعض گناہ ایسے ہیں جن سے نیک اعمال برباد ہوجاتے ہیں چنانچہ امام علی رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"اتَّقُوا الذُّنُوبَ فَإِنَّهَا مَمْحَقَةٌ لِلْخَيْرَاتِ"[1]

"گناہوں سے بچو؛ کیونکہ گناہ انسان کے نیک اعمال کو برباد کردیتی ہیں"

چنانچہ خدا سے حصولِ جنت کے لئے دعا کرنا دراصل گناہوں سے بچتے رہنے، ایمان کی سلامتی اور نیک اعمال کے انجام دہی کی توفیق کے لئے دعا کرنا ہے۔

حصولِ جنت کے اسباب:

احادیث معصومین علیہم السلام میں جنت میں داخل ہونے کے اسباب و عوامل کا ذکر موجود ہے اُن میں سے چند کا ذکر مندرجہ ذیل ہے:

---

[1] ۔ میزان الحکمۃ، ج ۳، ص ۴۶۵۔

۱۔ توحید

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: ''قَوْلُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ثَمَنُ الْجَنَّةِ'' ''کلمہ لاالٰہ الّا اللہ جنت کی قیمت ہے''۔[۱]

البتہ یہاں پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ''لاالٰہ الّا اللہ'' اپنے شرط و شروط کے ساتھ ہے چنانچہ حدیث سلسلۃ الذھب سے واضح ہے۔

امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اللَّهَ عَزَّ وَ جَلَّ يَقُولُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ حِصْنِي فَمَنْ دَخَلَ حِصْنِي أَمِنَ مِنْ عَذَابِي قَالَ فَلَمَّا مَرَّتِ الرَّاحِلَةُ نَادَانَا بِشُرُوطِهَا وَ أَنَا مِنْ شُرُوطِهَا"[۲]

''اللہ جلّ جلالہ کا ارشاد گرامی ہے: ''لاالٰہ الّا اللہ'' میرا مضبوط قلعہ ہے جو بھی اس میں داخل ہوگا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو جائے گا مگر اس کے لئے شروط ہیں اور اُن شروط میں سے ایک میں ہوں''

یعنی امامت و ولایتِ ائمہ اہل بیت علیہم السلام شرطِ توحید ہے اور ولایت و امامت کا تصور، اتباع کے بغیر ناممکن ہے۔

۲۔ ایمان اور عمل صالح

خداوند کریم کا ارشاد ہے:

۱۔ التوحید، شیخ صدوقؒ، ص۲۱.

۲۔ عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج۲، ص۱۳۵.

﴿وَمَنْ يَعْمَلْ مِنْ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنثَي وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُوْلَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلاَ يُظْلَمُونَ نَقِيراً﴾[۱]

"اور جو بھی نیک اعمال انجام دے گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ صاحب ایمان ہو ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا اور اُن پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا"

مولائے کائنات حضرت امام علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"الْجَنَّةُ جَزَاءُ كُلِ مُؤْمِنٍ مُحْسِن"[۲]

"جنت ہر نیک عمل انجام دینے والے صاحبِ ایمان کی جزا ہے"

۳۔ تقوا و پرہیزگاری

قران کریم میں ارشاد رب العزت ہے:

﴿وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآب، جَنَّاتِ عَدْن مُفَتَّحَةً لَهُمْ الأَبْوَابُ﴾[۳]

"اور صاحبان تقویٰ کے لئے بہترین ٹھکانہ ہے، وہ دائمی جنتیں ہیں جن کے دروازے ان کے لئے کھُلے ہوں گے"

۴۔ نیک اوصاف اور اخلاق

امام صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

۱۔ سورۂ نساء، آیت ۱۲۴.
۲۔ غرر الحکم ودرر الکلم، حدیث ۵۲.
۳۔ سورۂ ص، ۴۹ و ۵۰.

"ثَلَاثٌ مَنْ أَتَی اللَّهَ بِوَاحِدَةٍ مِنْهُنَ أَوْجَبَ اللَّهُ لَهُ الْجَنَّةَ الْإِنْفَاقُ مِنَ الْإِقْتَارِ وَ الْبِشْرُ بِجَمِیعِ الْعَالَمِ وَ الْإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِهِ".[1]

تین امور ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی خدا کے لئے انجام دے گا تو خداوند کریم اُس پر جنت کو واجب قرار دے گا

۱۔ تنگدستی میں انفاق

۲۔ ہر ایک کے لئے خوش روئی اور خوش خلقی

۳۔ عدل وانصاف کی رعایت

مہمانوازی کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"الضَّیْفُ دَلِیلُ الْجَنَّةِ".[2] ''مہمان جنت کا رہنما ہے''۔

سخاوت کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"الْجَنَّةُ دَارُ الْأَسْخِیَاءِ".[3] ''جنت سخی افراد کا گھر ہے''۔

اسی طرح صبر، شجاعت، جہاد، و..... کے لئے آیات اور احادیث میں ان کی جزا جنت کو قرار دیا گیا ہے۔

دوسرا فقرہ: "وَأَغْلِقْ عَنِّی فِیهِ أَبْوَابَ النِّیرَانِ"

''خدایا! آج کے دن مجھ پر جہنم کے دروازوں کو بند کر دے''

---

[1]۔ کافی، ج ۲، باب حسن البشر، ص ۱۰۳.

[2]۔ بحار الانوار، ج ۲، ص ۷۳، ح ۷.

[3]۔ جامع الاخبار، ج ۱۱۲.

"اِغلق" "اِفتح" کی ضد ہے اس دعا کے پہلے جملہ میں جہاں خدا سے جنت کے دروازوں کو اپنے لئے کھولنے کی خواہش ہے وہیں پر دوسرے جملہ میں اپنے لئے جہنم کے دروازوں کو بند کرنے کی تمنا ہے۔ صیغۂ ابواب سے واضح کہ جس طرح جنت کے متعدد دروازے ہوں گے اسی طرح اہل جہنم کے لئے بھی جہنم میں داخل ہونے کے متعدد دروازے ہوں گے۔ احادیث معصومین سے یہ بات واضح ہو چکی کہ جنت کے آٹھ دروازے ہوں گے مگر جہنم کے کتنے دروازے ہوں گے اس کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے اور احادیث سے واضح ہے کہ ہر دروازہ الگ الگ نوعیت کے گناہگاروں کے لئے مخصوص ہے۔

خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ، لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ﴾[1]

"اور ان سب کی وعدہ گاہ جہنم ہے جس کے سات دروازے ہیں ہر دروازے کے لئے ان کا ایک حصّہ مخصوص کر دیا گیا ہے"

جو بات اس دعا کے پہلے فقرہ کے ذیل میں کہی گئی ہے وہی بات یہاں پر بھی ہے یعنی صرف دعا کرنے اور خواہش اور درخواست کرنے سے جہنم کے دروازے بند نہیں ہو جائیں گے، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان ایمان اور اعمال صالحہ کو انجام دے اور خود کو گناہوں سے محفوظ رکھے، مختصر یہ ہے کہ جن امور کی بنیاد پر انسان

---

[1] سورۂ حجر، آیت ۴۳ و ۴۴۔

داخل بہشت ہوتا ہے وہی امور جہنم میں جانے سے روکتے ہیں اور جن امور کی بناپر انسان واصل جہنم ہوتا ہے وہی دخولِ جنت کے لئے مانع ہیں۔

احادیث معصومین علیہم السلام میں اُن اسباب کا ذکر موجود ہے جس کی بناپر انسان خود پر جہنم کے دروازوں کو بند کرسکتا ہے اور ہم اُن میں سے بعض کا ذکر مندرجہ ذیل عبارت میں کررہے ہیں:

خود پر جہنم کے دروازوں کو بند کرنے کے اسباب

۱، ۳، ۲۔ نماز، روزہ اور صدقہ

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: جہنم کے دروازے پر یہ لکھا ہوا ہے:

"أَنَا حَرَامٌ عَلَى الْمُتَهَجِّدِينَ، أَنَا حَرَامٌ عَلَى الصَّائِمِينَ، أَنَا حَرَامٌ عَلَى الْمُتَصَدِّقِينَ.[۱]

"(جہنم کہتی ہے) میں نمازِ شب پڑھنے والوں پر حرام ہوں اور میں روزہ داروں پر حرام ہوں اور میں صدقہ دینے والوں پر حرام ہوں"

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"الصَّوْمُ جُنَّةٌ مِنَ النَّار"[۲]

"روزہ (روزہ دار کے لئے) جہنم کے مقابل ڈھال ہے"

۱۔ مدینۃ المعاجز الائمۃ الاثنا عشر، ج ۲، ص ۱۵۴.

۲۔ بحار الانوار، ج ۹۶، ص ۲۵۶.

۴۔ محبت و ولایت امیر المومنین علیہ السلام

امام محمد باقر علیہ السلام اپنے آباء و اجداد سے نقل کرتے ہوئے ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے خطاب کرکے فرمایا:

"كَيْفَ بِكَ يَا عَلِيُّ إِذَا وَقَفْتَ عَلَى شَفِيرِ جَهَنَّمَ وَ قَدْ مُدَّ الصِّرَاطُ وَ قِيلَ لِلنَّاسِ جُوزُوا وَ قُلْتَ لِجَهَنَّمَ هَذَا لِي وَ هَذَا لَكِ فَقَالَ عَلِيٌّ ع يَا رَسُولَ اللَّهِ وَ مَنْ أُولَئِكَ قَالَ أُولَئِكَ شِيعَتُكَ مَعَكَ حَيْثُ كُنْتَ"[۱].

"اے علی! اس وقت تم کیسا محسوس کروگے جب تم، دوزخ کے اوپر واقع پل صراط پر کھڑے ہوگے اور لوگوں سے اُس وقت کہا جائے گا اس پُل پر سے گذر جاؤ اور تم اس وقت جہنم سے خطاب کرکے کہوگے: یہ شخص میرا ہے اور یہ تیرا، حضرت علی علیہ السلام نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا یا رسول اللہ وہ لوگ کون ہوں گے جو میرے ہوں گے، رسول نے فرمایا: وہ آپ کے شیعہ ہوں گے اور جہاں آپ رہیں گے وہاں یہ لوگ بھی رہیں گے"

یقیناً یہ حدیث اور اس جیسی اور بھی احادیث اس بات پر گواہ ہیں کہ ولایتِ محمدؐ آل محمدؐ کے حامل پر جہنم کی آگ حرام ہے مگر یاد رہے اہلبیت علیہم السلام کا موالی اور شیعہ ہونا عمل اور اتباع پر موقوف ہے، بسا اوقات بعض لوگ اپنے کو بڑے شیعہ اور علی والے کہلوانے کے لئے شانِ ائمہؑ میں غُلو کرتے ہوئے اپنی من گھڑت انفرادی راہ پر

۱۔ امالی، شیخ مفید، ص۲۷۵.

چل نکلتے ہیں اور جو بھی اُن کی اس روش کا مخالف ہوتا ہے اُسے نعوذ باللہ دشمنِ اہلبیت سمجھنے لگتے ہیں، جب کہ حقیقی علی والا وہی ہوتا ہے جو اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلے اور امام علی علیہ السلام کا راستہ وہی ہے جس کا ذکر سورۂ حمد میں موجود ہے ﴿صِرٰطَ الَّذِينَ أَنعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ وہ راستہ جس پر اللہ نے نعمتوں کا نزول کیا ہے۔

دخول جہنم کے اسباب:

احادیث میں جہنم میں جانے کے متعدد اسباب و عوامل کا ذکر ہے جن میں سے بعنوان مثال دو کا ذکر مندرجہ ذیل عبارت میں کر رہے ہیں:

ا۔ جھوٹ اور کذب

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ فَجَرَ وَ إِذَا فَجَرَ كَفَرَ وَ إِذَا كَفَرَ دَخَلَ النَّار"[1]

"جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فاجر ہو جاتا ہے اور جب فاجر ہو جاتا ہے تو کافر ہو جاتا ہے اور کافر جہنم میں داخل ہوگا"

یاد رہے کذب گناہ کبیرہ ہے لیکن ہر کذب، فقہی اعتبار سے موجبِ کفر نہیں ہے، ہاں ضروریاتِ دین کی تکذیب موجبِ کفر ہے، البتہ کفر بھی کے مختلف اقسام ہیں جن کی تفصیل اس موضوع سے مربوط کتابوں میں مذکور ہے۔

---

[1] ارشاد القلوب الی الصواب، ج۱، ص۱۸۵.

۲۔ عالم بے عمل

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الْعُلَمَاءُ رَجُلَانِ رَجُلٌ عَالِمٌ آخِذٌ بِعِلْمِهِ فَهَذَا نَاجٍ وَ عَالِمٌ تَارِكٌ لِعِلْمِهِ فَهَذَا هَالِكٌ إِنَّ أَهْلَ النَّارِ لَيَتَأَذَّوْنَ مِنْ نَتْنِ رِيحِ الْعَالِمِ التَّارِكِ لِعِلْمِهِ"[۱]

"علماء دو طرح کے ہیں کچھ عالم، باعمل ہیں جو نجات یافتہ ہیں اور کچھ عالم، بے عمل ہیں جو ہلاک ہونے والے ہیں اور اہل جہنم اُن کی بدبو سے پناہ مانگیں گے"۔

خالق کائنات سے اس برکتوں اور رحمتوں کے مہینہ میں ہماری دعا یہی ہے کہ خدایا! ہمیں ان امور کی توفیق عطا فرما جن کی بنا پر جنت نصیب ہو اور اُن برائیوں سے نجات عطا فرما جن کے سبب آتشِ جہنم کے حوالے کیا جائے گا۔

تیسرا فقرہ: "وَوَفِّقْنِي فِيهِ لِتِلاوَةِ الْقُرْآنِ، يَا مُنْزِلَ السَّكِينَةِ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ"

"اور اس دن میں تلاوت قرآن کی توفیق عطا فرما اے صاحبان ایمان کے دلوں میں سکون و تسلی نازل کرنے والے"

تلاوت کے معنی پڑھنے کے ہیں اور قرآنِ کریم کی تلاوت باعثِ ثواب ہے، اس بارے میں متعدد احادیث موجود ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

---

[۱]۔ بحار الانوار، ج ۲، ص ۱۰۶۔

"الْقُرْآنُ عَهْدُ اللَّهِ إِلَى خَلْقِهِ فَقَدْ يَنْبَغِي لِلْمَرْءِ الْمُسْلِمِ أَنْ يَنْظُرَ فِي عَهْدِهِ وَ أَنْ يَقْرَأَ مِنْهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ خَمْسِينَ آيَةً".[۱]

"قرآنِ کریم مخلوق کے لئے خالق کا عہد و پیمان ہے اور ایک مسلمان کے لئے سزاوار ہے کہ وہ اپنے عہد و پیمان کو دیکھے اور ہر دن اس سے پچاس آیتوں کی تلاوت کرے"

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"نَوِّرُوا بُيُوتَكُمْ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ.... فَإِنَّ الْبَيْتَ إِذَا كَثُرَ فِيهِ تِلَاوَةُ الْقُرْآنِ أَضَاءَ لِأَهْلِ السَّمَاءِ كَمَا تُضِيءُ نُجُومُ السَّمَاءِ لِأَهْلِ الدُّنْيَا".[۲]

"اپنے گھروں کو تلاوت قرآن سے روشن کرو کیونکہ جس گھر میں کثرت سے قرآنِ کریم کی تلاوت ہوتی ہے وہ گھر آسمان والوں کے لئے ویسے ہی روشن اور منور ہوتا ہے جس طرح اہل زمین کے لئے آسمان کے ستارے روشن اور چمکدار ہوتے ہیں"۔

قرآنِ کریم اور ماہِ رمضان میں بہت گہرا ربط ہے، چونکہ اسی ماہِ مبارک میں شبِ قدر بھی ہے جس میں قرآنِ کریم کا نزول دفعی ہوا ہے لہٰذا یہ مہینہ حقیقتِ قرآن کے ساتھ متحد ہے۔

۱۔ اصول کافی، ج ۴، ص ۱۴۴.
۲۔ اصول کافی، ج ۴، ص ۱۴۴.

حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماہِ شعبان کے آخری خطبے میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس مہینے میں ایک آیت کی تلاوت دوسرے ماہ مہینوں میں ختمِ قرآن کے برابر ہے[1]۔

امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"لِكُلِّ شَيْءٍ رَبِيعٌ، وَ رَبِيعُ الْقُرْآنِ شَهْرُ رَمَضَانَ".[2]

"ہر چیز کے لئے بہار ہوتی ہے اور قرآن کریم کی بہار ماہِ رمضان ہے"

یاد رہے قرآن ایسی کتاب نہیں ہے جسے سرسری طور پر میں پڑھ کر آگے بڑھ جائے، بلکہ اس کے پڑھنے کے ظاہری اور باطنی آداب احادیث کی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں جیسے طہارت اور وضو کے ساتھ، مسواک کرنے کے بعد، بہترین لبُ و لہجے میں، روبقبلہ بیٹھ کر، سکون و اطمینان، استعاذہ (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) اور بسم اللہ کے ساتھ شروع کرے اور ساتھ ہی ساتھ معانی و مفاہیم کی طرف بھی متوجہ رہیں اور آیات کو سمجھ کر اس میں غور و فکر کریں؛ کیونکہ قرآن کے نزول کا مقصد اور ہدف صرف تلاوت نہیں ہے، بلکہ یہ کتاب، لوگوں کی عمومی ہدایت اور متقین کی خصوصی ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہے جیسا کہ خود "ھدیً للمتقین" اور "ھدیً للناس" سے روشن ہے اور یہ ہدایت، اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس میں غور و فکر نہ کیا جائے چنانچہ ارشاد رب العزت ہے:

﴿أَفَلاَ يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَي قُلُوب أَقْفَالُهَا﴾[3]

---

[1] ۔ عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج۲، ص۲۶۶.

[2] ۔ وسائل الشیعہ، ج۷، ۱۸۵.

[3] ۔ سورۂ محمد، آیت ۲۴.

”کیا لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قُفل پڑے ہوئے ہیں“

اگرچہ جو شخص غور و فکر کے بغیر بھی قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے تو اسے تلاوت کا ثواب تو مل جاتا ہے، لیکن بہت سی دوسری نعمتوں اور فائدوں سے محروم رہ جاتا ہے اگر عربی سے ناواقف ہے تو کم از کم اس کے ترجمہ کے مطالعہ کے ذریعہ بھی ابتدائی غور و فکر کر سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم سے مستفید ہونے کے تین مرحلے ہیں:

۱۔ تلاوت: قرآن مجید کی تلاوت نہ صرف عبادت اور بے شمار ثواب و جزا کا سبب بنتی ہے، بلکہ بعد کے مرحلوں کے لئے راہ بھی ہموار کرتی ہے۔

۲۔ آیات کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اگر انسان اُن میں غور و فکر کرے تو یہ کام اس کے لئے بے انتہا مفید واقع ہوگا اور اس کی معرفت کی بلندی کا سبب بھی بنے گا۔

۳۔ عمل: جس طرح تلاوت، غور و فکر کرنے کے لئے راہ ہموار کرتی ہے اسی طرح قرآن میں غور و فکر کرنا اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کا باعث ہوتا ہے اور یہ سب سے اہم مرحلہ ہے اگر کوئی شخص قرآن پر عمل نہیں کرتا تو گویا اس نے اس کے ہدف اور مقصد کو پوار نہیں کیا چنانچہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"رُبَ تَالِي الْقُرْآنِ وَ الْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ".[1]

"بہت سے لوگ قرآن پڑھتے ہیں، لیکن قرآن ان پر لعنت کرتا ہے"

یہ وہی لوگ ہیں جو قرآن پڑھتے تو ہیں مگر اس کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے۔

آج کے دن کی دعا میں معبود سے خطاب ہے اے مومنین کے دلوں میں سکون نازل کرنے والے، جیسا کہ خود قرآن کریم میں بھی ارشاد ہوا ہے: ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ﴾[2] "وہی خدا جس نے مومنین کے دلوں میں سکون نازل کیا"۔ تلاوت قرآن ذکر الٰہی ہے جس کے ذریعہ دلوں کے سکون و اطمینان کا سامان مہیا ہوتا ہے: ﴿أَلاَ بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾[3] "آگاہ ہو جاؤ یادِ الٰہی ہی سے اطمینان حاصل ہوتا ہے"۔ لہٰذا اے مہربان خدا ہمارے دلوں کو آج کے دن تلاوت قرآن کریم کی توفیق عطا فرما اور ہمارے دلوں کو نورِ قرآن سے منور فرما اور تلاوتِ قرآن کے ذریعہ ہمارے دلوں کو سکون و اطمینان عطا فرما۔

آج کی شب ویسے بھی شبِ قدر ہے: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ آج ہی کی شب اللہ نے قرآن کو نازل کیا ہے اور یہ شب حقیقتِ قرآن سے متحد ہے اسی رات تقدیریں لکھی جاتی ہیں، اس رات کا ہر عمل ہزار مہینوں کے عمل سے بہتر ہے، لہٰذا یہ شبِ قرآن سے وابستگی کی شب ہے اور خالق کائنات کی بارگاہ میں خضوع و خشوع کے ساتھ دعائیں مانگنے اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کی شب بھی ہے۔ دوسرے

---

[1]۔ جامع الاخبار، ص ۴۸.

[2]۔ سورۂ فتح، آیت ۴.

[3]۔ سورۂ رعد، آیت ۲۸.

لفظوں میں یہ کہا جائے کہ یہ شب، قرآنِ صامت کے نزول اور قرآن ناطق کے صعود کی شب ہے، قرآنِ ناطق نے بھی ہمارے لئے جو آخری وصیت کی ہے، اس میں بھی قرآن کریم سے متعلق ہمیں تاکید فرمائی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے غیر قرآن پر عمل کرنے میں تم سے آگے نکل جائیں۔[1]

خدایا تجھے قرآنِ صامت اور قرآن ناطق کا واسطہ مرتے دم تک ہمیں ان دونوں سے وابستہ رہنے کی توفیق عطا فرما۔

---

[1] ۔ نہج البلاغہ

اکیسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِی فِیهِ إلی مَرْضاتِكَ دَلِیلاً، وَلاَ تَجْعَلْ لِلشَّیْطانِ فِیهِ عَلَیَّ سَبِیلاً، وَاجْعَلِ الْجَنَّةَ لِی مَنْزِلاً وَمَقِیلاً، یَا قاضِیَ حَوائِجِ الطَّالِبِینَ».

''خدایا! آج کے دن اپنی رضا و خوشنودی کی طرف میری رہنمائی فرما اور اس دن میں مجھ پر شیطان کو تسلط و اختیار نہ دے اور جنت کو میرا ٹھکانہ قرار دے، اے طلبگاروں کی حاجتیں پوری کرنے والے''

اہم مطالب:

اس دعا میں خداوند کریم کی بارگاہ میں تین اہم مطالب کا ذکر ہے:

۱۔ اللہ کی رضا و خوشنودی کی جانب رہنمائی۔

۲۔ شیطان کو خود پر تسلط اور اختیار نہ دینے کی دعا۔

۳۔ جنت کو اپنی منزل اور ٹھکانہ قرار دینے کی آرزو۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِي فِيهِ إلى مَرْضاتِكَ دَلِيلاً"

"مرضاتك" سے مراد، اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے اور دلیل سے مراد رہنمائی ہے گویا بندہ، خدا کی بارگاہ میں التجا کر رہا ہے کہ خدایا! تو مجھے اس چیز اور اس امر کی نشاندہی اور رہنمائی فرما جس میں تیری رضا اور خوشنودی پوشیدہ ہے، اللہ کی رضا و خوشنودی ایک مومن کی زندگی کے لئے معیار ہے اور مومن کی سب سے بڑی کامیابی رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ چانچہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں مومنین، جنت اور اس کے باغات کے ذکر کے ساتھ رضائے معبود کا بھی تذکرہ آیا ہے اور رضائے الٰہی کو بہت بڑی کامیابی قرار دیا گیا ہے:

﴿رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللهِ أَلاَ إِنَّ حِزْبَ اللهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾[1]

"خدا اِن سے راضی ہے اور وہ ہستیاں خدا سے راضی ہیں یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں اور آگاہ ہو جاؤ اللہ کا گروہ ہی نجات پانے والا ہے"

ایک اور مقام پر ارشاد ہو رہا ہے:

﴿وَرِضْوَانٌ مِنَ اللهِ أَكْبَرُ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾[2]

"اور اللہ کی رضا اور خوشنودی سب سے بڑی ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے"

---

[1]۔ سورۂ مجادلہ، آیت ۲۲.

[2]۔ سورۂ توبہ، آیت ۷۲.

اگرچہ دوسری تاریخ کی دعا کے پہلے جملہ "اَللّٰهُمَّ قَرِّبْنی فِیهِ إلی مَرْضاتِكَ" اور نویں تاریخ کی دعا کے تیسرے جملہ "وَخُذْ بِناصِیَتِی إلی مَرْضاتِكَ الْجامِعَةِ "کے ذیل میں رضا و خوشنودی الٰہی سے متعلق مختصر گفتگو ہو چکی ہے کہ کونسی چیزیں رضائے الٰہی کا موجب و سبب ہیں، ایمان اور عمل صالح، اطاعت پروردگار، تقوا و پرہیزگاری، رضایت اہل بیت علیہم السلام، راہِ خدا میں انفاق، ایثار و قربانی، جہاد و شہادت، صدق و صفا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور ماں باپ کی رضایت نیز ان کے علاوہ اور بھی امور ہیں جن کے انجام دینے سے رضایت الٰہی کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یاد رہے ایسا نہیں ہے کہ ان میں ہر ایک مستقل طور پر انجام دینے سے رضایتِ الٰہی کے حصول کا سبب ہے، بلکہ ان تمام امور کا انجام دینا ضروری ہے مثلاً اگر کوئی پوری عمر اللہ کی ظاہری عبادت کرتا رہے مگر اہل بیت علیہم السلام کی محبت و رضا حاصل نہ ہو وہ انسان کبھی اللہ کی رضایت کا حقدار نہیں بن سکتا۔ اہل سنت کے مشہور عالم اور مورخ ابن قتیبہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ سقیفہ کے واقعہ کے بعد ایک دن عمر نے ابو بکر سے کہا چلو چل کر دختر پیغمبرؐ کو راضی کر لیں، جب وہ درِ زہراؑ پر آئے تو شہزادیؑ نے انھیں گھر میں آنے کی بھی اجازت نہیں دی، پھر وہ چند روز بعد حضرت علی علیہ السلام کی مدد سے گھر میں داخل ہوئے اور فدک نہ دینے کی علت بیان کرنے لگے تو شہزادیؑ نے کہا: میرے بابا نے جو میرے بارے میں فرمایا وہ تمہیں یاد ہوگا "فاطمہؑ میرا جزء ہے جس نے فاطمہؑ کو ناراض کیا اس نے خدا اور رسولؐ کو ناراض کیا ہے"۔ اُن دونوں نے مل کر اس حدیث کی تصدیق کی، ہاں ہمیں یاد ہے رسول اللہ نے آپ کے بارے میں ایسا فرمایا ہے۔ تب شہزادی نے فرمایا: میں خدا اور ملائکہ کو گواہ بنا کر یہ کہہ رہی ہوں میں

تم دونوں سے ناراض ہوں اور اسی حالت میں اپنے بابا سے ملوں گی، یہ سن کر وہ دونوں روتے ہوئے چلے گئے۔[1]

مذکورہ حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کوئی لاکھ عبادت کرے اگر اس سے اہل بیت علیہم السلام راضی نہیں ہیں تو پھر خدا کی رضایت کا حصول بھی ناممکن ہے اور یہ بات بھی یاد رہے کہ کوئی بھی شخص اللہ اور رسول کی نافرمانی کرکے اہلبیت علیہم السلام کی رضایت وخوشنودی حاصل نہیں کرسکتا، ایسی صورت میں بھی اس کی دنیا اور آخرت دونوں ہی برباد ہے، لہٰذا خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ محمدؐ وآل محمد علیہم السلام کی خوشنودی بھی ضروری ہے۔

خالقِ کائنات کی بارگاہ میں دعا ہے کہ خدایا ہمیں رضایت خدا، رسول اور اہلبیت علیہم السلام سے محروم نہ فرما۔

دوسرا فقرہ: "وَلاَ تَجْعَلْ لِلشَّيْطانِ فِيهِ عَلَيَّ سَبِيلاً"

شیطان کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ

شیطان عربی لفظ ہے جس کی اصل وریشہ سے متعلق دو قول مشہور ہے:

پہلا قول: شَطَنَ، يَشطِنُ سے شیطان ہے جس کے معنیٰ "دور کیا ہوا" کے ہیں۔ اس قول کے مطابق ابلیس (جو شیطان کا نام ہے) کو شیطان اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ آدم کا سجدہ نہ کرنے کی بنا پر بارگاہِ رحمت سے دور کردیا گیا ہے۔ شیطان

---

[1] ۔ اعیان الشیعہ، ج۱، ص۳۱۸، بنقل از "الامامۃ والسیاسۃ"۔

یعنی راندۂ بارگاہِ رحمت لہٰذا وہ چیز جو انسان کو خدا کی رحمت سے دور کردے چاہے وہ جن ہو یا انسان یا کوئی اور چیز وہ شیطان ہے، کیونکہ شیطان ایک صفت ہے اور یہ کسی معین اور معلوم فرد کا نام نہیں ہے۔

دوسرا قول: شَاطَ، یَشِیطُ، شیطان جس کے معنیٰ جلانے والی آگ کے ہیں۔

اس قول کے مطابق چونکہ ابلیس کا وجود آگ سے ہے اس لئے اُسے شیطان کہا جاتا ہے۔

جو چیز بھی اعمال صالحہ کی نابودی کا سبب بنے وہ شیطان ہے۔

جو چیز نیکیوں کو جلا کر خاکستر کردے وہ شیطان ہے۔

پہلے اور دوسرے قول میں فرق یہ ہے کہ پہلے قول کے مطابق شیطان میں نون حرف اصلی ہے مگر دوسرے قول کے مطابق شیطان میں نون اضافی ہے۔ اکثر اہل لغت نے پہلے ہی قول کو قبول کیا ہے، لہٰذا ہر وہ چیز جو انسان کو حق سے اور رحمتِ خدا سے دور کردے وہ شیطان ہے۔

تمام بری صفتیں بھی شیطان کے حکم میں ہیں۔[1]

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ ہمیں حق اور رحمت سے دور کرنے والے ابلیس یا اس کے شاگرد ہی ہوں، بلکہ ہمارے اندر موجود بُری صفات بھی شیطان ہو سکتی ہیں جیسے حسد، کینہ، خود نمائی، تکبر، غضب، شہوت، وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ جو چیز بھی ہمیں حق سے منحرف کردے وہ طاغوت اور شیطان ہے چاہے وہ ٹی وی یا انٹرنیت یا کوئی اور چیز ہی کیوں نہ ہو۔

---

[1]۔ رک: کتب لغات، المفردات، قاموس اور تفسیر مجمع البیان، سورۂ حجر.

شیطان کے صفات قرآن کریم کی روشنی میں

قرآن کریم میں لفظ شیطان مفرد کی صورت میں ستر مرتبہ اور (شیاطین) جمع کی صورت میں اٹھارہ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

۱۔ شیطان انسان کا کھُلا ہوا دشمن ہے

قرآن کریم کی نگاہ میں شیطان انسان کا کھُلا ہوا دشمن ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُبِينٌ﴾[۱]

"یقیناً شیطان انسان کا کھُلا ہوا دشمن ہے"

ایک اور مقام پر ارشاد رب العزت ہے:

﴿إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ﴾[۲]

"شیطان تمہارا کھُلا ہوا دشمن ہے"

ایک اور مقام پر حضرت آدم اور حضرت حوّا سے خطاب کرتے ہوئے خالق کائنات ارشاد فرماتا ہے:

﴿أَقُلْ لَكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُبِينٌ﴾[۳]

"اور کیا میں نے تم دونوں کو نہیں بتایا تھا کہ شیطان تمہارا کھُلا ہوا دشمن ہے"

۱۔ سورۂ یوسف، آیت ۵.

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۶۸ و ۲۰۸؛ انعام، ۱۴۲؛ یٰسین، ۶۰؛ زخرف، ۶۲.

۳۔ سورۂ اعراف، ۲۲

۲۔ شیطان انسان کو فریب اور دھوکہ دینے والا ہے

جس وقت اللہ نے آدم کا سجدہ نہ کرنے پر شیطان کو اپنی بارگاہِ رحمت سے نکال دیا تو اس نے اللہ سے مہلت مانگی اور جب اللہ نے اُسے مہلت دی تو اس نے اللہ سے خطاب کرتے ہوئے قسم کھائی:

﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ، إِلاَّ عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلَصِينَ﴾[1]

''کہنے لگا: مجھے تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا، سوائے تیرے اُن بندوں کے جنھیں تو نے خالص بنالیا ہے''۔

آیۂ کریمہ سے واضح ہے کہ شیطان کا اختیار صالح اور مخلص بندوں پر نہیں چل سکتا۔

۳۔ شیطان انسان کو بُرائیوں کا حکم دیتا ہے

ارشاد ربّ العزّت ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾[2]

''اے ایمان والو! شیطان کے نقش قدم پر نہ چلنا اور جو شخص شیطان کے نقش قدم پر چلے گا اُسے شیطان ہر طرح کی بُرائی کا حکم دے گا''

اگر انسان شیطان کی پیروی کرے گا تو وہ آہستہ آہستہ انسان کو ہر برائی کا حکم دیتا رہے گا۔ شیطان کی پیروی کے مختلف مصادیق ہیں جیسے فاسد لوگوں کے ساتھ دوستی،

---

[1] سورۂ ص، ۸۲ و ۸۳.

[2] سورۂ نور، آیت ۲۱.

پھر اس کے بعد ان کے ہمراہ اٹھنا بیٹھنا، پھر گناہ کی فکر کرنا، پھر آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی برائیوں کو انجام دینا، پھر بڑے بڑے گناہوں کی فکر کرنا وغیرہ وغیرہ یہ شیطان کے نقوشِ قدم ہیں اگر انسان اِن راہوں پر چل نکلے گا تو پھر وہ شیطان کے دامِ فریب میں گرفتار ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ وہ شیطان کے ہر حکم کی پیروی کرتا رہے گا۔

یہ بات بھی حقیقت ہے کہ شیطان کبھی کسی کو گناہ کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ گناہ کی طرف بُلاتا ہے اور بُرے کاموں کو انسان کی نگاہوں میں سجا کر پیش کرتا ہے۔ یہ انسان ہے جو غفلت کی بناپر اس کی دعوت کو قبول کرکے اُس کی راہ پر چل پڑتا ہے اور جب قیامت کے دن خداوندِ کریم گناہگاروں کو اُن کے کئے کی سزا سنائے گا تو وہ لوگ شیطان کو اپنے گناہوں کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے، اُس وقت شیطان اُن سے کہے گا:

﴿وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلاَّ أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلاَ تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ﴾[1]

"اور میرا تمہارے اوپر کوئی زور بھی نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے اسے قبول کرلیا تو اب تم مجھے ملامت نہ کرو، بلکہ اپنے نفسوں کی ملامت کرو"

۴۔ شیطان انسان کے بُرے اعمال کو اس کی نگاہ میں سجا کر پیش کرتا ہے

جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

---

[1] سورۂ ابراہیم، آیت ۲۲.

﴿وَزَيَّنَ لَهُمْ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنْ السَّبِيلِ فَهُمْ لاَ يَهْتَدُونَ﴾[1]

''اور شیطان نے ان کے اعمال کو اُن کی نگاہ میں خوشنما بنادیا ہے اور اس طرح انہیں راہِ راست سے روک دیا ہے پس وہ ہدایت نہیں پائیں گے''

شیطان کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ بُرے اعمال ہی میں پڑے رہیں اور کبھی راہ حق کی شناخت نہ کرسکیں اسی لئے شیطان اُن کی نگاہ میں بُرے اعمال کو سجا کر پیش کرتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اللہ سے بصیرت کی دعا مانگے اور حقائق کو دیکھنے کی کوشش کرے۔ یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک انسان کو شیطان اور اس کے ہتھکنڈوں کی شناخت نہ ہوجائے اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ أَعْقَلَ النَّاسِ عَبْدٌ عَرَفَ رَبَّهُ فَأَطَاعَهُ وَ عَرَفَ عَدُوَّهُ فَعَصَاهُ"[2]

''لوگوں میں عقلمند ترین شخص وہ ہے جس نے اپنے رب کو پہچانا اور اس کی اطاعت کی اور اپنے رب کے دشمن کو پہچانا پس اس نے اس کی نافرمانی کی (اور اپنے آپ کو بچایا)''

لہٰذا رحمٰن کے ساتھ ساتھ شیطان کی شناخت بھی ضروری ہے۔

۱۔ سورۂ نمل، آیت ۲۴.

۲۔ بحار الانوار (ط-بیروت)، ج ۷۴، ص: ۱۷۹.

شیطان کا انسان کے دل میں رسوخ کرنے کے اسباب

ایسی بہت سی راہیں ہیں جن کی بناپر شیطان انسان کے دل میں گھر کرتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اُس کے نظام زندگی کو اپنے اختیار میں لے لیتا ہے اور پھر اس کا ولی سرپرست بن کر اُس سے وہی کام کرواتا ہے جو وہ چاہتا ہے، لہٰذا ہمیں اُن راہوں کو بند کردینا چاہیئے جن کے ذریعہ شیطان ہمارے دلوں میں وارد ہو سکتا ہے، ان میں سے ہم یہاں پر صرف چند کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ حسد و حرص

حسد اور حرص یہ ایسی دو روحانی بیماریاں ہیں جن کی بناپر انسان اپنی عقل پر قابو نہیں رکھ پاتا، جس کی بناپر انسان کے دل پر شیطان حکومت کرتا ہے، حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلْحَسَدُ مِقْنَصَةُ إِبْلِيسَ الْكُبْرَى "[1]

''حسد ابلیس کا بڑا جال ہے''

ایک اور مقام فرماتے ہیں:

"اَلْحَسَدُ شَرُّ الْأَمْرَاض "[2] ''حسد بد ترین بیماری ہے''

شیطان، حسد ہی کے ذریعہ انسان کے دل میں داخل ہوتا ہے اور حسد ہی کی بناپر حضرت آدمؑ کا سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے۔

---

[1]۔ میزان الحکمۃ، ۳، ص ۱۰۰.

[2]۔ میزان الحکمۃ، ۳، ص ۱۰۰.

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلْحَاسِدُ مُضِرٌّ بِنَفْسِهِ قَبْلَ أَنْ يُضَرُّ بِالْمَحْسُودِ كَإِبْلِيسَ أَوْرَثَ بِحَسَدِهِ لِنَفْسِهِ اللَّعْنَةَ."[۱]

"حسد کرنے والا جس سے حسد کر رہا ہے اس کو ضرر پہچانے سے پہلے خود اپنے آپ کو ضرر پہنچاتا ہے جس طرح ابلیس نے حسد کے ذریعہ اپنے لئے لعنت کو خرید لیا ہے"

اسی طرح حرص بھی ہے مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام حرص سے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلْحِرْصُ عَلَامَةُ الْأَشْقِيَاء"[۲] "حرص شقی آدمی کی نشانی ہے"۔

کیونکہ حریص آدمی اپنے ساتھ دوسروں کا حق بھی کھاجاتا ہے یہی وہ راہ ہے جس کے ذریعہ شیطان رسوخ کرتا ہے۔

۲۔ شہوت

شیطان کے رُسوخ کی راہوں میں سے ایک راہ، شہوت بھی ہے اگرچہ شہوت زندگی کا لازمہ ہے اگر شہوت نہ ہو تو دنیا میں زادِ ولد کا سسلسلہ ختم ہو جائے گا اسی لئے اسلام میں "نکاح" کا قانون موجود ہے اور اگر شہوت عقل پر غالب آجائے اور غیر

۱۔ میزان الحکمۃ، ۳، ص ۱۰۲.

۲۔ میزان الحکمۃ، ج ۳، ص ۲۳.

شر عی طریقہ سے ہو تو پھر وہ شیطان کے رسوخ کی راہ ہے حتی شہوت بھری نظر بھی ابلیس کی کمان کا تیر ہے چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"النَّظَرُ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ إِبْلِيسَ مَسْمُومٌ"[1]

"(بُری) نظر ابلیس کی کمان کے تیروں میں سے زہر آلود تیر ہے"

۳۔ وسوسہ اور بد گمانی

عام طور پر وسوسوں کا تعلق شیطان ہی سے ہوتا ہے اسی لئے سورۂ ناس میں آیا ہے:

﴿الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ، مِنْ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾[2]

"(میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے پروردگار کی) پسِ پردہ، رہ کر وسوسے ڈالنے والے (شیطان) کی شر سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے خواہ وہ جنّات میں سے ہوں یا انسانوں میں سے"

وسوسۂ شیطان اور شیخ انصاریؒ

ذبیح اللہ آخوندی، اپنے استاد آقائے دہشتؒ سے واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک شاگرد نے شیخ انصاری سے کہا میں نے کل رات خواب میں شیطان کو دیکھا جس کے پاس مختلف انداز کی رسیاں، تاگے اور زنجیریں تھیں، میں نے اس سے پوچھا یہ سب کیا ہیں؟ اس نے کہا: یہ سب وہ وسائل ہیں جن کے ذریعہ سے میں انسانوں کو گرفتار

۱۔ میزان الحکمۃ، ج ۳، ص ۲۳۔

۲۔ سورۂ ناس، آیت ۴و۵و۶۔

کرتا ہوں، میں نے پوچھا: یہ مختلف کیوں ہیں؟ تو اُس نے کہا کچھ وہ ہوتے ہیں جو ایک تاگے سے بھی گرفتار ہو جاتے ہیں اور کچھ وہ ہوتے ہیں جن کو گرفتار کرنے کے لئے رسیوں کی ضرورت پڑ جاتی ہے، کچھ وہ ہوتے ہیں جو آسانی سے میرے چنگل اور دامِ فریب میں نہیں آتے ہیں اُن کے لئے یہ زنجیریں ہیں۔

اُس کے پاس ایک بڑی زنجیر بھی تھی میں نے پوچھا یہ کس کے لئے ہیں، اُس نے کہا: یہ شیخ انصاریؒ کے لئے تھی میں نے آج اُن کے گلے میں ڈالا تو تھا مگر انہوں نے فوراً توڑ دی، یہ سن کر شیخ انصاریؒ نے فرمایا: اس نے سچ کہا کل میری بیٹی نے مجھ سے ایک نئی چادر کی خواہش کی مگر میرے پاس اس کے لئے پیسے نہیں تھے میں نے کہا اچھا انشاء اللہ جب پیسے آجائیں گے تو میں ضرور دلادوں گا یہ سن کر بیٹی نے کہا: بابا آپ کے پاس تو خمس کی رقم کافی مقدار میں رکھی ہوئی ہے اس میں سے آپ قرض لے لیں۔ بیٹی کی بات سن کر میرے دل میں بھی خیال آیا اور میں نے خمس کی رقم سے پیسہ نکالا اور دل میں کہا کہ جب آجائے گا تو اس میں رکھ دوں گا کیونکہ یہ دوسروں کا حق ہے، گھر سے باہر قدم رکھنے سے پہلے دل میں خیال آیا اے شیخ انصاریؒ یہ تو کیا کر رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو تیرے پیسے واپس رکھنے سے پہلے تجھے موت آجائے پھر اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ میں نے فوراً ان پیسوں کو اسی جگہ رکھ دیا۔[1]

یہ واقعہ اگرچہ خواب ہونے کی وجہ سے کسی کے لئے بھی حجت نہیں ہے مگر اس واقعہ سے ایک بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ کوئی بھی انسان کبھی بھی یہ نہ سمجھے کہ

---

[1] صبح رضوان، ذبیح اللہ آخوندی، ج ۴، ص ۵۸.

مجھے شیطان کبھی بہکا نہیں سکتا ہے، جب شیطان شیخ انصاریؒ جیسی مقدس شخصیت کے دل میں وسوسہ ڈال سکتا ہے تو ہماری کیا بساط ہے، میرے استاد اخلاق فرماتے تھے کہ کسی کے دل میں یہ خیال آنا کہ شیطان مجھے کبھی بہکا نہیں سکتا، یہ خود اپنی جگہ ایک شیطانی وسوسہ ہے جو شیطان نے اس کے دل میں ڈال دیا ہے اور اسی طرح کسی بھی فرد کے بارے میں بدگمانی کرنا بھی شیطانی وسوسہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِنْ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾[1]

"اے ایمان والو! اکثر بدگمانیوں سے پرہیز کرو کیونکہ بعض بدگمانیاں یقیناً گناہ ہیں"

ان کے علاوہ اور بھی راہیں ہیں جن کے ذریعہ شیطان انسان کا شکار کرتا ہے جیسے غصہ اور غضب، گمراہی اور یاد خدا سے غفلت وغیرہ۔

شیطان سے مقابلہ کی راہیں

آیات واحادیث کے اعتبار سے جن راہوں اور اسباب کے ذریعہ شیطان کا مقابلہ ممکن ہے اُن کی بھی ایک طویل فہرست ہے جن کے ذریعے انسان شیطان کا مقابلہ کرتے ہوئے خود کو اس کے دامِ فریب سے محفوظ رکھ سکتا ہے ان میں سے بطور مثال دو چند کا ذکر مندرجہ ذیل ہے:

---

[1] سورۂ حجرات، آیت ۱۲

۱۔ خدا پر ایمان اور توکل

ارشادرب العزت ہے:

﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَي الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾[۱]

"شیطان ہر گز اُن لوگوں پر غلبہ نہیں پاسکتا جو صاحبان ایمان ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں"

۲۔ اخلاص

قرآن کریم میں آیا ہے جب ابلیس نے سجدۂ آدم سے انکار کیا اور خدا سے مدتِ معلوم تک کے لئے مہلت پائی تو کہنے لگا:

﴿قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ﴾[۲]

"(ابلیس نے کہا) پروردگار جس طرح تونے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی ان بندوں کے لئے زمین میں (باطل کو) آراستہ کرکے دکھاؤں گا اور سب کو ضرور بضرور گمراہ کروں گا، ان میں سے سوائے تیرے مخلص بندوں کے"

مذکورہ آیۂ کریمہ سے واضح ہے کہ شیطان کا اختیار اللہ کے مخلص بندوں پر نہیں چل سکتا، لہٰذا مومن ارادے اور عمل کے اخلاص کے ساتھ شیطان کو اپنی راہ سے ہٹاسکتا ہے۔

ان کے علاوہ دعا، استعاذہ (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) یادِ خدا، تقوا یہ سب وہ اسباب و وسائل ہیں جن کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو شیطان کے دامِ فریب سے

۱۔ سورۂ نمل، آیت ۹۹.

۲۔ سورۂ حجر، آیت ۳۹و۴۰.

محفوظ رکھ سکتا ہے۔ آج کے دن خالق کی بارگاہ میں یہی دعا ہے خدایا ہمیں شیطان کے جال سے محفوظ فرما۔

تیسرا فقرہ: "وَاجْعَلِ الْجَنَّةَ لِی مَنْزِلاً وَمَقِيلاً"

''منزل'' عربی میں اُترنے کی جگہ اور نازل ہونے کے مقام کو کہتے ہیں اور ''مَقِیل'' اسمِ مکان ہے جس کے معنیٰ آرام اور استراحت کرنے کی جگہ کے ہیں اور اسی سے ''قَیلولہ'' ہے، دوپہر کے وقت تھوڑی دیر کے لئے آرام کرنے کو اصطلاح میں ''قَیلولہ'' کہتے ہیں، قرآن کریم میں بھی یہ کلمہ اہل بہشت کے حالات کے ذیل میں نقل ہوا ہے:

﴿أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذ خَيْرٌ مُسْتَقَرّاً وَأَحْسَنُ مَقِيلاً﴾[1]

''اہل جنت اُس دن بہترین ٹھکانے اور بہترین سکون کی جگہ میں ہوں گے''

جنت سے متعلق مختصر گفتگو گذشتہ تاریخ کی دعا کے پہلے جملہ "اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِی فِيهِ أَبْوابَ الْجِنانِ" کے ذیل میں ہو چکی ہے۔

جنت کس کے رہنے کی جگہ ہے اور کس کے استراحت و آرام کے لئے خلق کی گئی قرآن کریم کی آیات کریمہ اور احادیث معصومین علیہم السلام میں اس کا ذکر آیا ہے، ہم یہاں پر اختصار کے ساتھ اس کا ذکر کر رہے ہیں۔

---

[1] سورۂ فرقان، ۲۴.

اہلِ جنت کے صفات

۱۔ایمان

قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَعَدَ اللهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّات تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا﴾[1]

”اللہ نے مومن مرد اور مومن عورتوں سے ان باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور) یہ اُن میں ہمیشہ رہنے والے ہیں“

اس آیۂ کریمہ کے علاوہ بے شمار آیات اور ائمہ معصومین علیہم السلام سے منقول اُسی مفہوم کی حامل احادیث ہیں۔

۲۔اعمالِ صالحہ

قرآن کریم میں ارشاد ہو رہا ہے:

﴿وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّات تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ﴾[2]

”اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے وہ اُن جنّتوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ اپنے رب کی اجازت سے ہمیشہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے“

۱۔ سورۂ توبہ، ۷۲.

۲۔ سورۂ ابراہیم، آیت ۲۳.

جنت میں وہی لوگ جائیں گے جن کے پاس ایمان اور اعمالِ صالحہ کی دولت ہو گی، ایمان کا تعلق عقائد یعنی اصول دین سے ہے اور اعمالِ صالحہ کا تعلق فروعِ دین سے، ایمان کے قوی ہونے کا لازمہ، اعمالِ صالحہ کا ہونا ہے، اگر کوئی عمل کے بغیر ایمان کی مضبوطی کا دعویٰ کرے تو پھر دعویٰ بغیر دلیل ہے۔

۳۔ تقویٰ و پرہیزگاری

ارشادِ ربّ العزت ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّات وَعُيُون﴾[1]

"یقیناً اہل تقویٰ باغات اور چشموں کے درمیان ہوں گے"

۴۔ نفسانی خواہشات کی مخالفت

جو بھی ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ ساتھ نفسانی خواہشات کی مخالفت کرے گا قیامت کے دن اُس کا اجر جنت ہے، مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"لَنْ يَحُوزَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ"[2]

"فقط وہی جنت میں داخل ہو گا جس نے اپنے نفس کے ساتھ جہاد کیا ہو"

احادیث میں نفس کے ساتھ جنگ کو "جہاد اکبر" کہا گیا ہے، ایک اور مقام پر امیر بیان مولائے متقیان ارشاد فرماتے ہیں: "اَلْجَنَّةُ جَزَاءُ الْمُطِيعِ؛ جنت اطاعت گذار کی جزاو انعام ہے"[3]۔

۱۔ سورۂ حجر، آیت ۴۔

۲۔ غرر الحکم و درر الکلم، ح۱۹، ص ۵۵۳۔

۳۔ غرر الحکم و درر الکلم: ح۱۸۔

جہادِ نفس کے بھی درجات ہیں اسی درجات کے مطابق جنت میں درجات نصیب ہوں گے اس کے لئے توفیق الٰہی کا ہونا ضروری ہے، عام حالات میں اور لوگوں کے سامنے تو انسان اپنے نفس پر کنٹرول کر ہی لیتا ہے مگر خلوت اور تنہائی میں نفسانی خواہشات پر قابو پانا ضروری ہے لہٰذا ہمیشہ اپنے آپ کو خدا کے حضور ہونے کا خود کو یقین دلانا ضروری ہے، جہاں کسی کے نہ ہونے کا تصور ذہن میں آئے وہیں پر یہ یقین کرلینا چاہئے کہ خدا حاضر و ناظر ہے۔

حضرت یوسفؑ اور امام کاظم علیہ السلام کی داستان عصمت

جب زلیخا نے جناب یوسفؑ کے سامنے گھر کے تمام دروازوں کو بند کرکے اپنے آپ کو یوسف پیغمبر کے لئے پیش کیا ﴿وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ﴾ ''اس نے کہا (یوسفؑ) میرے پاس آجاؤ''۔﴿قَالَ مَعَاذَ اللهِ إِنَّهُ رَبِّي﴾[1] ''(یوسفؑ نے) کہا خدا کی پناہ وہ میرا رب ہے...''۔

یقیناً ایسے موقعہ پر حضرت یوسفؑ نے اپنے خدا کو یاد کیا اور خدا نے اپنے برہان کے ذریعہ حضرت یوسف کے دامنِ کردار کو داغِ گناہ سے محفوظ رکھا اور یوسفؑ محفوظ رہ گئے

﴿إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ﴾[2]

''کیونکہ یوسف ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے''

---

[1]۔ سورۂ یوسف، آیت ۲۳.

[2]۔ سورۂ یوسف، آیت ۲۴.

یہ تو حضرت یوسفؑ کی بات تھی مگر ہارون رشید کے قید خانے میں ایک فخر یوسف ہے جس کا نام نامی امام موسیٰ کاظمؑ ہے۔ ہارون نے امام معصومؑ کے دامنِ کردار کو داغدار کرنے کے لئے اور چار سو میں اس بات کو عام کرنے کے ناپاک مقصد سے قید کی تنہائی میں ایک حسین و جمیل کنیز کو بھیجا مگر وہ اپنے حُسنِ بدن کے جادو سے امام معصوم کو مرعوب نہ کر سکی، بلکہ امام کے حُسنِ کردار سے خود مرعوب ہو گئی، نتیجۃً خود عابدہ اور زاہدہ بن گئی، یہیں سے یوسف اور فخر یوسف کے درمیان فرق بھی واضح ہے، جب اُس کنیز سے ہارون رشید کے کارندوں نے اس کا سبب پوچھا تو وہ کہنے لگی، میں نے امام کو اپنی جانب دعوت دی مگر انہوں نے کمالِ بے اعتنائی سے فرمایا: ”مجھے تیری ضرورت نہیں“ کہہ کر مجھے اپنے اعجاز امامت سے جنت کے حَسین و جمیل مناظر کو دکھایا جہاں حوریں آپ کی انتظار میں صف بستہ کھڑی ہیں، اس منظر کو دیکھ کر میں دنیا سے بے اعتنا ہو گئی، حضرت یوسفؑ نے برہانِ رب کو دیکھ کر خود کو محفوظ کر لیا مگر فخر یوسف خود بھی محفوظ رہے اور اس کنیز کو بھی عابدہ و زاہدہ بنا کر محفوظ کر دیا جس نے برائی اور گناہ کی دعوت دی تھی۔

جنت کے حقدار وہ ہوتے ہیں جو نفسانی خواہشات کی مخالفت کرتے ہیں، البتہ یہ صفت ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ہو تو وہ جنت کے حقدار ہوتے ہیں، بسا اوقات ”مُرتاض“ ریاضتِ نفس اور نفسانی خواہشات کی مخالفت کر کے ایمان و عمل صالح کے بغیر بھی اپنے اندر ایسا ملکہ پیدا کر لیتے ہیں۔ دراصل اس نیک عمل اور خدا پسند عمل کی جزا پروردگار انھیں اسی دنیا میں عطا کر دیتا ہے اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ اس کا

مذہب و مشرب حق بجانب ہے، سطحی ذہن اور کمزور ایمان رکھنے والے لوگ اِن جیسے لوگوں کے دامِ فریب میں پھنس جاتے ہیں۔

واقعہ مشہور ہے کہ امام صادق علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شخص غیب کی باتیں بتاتا تھا اور لوگ اُس سے متأثر ہورہے تھے، امام نے اُس سے سوال کیا تونے یہ عمل کیسے سیکھا تو اس نے کہا اے فرزند رسول میں نے یہ عمل ریاضتِ نفس اور نفسانی خواہشات کی مخالفت سے حاصل کیا، اس کے بعد امامؑ نے اپنی بند مٹھّی کی طرف اشارہ کرکے سوال کیا، کیا تو بتاسکتا ہے کہ اس میں کیا ہے؟ تو اس نے حیرت سے کہا آقا بتا تو سکتا ہوں مگر مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ یہ چیز آپ کے پاس آئی کیسے؟ امامؑ نے فرمایا: تجھے اس سے کیا سروکار تو اتنا بتادے کہ اس میں کیا ہے؟ اس نے کہا: آقا آپ کے ہاتھ میں خاکِ جنت ہے۔ امامؑ نے فرمایا: تونے سچ کہا یقیناً یہ خاکِ جنت ہے؛ کیونکہ یہ خاکِ کربلا ہے۔

معصومینؑ کی احادیث میں بھی کربلا کے لئے منقول ہے: ''رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّة؛ کربلا جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے''۔ الغرض جب امامؑ نے اس کو دعوتِ اسلام دی اور وہ مشرف بہ اسلام ہوگیا تب دیکھا کہ جو ہنر اس کے پاس موجود تھا وہ ختم ہوگیا، وہ پریشان ہوکر امام کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: میں کفر کے زمانے میں اچھا تھا مگر اسلام لانے کے بعد مجھے کیا ہوگیا اب میں اپنے فن سے محروم ہوگیا ہوں، امامؑ نے مسکرا کر فرمایا: اب تیرا، اجر آخرت کے لے محفوظ ہوگیا جب تک تو کافر تھا تیرے نیک عمل کی جزا خدا تجھے اسی دنیا میں عطا کررہا تھا مگر تیری آخرت برباد تھی مگراب تیری جزا آخرت کے لئے محفوظ ہے۔

بہر حال نفسانی خواہشات کی مخالفت اہل جنت کی صفت ہے مگر یہ صفت ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ لائق تحسین اور قابل قدر ہے۔آیات و روایات میں ان کے علاوہ اور بھی صفات کا ذکر ہوا ہے جیسے ماں باپ کی اطاعت، معرفت کے ساتھ ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے قبور کی زیارت یہ وہ اسباب ہیں جن کے ذریعے مومن انسان جنت و کوثر کا حقدار ہو سکتا ہے۔

خالق کائنات اور قاضی الحاجات کی بارگاہ میں کہ آج کے دن یہی دعا ہے کہ پروردگارا ہمیں اُن نیک اعمال کے کرنے کی توفیق عطا فرما جن کے ذریعہ سے ہمیں جنت نصیب ہو۔

بائیسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِی فِیهِ أَبْوابَ فَضْلِكَ، وَأَنْزِلْ عَلَیَّ فِیهِ بَرَكاتِكَ وَوَفِّقْنِی فِیهِ لِمُوجِباتِ مَرْضاتِكَ وَ أَسْكِنِّی فِیهِ بُحْبُوحاتِ جَنَّاتِكَ یَا مُجِیبَ دَعْوَةِ الْمُضْطَرِّینَ».

''خدایا! آج کے دن میرے لئے اپنے فضل و کرم کے دروازوں کو کھول دے اور مجھ پر آج اپنی برکتوں کو نازل فرما اور آج مجھے اپنی رضا و خوشنودی کے اسباب و ذرائع اختیار کرنے کی توفیق دے اور آج مجھے اپنے بہشتی باغوں کی مرکزی جگھوں میں سکونت عطا فرما، اے پریشان حال لوگوں کی دعائیں قبول کرنے والے''

اہم مطالب:

اس دعا میں خالق کی بارگاہ میں چار اہم مطالب کا ذکر ہوا ہے:

۱۔ اللہ کے فضل و کرم سے فیضیابی۔

۲۔ برکتوں کا نزول۔

۳۔ معبود کی رضا و خوشنودی کے حصول کی توفیق۔

۴۔ جنت میں اہم مقام پر سکونت کی دعا۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِی فِیهِ أَبْوابَ فَضْلِكَ"

راغب اصفہانی اپنی کتاب "مفردات القرآن" میں "فضل" کے معنی یوں بیان کرتے ہیں: "اَلْفَضْلُ: الزّیادة عن الاقتصار؛ فضل یعنی زیادہ اور برتری کے ہیں"۔ اور قرآن کریم میں فضل، برتری، عطیہ و رحمت کے معنی میں آیا ہے، عطیہ و رحمت جو خداوند کریم اپنے بندوں پر نازل فرماتا ہے اس پر ضروری نہیں ہے کہ وہ نازل کرے باوجود اس کے وہ از روئے لطف و کرم نازل کرتا ہے اسی لئے اللہ کا لطف و کرم دراصل فضل و زیادتی کی معنی میں ہے اور فضل، متعدد آیات کریمہ میں برتری کے معنی میں آیا ہے جیسے:

﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَي بَعْض﴾[1]

"اور بتحقیق ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت و برتری دی ہے"

آج کے دن بندہ اپنے معبود کی بارگاہ میں یوں دست بدعا ہے: خدایا! آج کے دن میرے لئے اپنے فضل و کرم کے دروازوں کو کھول دے یعنی عطیہ و بخشش کی راہوں کو وا کردے۔ اگر بندوں پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہو تو بندے آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے رہیں گے چنانچہ ارشاد رب العزت ہے:

﴿فَلَوْلاَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنتُمْ مِنْ الْخَاسِرِينَ﴾[2]

۱۔ سورۂ اسراء، آیت ۵۵.

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۶۴.

"اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت، تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو تم گھاٹے میں ہوتے"

فضل، عدالت سے بڑی چیز ہے یعنی جتنا بندہ استحقاق رکھتا ہے اس سے زیادہ اور بڑھ کر اُسے عطا کرنا فضل ہے جیسا کہ ہم دعائے قنوت میں پڑھتے ہیں:

"اِلٰهي عَامِلنَا بِفَضلِكَ وَ لَاتُعَامِلنَا بِعَدلِكَ"

"خدایا تو اپنے فضل و کرم کے ذریعہ ہمارا حساب و کتاب کرنا اپنے عدل کے ذریعہ نہ کرنا"

اگر خدا اپنے عدل کے ذریعہ ہمارا فیصلہ کرے گا تو ہم یقیناً اس لائق نہیں ہیں کہ بخشے جائیں لہٰذا ہم اس کے فضل و کرم سے امیدوار ہیں اور اس کی بارگاہ میں یہی دعا کرتے ہیں خدایا! ہمارے لئے تو اپنے فضل و کرم کے دروازوں کو کھلا رکھ۔

دوسرا فقرہ: "وَأَنْزِلْ عَلَيَّ فِيهِ بَرَكَاتِكَ"

برکت کی تعریف

ماہِ رمضان، برکتوں والا مہینہ ہے اسی لئے اس ماہ کو رمضان المبارک کہا جاتا ہے؛ کیونکہ اللہ سبحانہ نے اس ماہِ پُر برکت میں بشریت کی ہدایت کے لئے قرآنِ کریم جیسی عظیم نعمت کو نازل کیا ہے اور جس شب یہ نعمت نازل ہوئی اُس شب کو ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ﴾[1] کہہ کر شبِ بابرکت قرار دیا ہے۔

---

[1] سورۂ دخان، آیت ۳.

برکات، برکت کی جمع ہے، مادۂ "برکت" سے ہے جس کے معنیٰ نماء اور زیادتی کے ہیں۔

راغب اصفہانی نے برکت کی اس طرح تعریف کی ہے: "اَلْبَرَكَةُ: ثبوت الخير الإلهي في الشيء"[1] "خیرِ الٰہی کا کسی چیز میں ثابت اور باقی رہنا، "مبارکؑ" یا "مبارکہ" ایک ایسی چیز کو کہتے ہیں جو ظاہر میں قلیل ہو مگر اس کا اثرِ خیر، پایدار اور زیادہ ہو، شہزادی زہرا سلام اللہ علیہا کے القاب میں سے ایک لقب "مبارکہ" بھی ہے؛ کیونکہ حضرت فاطمہ زہراؑ جو بظاہر رسول کی اکلوتی بیٹی ہے مگر ان کی پاکیزہ نسل آج بھی باقی ہے، اُن کی نسل کی کثرت بتارہی ہے کہ شہزادی کی ذات بابرکت ہے، مگر یاد رہے برکت صرف اور صرف خیر ہی سے مخصوص ہے لہٰذا اگر اولادِ حضرت فاطمہؑ میں سے کوئی شر پسند اور بے عمل ہو اُسے شہزادی کی نسلِ بابرکت کا مصداق قرار نہیں دیا جائیگا۔

آج کے دن خالق کائنات کی بارگاہ میں بندۂ مومن کی یہی دعا ہے، خدایا! آج کے دن مجھ پر اپنی برکتوں کو نازل فرما، وہ شخص بدنصیب ہے جو اس ماہِ پُر برکت و خیر میں برکتوں سے محروم رہ گیا۔

اس ماہ کی آمد سے پہلے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے استقبال میں فرماتے ہیں:

---

[1] مفردات القرآن، مادۂ برک.

"أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّهُ قَدْ أَقْبَلَ إِلَيْكُمْ شَهْرُ اللَّهِ بِالْبَرَكَةِ وَ الرَّحْمَةِ وَ الْمَغْفِرَةِ شَهْرٌ هُوَ عِنْدَ اللَّهِ أَفْضَلُ الشُّهُورِ وَ أَيَّامُهُ أَفْضَلُ الْأَيَّامِ وَ لَيَالِيهِ أَفْضَلُ اللَّيَالِي وَ سَاعَاتُهُ أَفْضَلُ السَّاعَات"[1]

''اے لوگو! برکت، رحمت اور مغفرت کے ہمراہ اللہ کا مہینہ تمہاری جانب آرہاہے، یہ وہ مہینہ ہے جو اللہ کے نزدیک تمام مہینوں سے افضل و برتر ہے، جس کے دن تمام دنوں سے افضل اور جس کی راتیں تمام راتوں سے افضل اور جس کی گھڑیاں تمام گھڑیوں اور ساعتوں سے افضل و برتر ہیں''

خالق سے یہی دعا ہے خدایا ہمیں اس ماہ کی برکتوں سے محروم نہ فرما۔

تیسرا فقرہ: "وَوَفِّقْنِى فِيهِ لِمُوجِباتِ مَرْضاتِكَ"

بندہ اپنے خالق کی بارگاہ میں دست بدُعا ہے: خدایا! آج مجھے اپنی رضا اور خوشنودی کے اسباب و ذرائع کے حاصل کرنے کی توفیق عطا کر اور اس ذیل میں رضا و خوشنودی الٰہی سے متعلق تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے لہٰذا آج کی دعا کے ذیل میں گفتگو صرف توفیق سے متعلق کی جائے گی۔

---

[1] بحار الانوار، ج۹۶، ص۳۵۶۔

توفیق کیا ہے؟

توفیق، مادۂ "وفق" سے مصدر باب تفعیل ہے جس کے معنی موافقت کے ہیں۔ اصطلاح میں توفیق یعنی خارج میں تمام ظاہری و معنوی اسباب و وسائل کا فراہم ہونا اور باہم موافق ہونا اور اس کا خدا ہی کے دستِ قدرت میں ہونا ہے۔[1]

اگر انسان کسی نیک کام کو انجام دیتا ہے تو اس نیک کام کو انجام دینے کے لئے جو مقدمات فراہم ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے انسان اس نیک کام کو کر گزرتا ہے وہ سب اللہ ہی کے ید اختیار میں ہے، اِن مقدمات کا فراہم ہونا توفیق الٰہی کہلاتا ہے۔

توفیق الٰہی امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث مبارک کی روشنی میں

راوی نے امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا: اے فرزند رسول! خالق کائنات نے قرآن مجید میں (جناب شعیب کی حکایت کو اُن کی زبانی نقل کرتے ہوئے) فرمایا: ﴿وَمَا تَوْفِيقِي إِلاَّ بِاللهِ﴾[2] "مجھے صرف اللہ ہی سے توفیق ملتی ہے"۔ اور ایک جگہ خود خداوند کریم فرماتا ہے: ﴿إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللهُ فَلاَ غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ﴾[3] "(مسلمانو!) اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو پھر کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر اللہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو تمہاری مدد کو پہنچے"۔ اس سے کیا مراد ہے؟

---

[1] تفسیر روشن، مطفوی، ج۱۱، ص۲۸۵.

[2] سورۂ ہود، آیت ۸۸.

[3] سورۂ آل عمران، آیت ۱۶۰.

امام علیہ السلام نے فرمایا: اگر کوئی بندہ دستورِ الٰہی کے مطابق اطاعت و عبادت الٰہی انجام دے تو وہ بندہ موفق یعنی صاحب توفیق کہلائے گا؛ کیونکہ وہ دستورِ الٰہی کے مطابق اپنے عمل کو انجام دیا ہے، اگر بندہ، اللہ کی نافرمانی اور معصیت انجام دینے کا ارادہ کرے مگر خدا اس کی راہ میں حائل ہو جائے اور وہ اس کو انجام دینے سے رُک جائے تو یہ ترکِ گناہ بھی توفیق خدا ہی ہے۔ ہاں اگر خدا اس کے اور معصیت کے درمیان حائل نہ ہو کر بندہ کو خود اس کے حال پر چھوڑ دے اور ایسی صورت میں وہ بندہ گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے تو یہ توفیقِ الٰہی سے محروم رہنے کی بنا پر ہے۔[۱]

اگر خداوند کریم اپنے بندہ کو ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے حال پر چھوڑ دے تو پھر وہ بندہ گمراہی کا شکار ہو جائے گا لہٰذا ائمہ معصومین علیہم السلام سے منقول بہت سی دعاؤں میں یہ فقرہ موجود ہے: ”خدایا! مجھے میرے حال پر نہ چھوڑنا“ لہٰذا خدا سے ہمیشہ توفیق کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔

مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"التَّوْفِيقُ عِنَايَةٌ؛ توفیق ایک عنایت ہے“[۲]

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"التَّوْفِيقُ أَوَّلُ النِّعْمَة؛ توفیق اول نعمت ہے“[۳]

۱۔ توحید، شیخ صدوق، باب ۳۵، ص ۲۴۲.

۲۔ غرر الحکم، ص ۲۰۳.

۳۔ بحار الانوار، ج ۱، ص ۹۴.

"التَّوْفِيقُ رَحْمَة ؛توفیق رحمت ہے" [۱]

لہذا خالق کی بارگاہ میں ہمیشہ حصولِ توفیق کی دعا کرتے رہنا۔

چوتھا فقرہ: "وَ أَسْكِنِّی فِيهِ بُحْبُوحاتِ جَنَّاتِكَ"

"خدایا! جنت کے باغوں کے مرکزی مقام پر میرا مسکن قرار دے"

"بُحبُح" کے معنی درمیانی کے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے ہر جگہ کا مرکزی مقام ایک خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اہم دفاتر اور اہم شخصیتوں کی رہائش گاہیں شہر کے مرکزی علاقہ ہی میں پائے جاتے ہیں شاید اُسی طرح جنت کے درمیانی اور مرکزی مقام پر انبیاء اور اولیائے الٰہی کے رہائشگاہیں ہوں، اسی لئے بندہ اپنے مالک سے دست بدعا ہے خدایا! مجھے جنت کے مرکزی مقام پر رہائش عطا فرما تاکہ انبیاء و صالحین کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہوسکے۔

گذشتہ دعاؤں کی شرح کے ذیل میں جنت میں جانے کے اسباب و وسائل سے متعلق گفتگو ہو چکی ہے۔

بس یہاں پر رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث پر اپنی بات کو تمام کرتا ہوں۔

جنتی ہونے کے شرائط

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: اگر تم لوگ چھ چیزوں کو مجھ سے لے کر اس پر عمل کروگے تو میں قیامت کے دن تمہارے لئے جنت کی ضمانت لوں گا:

۱۔ غرر الحکم، ص ۲۰۳.

۱۔ کبھی بھی جھوٹ سے کام نہ لو

۲۔ امانت میں خیانت نہ کرو

۳۔ وعدہ خلافی نہ کرو

۴۔ شہوانی خواہشات کی بے جا پیروی مت کرو

۵۔ اپنی آنکھوں کو کنٹرول میں رکھو یعنی جن چیزوں کو دیکھنے سے روکا گیا ہے، انھیں نہ دیکھو۔

۶۔ اپنے ہاتھ اور زبان کی حفاظت کرو کہیں ان سے ظلم سرزد ہو جائے۔[۱]

---

[۱] خصال، شیخ صدوق، ج۱، ص ۲۵۳.

تیئسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰھُمَّ اغْسِلْنی فِیهِ مِنَ الذُّنُوبِ وَطَهِّرْنی فِیهِ مِنَ الْعُیُوبِ وَامْتَحِنْ قَلْبی فِیهِ بِتَقْوَی الْقُلُوبِ، یَا مُقِیلَ عَثَراتِ الْمُذْنِبینَ».

''خدایا! آج کے دن میرے گناہوں کو دھوئے اور مجھ کو عیوب اور نقائص سے پاک کردے اور دل کو تقوا کے ذریعہ آزما کر اہل تقویٰ کا درجہ عطا فرما، اے گناہگاروں کی لغزشیں معاف کرنے والے''

اہم مطالب:

آج کے دن کی دعا میں بندہ بارگاہِ رب العزت میں تین چیزوں کی درخواست کرتا ہے:

۱۔ گناہوں سے دوری کی۔

۲۔ عیوب سے پاک ہونے کی۔

۳۔ تقوائے قلبی کی ذریعہ آزمائش اور کامیابی کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ اغْسِلْنی فِیهِ مِنَ الذُّنُوبِ"

"غَسل" عربی میں دُھونے کو کہتے ہیں، دعاکے اس فقرہ میں دھونے سے مراد دامنِ کردار کوگناہوں کے داغ سے پاک وصاف کرنے کے ہیں۔ "ذُنوب" "ذنب" کی جمع ہے، "ذنب" سے مراد گناہ ہے اور گناہ ہر اس عمل کو کہتے ہیں جس میں خدا کی نافرمانی اور غضب ہو۔ مجموعی طور پر گناہ دو چیزوں میں ہے ایک ترکِ واجبات اور دوسرے انجامِ محرمات میں؛ کیونکہ واجبات کا ترک کرنا خدا کی نافرمانی ہے اور اسی طرح عملِ حرام انجام دینا بھی اللہ کی نافرمانی ہے، لہٰذا گناہ سے محفوظ رہنا ہے تو ضروری ہے کہ واجبات پر عمل پیرا ہو اور محرمات سے پرہیز کرتا رہے۔

گناہ سے پاک ہونے کی راہیں

قرآن کریم اور احادیث معصومین علیہم السلام میں مومن کے گناہوں سے پاک ہونے کی مختلف راہیں بتائی گئی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ گناہ کا اقرار

بارگاہ الٰہی میں سب سے پہلے انسان اپنے کئے ہوئے گناہ کا اقرار کرکے اظہار ندامت کرے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"مَا خَرَجَ عَبْدٌ مِنْ ذَنْبٍ بِإِصْرَارٍ وَ مَا خَرَجَ عَبْدٌ مِنْ ذَنْبٍ إِلَّا بِإِقْرَارٍ"[1]

---

[1] ۔کافی، ج۲، ص۴۲۶۔

”بندہ اس وقت تک گناہ سے خارج نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس کا اقرار نہ کرے“

یاد رہے انسان صرف اور صرف خداوند کریم کی بارگاہ میں اقرارِ گناہ کرے، خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے اپنے گناہ کو بیان نہ کرے۔

۲۔ توبہ و استغفار

خدا کی بارگاہ میں اقرار گناہ کے بعد توبہ و استغفار کی منزل ہے البتہ توبہ اور استغفار صرف زبانی نہ ہو، بلکہ حقیقی ہو۔ حقیقی استغفار کے معنیٰ اور اس کے شرائط کو پانچویں تاریخ کی دعا کے ذیل میں مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کے نورانی کلام کے ذریعہ ذکر کیا گیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ"[1]

”گناہ سے (حقیقی) توبہ کرنے والا گناہ نہ کرنے والے کی طرح ہے“

۳۔ واجب نمازوں کا قائم کرنا

گناہوں کے بخشوانے کی راہوں میں سے ایک اہم راہ، نماز کو قائم کرنا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

﴿وَأَقِمْ الصَّلاَةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَزُلَفاً مِنْ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾[1]

---

[1]۔ ارشاد القلوب الی الصواب، ج۱، ص۱۸۰.

”اور پیغمبر آپ دن کے دونوں حصّوں میں اور رات گئے نماز قائم کریں کہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں“[1]

۴۔ نماز شب

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"صَلَاۃُ الْمُؤْمِنِ بِاللَّیْلِ تَذْھَبُ بِمَا عَمِلَ مِنْ ذَنْبٍ بِالنَّھَارِ".[2]

”مومن کی نمازِ شب، دن میں انجام دیئے گئے گناہوں کو پاک کر دیتی ہے“

۵۔ حج وعمرہ

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"الْحَجَّۃُ ثَوَابُھَا الْجَنَّۃُ وَ الْعُمْرَۃُ کَفَّارَۃُ کُلِّ ذَنْبٍ"[3]

”حجِ واجب کا ثواب جنت ہے اور عمرہ ہر گناہ کے لئے کفارہ ہے“

۶۔ زیارت امام حسین علیہ السلام

امام رضا علیہ السلام اپنے صحابی ابنِ شبیب سے فرماتے ہیں:

"یَا ابْنَ شَبِیبٍ إِنْ سَرَّکَ أَنْ تَلْقَی اللّٰہَ عَزَّ وَ جَلَّ وَ لَا ذَنْبَ عَلَیْكَ فَزُرِ الْحُسَیْنَ(ع)"[4]

---

[1]۔ سورۂ ہود، آیت ۱۱۴۔

[2]۔ کافی، ج۳، ص۲۶۶۔

[3]۔ کافی، ج۴، ص۲۵۳۔

[4]۔ وسائل الشیعہ، ج۱۴، ص۴۱۷۔

"اے فرزند شبیب! اگر تو چاہتا ہے کہ خدا سے اس حال میں ملاقات کرے کہ تیرے گردن پر کوئی گناہ نہ ہو تو امام حسین (علیہ السلام) کی زیارت کر"

مذکورہ چند موارد کے علاوہ اور بھی راہیں ہیں جن کا ذکر احادیث معصومین علیہم السلام میں ہوا ہے جیسے کثرت سے صلوات پڑھنا، دعا کرنا، دو مومن کا آپس میں مصافحہ کرنا، شہادت، روزہ، تشییعِ جنازہ میں شرکت، احکامِ دین کی تعلیم، حُسنِ خلق، کثرتِ سجدہ، انفاق و......۔

یہ وہ موارد ہیں جن کے ذریعہ انسان گناہوں سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔

دوسرا فقرہ: "وَطَهِّرْنِی فِیهِ مِنَ الْعُیُوبِ"

"عُیوب" عیب کی جمع ہے اور انسان میں عیوب دو طرح کے ہوتے ہیں: ا۔ظاہری ۲۔ باطنی، مگر مذکورہ عیوب سے مراد باطنی عیوب ہیں؛ کیونکہ ظاہری عیب دراصل جسمانی نقص ہے یعنی انسان کے اعضاء وجوارح میں سے کسی عضو کا ناقص ہونا ہے اور یہ ظاہری عیب کوئی گندگی و پلیدگی نہیں ہے جس سے پاکی کی دعا مانگی جائے، بلکہ باطنی عیوب جیسے، حسد، کینہ، تکبر، عُجب وغیرہ.... یہ سب دراصل باطنی خباثتیں اور برائیاں ہیں جن کی وجہ سے انسان کا نفس اور اس کا عمل معیوب ہو جاتا ہے اور معیوب عمل بارگاہِ رب العزت میں قابل نہیں قبول ہے لہٰذا ماہِ مبارک رمضان میں بارگاہ ربّ العزت میں بندہ کی دعا ہے خدایا! آج مجھے ان نفسانی برائیوں اور خباثتوں سے پاک فرما، کیونکہ یہ باطنی عیوب اور خباثتیں انسان کو منزلِ کُفر تک لے جاتی ہے خواہ کفر اعتقادی ہو یا عملی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"أُصُولُ الْكُفْرِ ثَلَاثَةٌ: الْحِرْصُ وَ الِاسْتِكْبَارُ وَ الْحَسَدُ فَأَمَّا الْحِرْصُ فَإِنَّ آدَمَ ع حِينَ نُهِيَ عَنِ الشَّجَرَةِ حَمَلَهُ الْحِرْصُ عَلَى أَنْ أَكَلَ مِنْهَا وَ أَمَّا الِاسْتِكْبَارُ فَإِبْلِيسُ حَيْثُ أُمِرَ بِالسُّجُودِ لِآدَمَ فَأَبَى وَ أَمَّا الْحَسَدُ فَابْنَا آدَمَ حَيْثُ قَتَلَ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ"[1]

"کفر کی جڑیں تین ہیں: حرص، تکبر اور حسد، جب آدم کو جنت کے درخت سے منع کیا گیا تو حرص نے ہی انہیں کھانے پر اکسایا اور جب ابلیس کو آدم کا سجدہ کرنے کا حکم دیا تو تکبر نے ہی ابلیس کو سجدہ کرنے سے روکا اور حسد نے آدم کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) میں سے ایک کو دوسرے کے قتل پر مجبور کیا"۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک اور روایت ہے:

"إِنَ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْإِيمَانَ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ"[2]

"یقیناً حسد ایمان کو اسی طرح کھاجاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھاجاتی ہے"

یہ تمام باطنی عیوب ہیں جن کے ہوتے ہوئے ایمان کا صحیح وسالم رہنا ناممکن ہے لہٰذا پروردگارِ عالم سے دعا ہے کہ خدایا آج ان عیوب سے ہمیں پاک و پاکیزہ فرما۔

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۳۹۶.

۲۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۴۱۶.

تیسرا فقرہ: "وَامْتَحِنْ قَلْبِی فِیهِ بِتَقْوَی الْقُلُوبِ"

"اِمتحن "فعل طلب ہے، مادۂ"محن "سے بابِ افتعال ہے جس کے معنیٰ آزمائش کرنے کے ہیں، خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

﴿أُوْلَئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَي﴾[۱]

"یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے تقویٰ سے آزمایا ہے"

قلبی تقویٰ اور امتحانِ قلب کے معنیٰ یہ ہے کہ خداوند کریم ہمارے دلوں کو تقویٰ و پرہیزگاری کے ذریعہ آزمائے اور اُس آزمائش کے نتیجہ میں ہمیں اہلِ تقویٰ میں سے قرار دے۔

مفہومِ تقویٰ

تقویٰ اسم ہے "اتقا" سے جس کے لغوی معنیٰ بچنے اور محفوظ رکھنے کے ہیں۔ راغب اصفہانی نے اپنی کتاب "مفردات القرآن" میں تقویٰ کے اس طرح معنیٰ بیان کئے ہیں: "حفظ النّفس عمّا یؤثم؛ اُن چیزوں سے اپنے نفس کی حفاظت کرنا جو گناہ ہیں"۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے۔

گناہ دو چیزوں میں مضمر اور پوشیدہ ہے: ۱۔ ترکِ واجبات ۲۔ انجامِ محرمات۔ تقویٰ کا کمترین درجہ انجامِ واجبات اور ترکِ محرمات ہے۔

۱۔ سورۂ حجرات، آیت ۳.

قلب کا تقویٰ کیا ہے؟

انسان کے ہر عضو کے لئے ایک تقویٰ ہے یعنی انسان اپنے ہر عضو کو گناہ سے محفوظ رکھے، آنکھ، کان، زبان... اِن تمام اعضاء کے لئے تقویٰ ہے مگر اِن ظاہری اور باطنی قوتوں کے لئے سر چشمہ، قلب اور دل ہے اور یہاں قلب سے مراد پہلو میں دھڑکنے والا گوشت کا لوتھڑا نہیں، بلکہ قرآن کریم میں کہیں قلب سے مراد عقل وادراک ہے ﴿إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرَي لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَي السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾[۱] یا قلب سے مراد روح و جان ہے: ﴿وَإِذْ زَاغَتْ الأَبْصَارُ وَبَلَغَتْ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ﴾[۲] یا قلب سے مراد مرکز عواطف واحساسات ہے ﴿فَبِمَا رَحْمَة مِنْ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظّاً غَلِيظَ الْقَلْبِ لاَنْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾[۳]

البتہ طبیبوں کے بقول عواطف و احساسات کا مرکز یہی قلب ہے جو انسان کے سینے میں دھڑکتا رہتا ہے اسی لئے کسی اچھی یا بُری خبر کا اس پر اثر دکھائی دیتا ہے۔

اور مذکورہ دعا میں قلب سے مراد، روح، جان، نفس اور عقل مراد ہے اور نفس وروح تمام اعضاء کے لئے خیر وشر کا سر چشمہ ہے، لہٰذا قلب کا تقویٰ سب سے اہم ہے اگر ہم با تقویٰ زندگی بسر کرنا چاہیں تو سب سے پہلے اپنے قلب و دل کو اہل تقویٰ بنائیں تاکہ پورا جسم اس کا اتباع کرے اور جسم کا ہر عضو اثرِ تقویٰ کو قبول کرسکے۔

۱۔ سورۂ ق، آیت ۳۷۔ "اس واقعہ میں نصیحت کا سامان موجود ہے اس انسان کے لئے جس کے پاس دل ہو"

۲۔ سورۂ احزاب، آیت ۱۰۔ "اور دہشت سے نگاہیں خیرہ کرنے لگیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے"

۳۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹۔ "پیغمبر یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے لہٰذا اب انہیں معاف کردو"

تقوائے قلب یعنی دل کو شیطانی وسوسوں، ریا، عُجب، تکبر، شہرت طلبی، فکرِ گناہ وغیرہ اِن تمام سے محفوظ رکھے اور قلب کو خدا کے لئے خاضع و خاشع قرار دے تاکہ دل اللہ کی ہر نشانی کے سامنے سرِ تعظیم خم کر سکے چنانچہ قرآن مجید میں خداوند کریم کا اعلان ہے:

﴿ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾[1]

"یہ ہمارا فیصلہ ہے اور جو بھی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے گا یہ تعظیم اس کے دل کے تقویٰ کا نتیجہ ہوگی"

شعائرِ الٰہی کی تعظیم اور تقوائے قلب کے درمیان ربط، روزِ روشن کی طرح واضح ہے، کیونکہ ایک ریاکار انسان، ممکن ہے دوسروں کو دکھانے کے لئے اللہ کی خاص نشانیوں کا ظاہری احترام اور تعظیم کرے مگر اس کا دل خاضع و خاشع نہ ہو، الٰہی نشانیوں کے آگے حقیقی تعظیم و تکریم وہی ہے جہاں سروں کے ساتھ ساتھ دل بھی جھک جائے۔

خداوند کریم کی بارگاہ میں دعا ہے کہ خدایا! ہمیں حقیقی تقوائے قلب عطا فرما تاکہ ہم تیری وحدانیت کے جلوؤں کو دل کی آنکھوں سے دیکھ کر اُن جلووں کے سامنے حقیقی طور پر تعظیم و تکریم بجالا سکیں۔

۱۔ سورۂ حج، آیت ۳۲.

چوبیسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ إِنِّى أَسْأَلُكَ فِيهِ مَا يُرْضِيكَ وَأَعُوذُ بِكَ مِمَّا يُؤْذِيكَ وَأَسْأَلُكَ التَّوْفِيقَ فِيهِ لِأَنْ أُطِيعُكَ وَلاَ أَعْصِيكَ، يَا جَوادَ السَّائِلِينَ».

''خدایا! میں تجھ سے اس ماہ میں اُس چیز کا سوال کرتا ہوں جو تجھ کو پسند ہو اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں اُس سے جو تجھ کو اذیت دے اور میں تجھ سے سوال کرتا ہوں توفیق کا تاکہ میں تیری اطاعت کروں اور تیری معصیت نہ کروں اے سوال کرنے والوں کو عطا کرنے والے''۔

اہم مطالب:

خالقِ کون ومکاں کی بارگاہ میں بندہ تین چیزوں کی درخواست کرتا ہے:

۱۔ خوشنودی پروردگار کے اسباب کی۔

۲۔ خدا کو ناراض کرنے والی چیزوں سے پناہ کی۔

۳۔ اطاعت وفرمانبرداری کی توفیق کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ إِنِّى أَسْأَلُكَ فِيهِ مَا يُرْضِيكَ"

رضائے الٰہی سے متعلق گذشتہ تاریخوں کی دعاؤں کی شرح میں بہت کچھ عرض کیا جاچکا ہے، حق سبحانہ سے رضایت یعنی بندۂ مومن کا ہر حال میں اللہ سے راضی رہنا ہے چاہے حالات خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار۔

رضائے الٰہی امام محمد باقر علیہ السلام کی نظر میں

حضرت جابر بن عبد للہ انصاری جو رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ پانچ اماموں کے بھی صحابی تھے، آخری عمر میں نابینا ہوچکے تھے اور بسترِ علالت پر تھے کہ ایک دن امام محمد باقر علیہ السلام ان کی عیادت کو تشریف لے گئے اور باتوں باتوں میں امامؑ نے جابر سے سوال کیا: اے جابر یہ بتاؤ آپ کس چیز کو کس چیز سے بہتر سمجھتے ہیں تو جابر نے کہا: اے فرزند رسول! میں بیماری کو صحتیابی سے، فقیری کو تونگری سے، ضعیفی کو جوانی سے بہتر سمجھتا ہوں۔

گویا حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری نے یہ سمجھا کہ مصائب و آلام پر صبر کرتے ہوئے زندگی گزار دینا اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے لہٰذا آپ نے فقر، بیماری اور ضعیفی کو تونگری، صحت اور جوانی سے بہتر سمجھا، مگر امامؑ نے جابر سے فرمایا: اے جابر آپ کو یہ حق کس نے دیا کہ آپ کسی بھی چیز کو کسی چیز سے بہتر سمجھے؟

جابر نے کہا: آپ ہی بتادیجئے حق کیا ہے؟ اس پر امامؑ نے فرمایا: اے جابر خدا جس حال میں رکھے اُسی حال میں خوش رہنا چاہئے وہ اچھی حالت ہو یا بُری۔

صفتِ رضا دراصل بندۂ مومن کا فعلِ پروردگار سے راضی وخوشنود رہنا ہے چاہے وہ خدا کا امر بندہ کے لئے پسندیدہ ہو یا ناپسند

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"صِفَةُ الرِّضَا أَنْ يُرْضَى الْمَحْبُوبَ وَ الْمَكْرُوهَ وَ الرِّضَا شُعَاعُ نُورِ الْمَعْرِفَةِ"[۱]

”رضا کی صفت یہ ہے کہ بندہ پسندیدہ اور ناگوار دونوں عمل سے راضی رہے اور رضا دراصل نورِ معرفت کی ایک شعاع ہے“

رضائے الٰہی کا ادراک

ہم کو اس بات کا کیسے اندازہ ہو کہ خدا ہم سے راضی ہے یا نہیں؟ اس مقام پر عرفاء کہتے ہیں اس سوال کے جواب کے لئے بندہ خود اپنے دل کی جانب رجوع کرے اور غور کرے کہ ہمارا دل اللہ کے ہر فیصلہ سے راضی ہے کہ نہیں؟ اگر ہم اللہ کے ہر فیصلہ سے راضی ہے اور ہمارا وجود "رِضًا بِقَضَائِهِ وَ تَسْلِيماً لِأَمْرِهِ" کا مصداق ہے تو سمجھو اللہ بھی ہم سے راضی ہے۔ اگر ہم نے دیکھا کہ ہمارے دل امرِ الٰہی سے راضی نہیں ہیں، بلکہ ہم یہ سوچتے ہیں اللہ نے فلاں کو مالدار کیوں کر دیا جبکہ وہ بندہ گنہگار ہے اور مجھے تنگدست کیوں رکھا جب کہ میں اطاعت گذار ہوں۔ یا فلاں کو یہ منصب کیوں دیا مجھے کیوں نہیں دیا؟ یہ سوالات اور یہ ”کیوں“ الٰہی مقدرات اور الٰہی فیصلوں کے مقابل نہ ہو خدانخواستہ اگر ایسا ہے تو پھر سمجھو خدا بھی ہم سے راضی نہیں ہے۔

۱۔ مصباح الشریعۃ و مفتاح الحقیقۃ، ص ۴۸۳.

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"يَا عِبَادَ اللَّهِ أَنْتُمْ كَالْمَرْضَى وَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ كَالطَّبِيبِ"[1]

"اے اللہ کے بندوں تم مریضوں کی طرح ہو اور اللہ رب العالمین طبیب کی طرح ہے"

جس طرح مریض کو کس چیز کی ضرورت ہے، طبیب جانتا ہے، بالکل اُسی طرح خدا بھی اپنے بندوں کی ضرورتوں سے آگاہ ہے لہٰذا پروردگار عالم بندہ کے صلاح و خیر کے مطابق اُسے عطا کرتا ہے اور بندہ کی ذمہ داری ہے کہ خدا جس حالت میں اُسے خوش رکھے وہ خوش رہے۔

محبت اہلبیت علیہم السلام اور رضائے الٰہی

متعدد احادیث سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ رضائے الٰہی کا معیار اور میزان اہلبیت طاہرین علیہم السلام سے محبت و مودت ہے چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میدان غدیر میں یہ اعلان کر دیا:

" اللَّهُمَّ وَالِ مَنْ وَالاهُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاهُ"

"پروردگار اُسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اس سے دشمنی کر جو علیؑ سے دشمنی کرے"

اور شہزادی حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کے بارے میں فرمایا:

"فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي فَمَنْ آذاهَا فَقَدْ آذَانِي وَ مَن اَذَانِي فَقَد اَذَي الله"

---

[1] بحار الانوار، ج ۴، ص ۱۰۶۔

"فاطمہؑ میرا پارۂ جگر ہے جس نے فاطمہؑ کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت پہنچائی گویا اُس نے خدا کو اذیت پہنچائی"

اور اسی مفہوم کے حامل رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد احادیث فریقین کے کتابوں میں موجود ہیں جیسے "جس نے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو خوش کیا گویا اس نے مجھے خوش کیا، جس نے مجھے خوش کیا اس نے خدا کو خوش کیا" اور یہ بات بھی یاد رہے، اہل بیت علیہم السلام ہم سے اُسی وقت خوش رہیں گے جب ہم ان کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہیں اور ان کے احکامات پر عمل پیرا رہیں۔ اہلبیت علیہم السلام کی رضا خدا کی رضا و خوشنودی میں پوشیدہ ہے لہٰذا خالقِ کائنات کی بارگاہ میں دعا ہے: خدایا! محمد وآل محمد علیہم السلام کو ہم سے راضی فرما۔

دوسرا فقرہ: "وَأَعُوذُ بِكَ مِمَّا يُؤْذِيكَ"

بندہ دعا کے اس جملہ میں اپنے پروردگار سے یوں درخواست گزار ہے: خدایا! مجھے اُن چیزوں سے پناہ عطا فرما یعنی اُن چیزوں سے محفوظ رکھ جن سے تجھے اذیت پہونچتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا کو اذیت پہونچانے سے مراد کیا ہے؟

خدا کو اذیت پہونچانے سے مراد کیا ہے؟

قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمْ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾[1]

---

[1] سورۂ احزاب، آیت ۵۷.

”یقیناً جو لوگ خدا اور رسول کو اذیت دیتے ہیں اُن پر دنیا و آخرت میں اللہ نے لعنت کی“

علامہ طباطبائیؒ مذکورہ آیہ کریمہ کے ذیل میں تفسیر المیزان میں لکھتے ہیں کہ اس حقیقت سے سب آگاہ ہیں کہ خدا کی ذاتِ واجب ان چیزوں سے بالاو برتر ہے کہ کوئی مخلوق اسے اذیت پہونچا سکے اور مذکورہ آیت میں اللہ نے اپنی اذیت کے ہمراہ اپنے رسول کو بھی شریک کیا ہے گویا اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ جس نے رسول کو اذیت پہنچایا اس نے خدا کو اذیت دی ہے اور ایسے شخص پر دنیا و آخرت میں اللہ کی لعنت ہے۔[1]

حضرت علی علیہ السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ میں ایک تارِ مو (بال) لئے مجھ سے فرمایا:

"يَا عَلِيُّ مَنْ آذَى شَعْرَةً مِنْكَ فَقَدْ آذَانِي وَ مَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللَّهَ وَ مَنْ آذَى اللَّهَ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ"[2]

”یا علی جس نے تمھیں بال برابر بھی اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی گویا اس نے خدا کو اذیت پہونچائی اور جس نے خدا کو اذیت دی اس پر اللہ کی لعنت ہے“

---

[1] تفسیر المیزان، ج۱۶، ص۵۰۸.
[2] تفسیر جوامع الجامع، ج۵، ص۱۰۵.

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خدا کو اذیت پہونچانے سے مراد اس طرح نہیں ہے جس طرح ایک مخلوق دوسرے مخلوق کو اذیت پہونچاتی ہے؛ کیونکہ ذاتِ پروردگار عوارض سے متاثر اور تبدیل ہونے والی نہیں ہے لہٰذا خدا کو اذیت اور تکلیف پہنچانے سے مراد اس کے محبوب بندوں کو اذیت دینا اور اس کے اوامر ونواہی سے روگردانی کرنا ہے۔

پس آج کے دن بندہ کی دعا یہی ہے خدایا ہمیں ان چیزوں سے دور اور محفوظ رکھ جن سے خدا ناراض ہوتا ہے۔

تیسرا فقرہ: "وَأَسْأَلُكَ التَّوْفِيقَ فِيهِ لاَنْ اُطِيعَكَ وَلاَ أَعْصِيكَ"

دعا کے اس فقرے میں بندہ، خدا سے توفیق کی درخواست کر رہا ہے تاکہ اللہ کی اطاعت کرے اور خود کو اُس کی معصیت سے دور رکھے۔

توفیق کیا ہے؟

اس سے پہلے بھی اس لفظ پر گفتگو ہو چکی ہے، "توفیق"، "وفق" سے ہے یعنی موافقت کے معنی میں ہے یعنی بندہ کا ارادہ بھی اللہ کے ارادۂ تشریعی کے موافق ہو جائے تو اصطلاح میں اُسے توفیق کہتے ہیں۔ عرفِ عام میں کسی بھی نیک کام کے لئے اسباب فراہم ہونے کو "توفیق" کہا جاتا ہے، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

" التَّوْفِيقُ عِنَايَةُ الرَّحْمَن "[1]

---

[1] غرر الحکم ودرر الحکم، ح ۴۹۹۴ ص ۵۳۔

”توفیق خدائے رحمٰن کی جانب سے خاص عنایت ہے“

بندہ کا اطاعتِ الٰہی کی جانب متوجہ ہونا یہ خود اپنی جگہ پر اللہ کی طرف سے ایک خاص عنایت ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ بندہ اپنی جانب سے خود کوئی کوشش نہ کرے، بلکہ خدا پر یہ کہہ کر چھوڑدے کہ اگر اللہ کی جانب سے توفیق اور خاص عنایت ہوگی تو میں ضرور اس کی اطاعت کروں گا اگر اس کی عنایت اور توفیق نہ ہوئی تو میں بھلا کیسے اس کی اطاعت و عبادت کروں گا۔

امام علی رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"مَنْ سَأَلَ اللَّهَ التَّوْفِيقَ وَ لَمْ يَجْتَهِدْ فَقَدِ اسْتَهزَأَ بِنَفْسِهِ"[۱]

”جو بھی خدا سے توفیق چاہے اور خود کوشش نہ کرے تو گویا اس نے اپنے آپ کا مذاق اڑایا ہے، لہٰذا اللہ کی بارگاہ میں اپنی کوشش کے ہمراہ اس کی اطاعت کرنے کی اور اس کی معصیت سے دوری کی توفیق کی درخواست کرے“

اس فقرے سے ملتا جلتا دعائیہ جملہ دعائے امام زمانہ (عج) میں بھی آیا ہے:

"اللَّهُمَ ارْزُقْنَا تَوْفِيقَ الطَّاعَةِ وَ بُعْدَ الْمَعْصِيَةِ"

”خدایا تو اپنی اطاعت اور اپنی معصیت و نافرمانی سے دوری کی توفیق عطا فرما“

---

[۱] بحار الانوار، ج۷۵، ص۳۵۶.

پچیسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْني فِيهِ مُحِبّاً لِاَوْلِيائِكَ وَمُعادِياً لِاَعْدائِكَ، مُسْتَنّاً بِسُنَّةِ خاتَمِ أَنْبِيائِكَ، يا عاصِمَ قُلُوبِ النَّبِيِّينَ».

"خدایا! مجھ کو اس دن اپنے دوستوں کا مُحب اور اپنے دشمنوں کا دشمن قرار دے اور اپنے آخری نبی خاتم الانبیاء کی سنّت کا پابند بنادے، اے پیغمبروں کے دلوں کی حفاظت کرنے والے"

اہم مطالب:

آج کے دن کی دعامیں بندہ اپنے رب سے تین اہم چیزوں کی درخواست کرتا ہے:

۱۔ اولیائے خدا کی دوستی کی۔

۲۔ دشمنان خدا سے دشمنی کی۔

۳۔ سنّت رسول اکرم ﷺ کی پیروی کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِی فِیهِ مُحِبّاً لِاَوْلِیائِكَ وَمُعادِیاً لِاَعْدائِكَ"

مذہبِ تشیع اور اسلامی شریعت کی بنیادیں ''تولّا'' اور ''تبریٰ'' پر استوار ہیں۔ تولّا یعنی خدا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلبیت علیہم السلام سے محبت اور ان کے چاہنے والوں سے دوستی۔ تبریٰ یعنی خدا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلبیت علیہم السلام کے دشمنوں سے دشمنی۔

اس ماہ میں خالق کائنات کی بارگاہ میں یہ دعا ہے خدایا! تو مجھے اپنے دوستوں کا مُحب اور دشمنوں کا دشمن قرار دے اور اس امر کے لئے بصیرت کی ضرورت ہے کیونکہ کبھی کبھی انسان دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست سمجھ بیٹھتا ہے لہٰذا قرآن کریم اور احادیثِ معصومین علیہم السلام اور ان کی سیرت و کردار کی روشنی میں دشمن شناسی کا ملکہ حاصل کرنا ضروری ہے۔

حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کے پاس ابلیس ایک خیر خواہ بن کے آیا تھا مگر ان تینوں نے اپنی بصیرت کی بناپر دشمن کو پہچان لیا؛ کیونکہ جو خدا، نبی خدا اور معصوم کی مخالفت کرے اور ان کو خلاف ورزی کا مشورہ دے وہ چاہے کتنے ہی مقدس لباس میں ہو چاہے وہ کتنا ہی خیر خواہ نظر آئے مگر وہ دشمن ہے لہٰذا اللہ نے ان تینوں مقدس ہستیوں کے بصیرت افروز عمل کو رُکنِ حج قرار دے کر رہتی دنیا تک یہ پیغام دے دیا کہ اگر ہماری قربت چاہتے ہو تو ہمارے دشمنوں سے اظہارِ نفرت کرو یہی تبرّا ہے۔

یہاں پر یہ بات عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں بالخصوص تبریٰ سے متعلق دراصل تولا اور تبریٰ دونوں کا تعلق روح و دل سے ہے کیونکہ یہ قلبی کیفیات ہیں

جس کا اظہار عمل سے بھی ہو اور زبان سے بھی مگر زبان سے تبرا کرتے ہوئے اس بات کا ضرور خیال رہے کہ کہیں یہ چیز کسی بڑے نقصان کا سبب نہ بنے ایسے موقعہ پر زبان سے تبرا کرنے سے اجتناب ضروری ہے اور یہی معصومین علیہم السلام کی سیرت بھی رہی ہے۔

بہر کیف تولّا اور تبریٰ دین کا اساس اور رکن ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر کے میدان میں بھی یہ کہہ کر واضح کردیا ہے کہ خدایا تو اسے دوست رکھ جو علی علیہ السلام کو دوست رکھے اور تو اُسے دشمن رکھ جو علی علیہ السلام سے دشمن کرے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک شخص سے خطاب کرکے فرمایا: اگر تو اپنے بارے میں جاننا چاہتا ہے کہ تو جنّتی ہے کہ جہنمی تو، تو اپنے دل کی طرف رجوع کر اگر تیرے دل میں اللہ کے نیک بندوں اور اہل اطاعت سے محبت ہے تو تو جنتی ہے اور اگر اہل طاعت کے علاوہ اور اہل معصیت سے بھی محبت ہے تو سمجھ لے تو جہنمی ہے۔[۱]

دوستی اور دشمنی کا معیار

لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور دشمن ہوتے ہیں، دوستی اور دشمنی کے اسباب ہر ایک کے مختلف ہوا کرتے ہیں، اگر دوستی اور دشمنی آخرت کے پیش نظر ہو تو پھر وہ خدا کے لئے ہے اسی معیار کے پیش نظر ہم مومنین کو آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنا اور دشمنوں کو دشمن رکھنا چاہیئے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے باوفا اصحاب کی یہی نشانی تھی جسے قرآن مجید نے یوں نقل کیا ہے:

---

[۱] شہر رمضان، (رہ توشہ راہیان نور) ج ۲، ص ۱۹۷.

﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾[۱]

"محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحم دل ہیں"

اہل بیت علیہم السلام اولیائے الٰہی کے واضح مصداق

ائمہ اہلبیت علیہم السلام اولیائے الٰہی کے روشن ترین مصداق ہیں، ان سے محبت، خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت اور دوستی ہے اور ان سے دشمنی، خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی ہے۔ بے شمار احادیث، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی فریقین کی کتابوں میں موجود ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اہلبیت علیہم السلام سے دوستی اور ان سے دشمنی خدا ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کے مترادف ہے، لہٰذا مومن کی لوح دل ان کی محبت و ولایت کی تحریر سے روشن رہے اس لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"عُنْوَانُ صَحِيفَةِ الْمُؤْمِنِ حُبُ عَلِيِّ بْن أَبِي طَالِبٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ"[۲]

"مومن کے صحیفۂ دل کا عنوان محبتِ علی بن ابی طالبؑ ہے"

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مولا علی علیہ السلام کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے فرمایا:

"مُحِبُّكَ مُحِبِّي وَ مُحِبِّي مُحِبُّ اللَّهِ، وَ مُبْغِضُكَ مُبْغِضِي وَ مُبْغِضِي مُبْغِضُ اللَّهِ (عَزَّ وَ جَلَّ)"[۱]

۱۔ سورۂ حج، آیت ۲۹.

۲۔ المناقب، ص۶۶، ۳۷.

''اے علی! آپ کا محب میرا محب اور میرا محب اللہ کا محب اور آپ کا دشمن میرا دشمن اور میرا دشمن اللہ کا دشمن ہے''[1]

آج کے دن کی یہی دعا ہے خدایا! ہمیں خدا، رسول ﷺ اور اہلبیت علیہم السلام کے حقیقی دوستداروں میں قرار دے۔

دوسرا فقرہ: "مُسْتَنّاً بِسُنَّةِ خاتَمِ أَنْبيائِكَ"

دعا کے اس فراز میں بندہ اپنے رب سے دعا گو ہے کہ مجھے تو اپنے حبیب، خاتم الانبیاء کی سنت کا پیرو بنادے، البتہ اس سے پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ صرف دعا کافی نہیں ہے، بلکہ انسان خود اس کے لئے مقدمات فراہم کرے پھر خداوند کریم کی جانب سے توفیق ہوتی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ سنت رسول کیا چیز ہے؟

تعریف سنت

سنت لغت میں راہ اور روش کو کہتے ہیں لیکن فقہا اور متکلمین کی اصطلاح میں سنّت، بدعت کے مقابل استعمال ہوتا ہے یعنی ہر وہ حکم جو اصولِ شریعت سے تعلق رکھتا ہے وہ سنت ہے اور بدعت ہر وہ امر جو اصول شریعت کے مخالف ہو، دوسری اصطلاح میں سنت، مستحب امر کے مترادف ہے یعنی شریعت کا وہ حکم جس پر عمل کرنا ترک کرنے سے بہتر ہے، یعنی جس کے انجام دینے میں ثواب اور ترک پر کوئی گناہ نہیں مگر اصولیین کی اصطلاح میں سنت کے معنیٰ میں اختلاف ہے؛ کیونکہ اہل

---

[1] احقاق الحق، ج۶، ص۴۰۵.

سنت کے نزدیک ہر وہ چیز جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صادر ہوئی ہو اُسے سنت کہتے ہیں چاہے وہ قول ہو یا فعل ہو یا تقریر۔ سنت کے یہ معنیٰ اہل سنت اور شیعہ کے درمیان قدرِ مشترک ہے مگر شیعوں کے نزدیک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ تمام ائمہ معصومین علیہم السلام اور حضرت زہرا سلام اللہ علیہا سے بھی صادر ہونے والے فعل، قول اور تقریر کو سنت کہلاتے ہیں اور وہ شریعت میں حجت ودلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ شیعوں کے نزدیک قرآن کریم کے بعد سنتِ معصومؑ حجت اور دلیلِ شرعی ہے یعنی چہاردہ معصومین علیہم السلام کی سنت، حجت شرعی ہے اور سنت تین امور پر مشتمل ہے، قول، فعل اور تقریر۔ معصومؑ کا قول حجت ہے مگر قول معصومؑ اصولِ حدیث کے اعتبار سے صحیح ہو یعنی جس کے تمام راوی ثقہ اور قابل اعتماد ہوں۔

اور اسی طرح فعلِ معصومؑ بھی حجت ہے یعنی معصومؑ کا عمل اس بات پر دلیل ہے کہ یقیناً وہ عمل شریعت میں جائز ہے؛ کیونکہ اگر وہ عمل حرام ہوتا تو اسے معصومؑ ہرگز انجام نہیں دیتے اور اسی طرح تقریرِ معصومؑ بھی حجت ہے، تقریرِ معصومؑ سے مراد، اگر کوئی شخص معصومؑ کے سامنے کسی کام کو انجام دے اور معصوم اس کو دیکھ کر خاموش رہیں اور اس سے اپنی رضایت کا اظہار کریں تو غیر معصوم کا وہ عمل بھی حجت شرعی ہے؛ کیونکہ معصومؑ نے اس کام پر اپنی خاموشی کے ذریعہ مہرِ رضایت ثبت فرما دیا ہے، اگر وہ کام جائز نہیں ہوتا تو یقیناً معصومؑ پر ہادیٔ برحق ہونے کے اعتبار سے اسے روکنا اور ٹوکنا واجب ہے، امامؑ کا اس کام پر نہ ٹوکنا اور منع نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کام شریعت میں جائز ہے ورنہ معصومؑ اُس شخص کو ضرور منع فرماتے۔ یہاں پر اس بات کی صراحت بے حد ضروری ہے کہ معصومؑ کی ہر خاموشی تقریر نہیں ہے،

بلکہ وہ خاموشی تقریر اور حجت شرعی کی حیثیت رکھتی ہے جس سے معصومؑ کی رضایت سمجھی جاسکتی ہے ورنہ ممکن ہے کہ معصومؑ نے اس کو اسی کام کے کرنے پر پہلے منع کردیا ہو مگر معصومؑ کے منع کرنے کے باوجود اس نے دوبارہ معصومؑ کے سامنے اُس کام کو انجام دے رہا ہو پھر معصومؑ نے اس کے تکرارِ عمل پر اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہو یا ممکن ہے کہ وقتی طور پر منع کرنا اُس شخص کے لئے مضر یا مصلحت کے خلاف ہو جیسے حالتِ تقیہ میں ہوتا ہے، بہر کیف ان تمام حالات کی چھان بین کے بعد ہی طے کیا جاسکتا ہے کہ غیر معصوم کا عمل جو معصومؑ کے زمانے میں انجام پایا گیا ہو اور معصومؑ نے اس کام کا علم ہونے کے باوجود اُس سے منع نہیں کیا ہو تو وہ تقریر، سنت کے حکم میں آتی ہے یا نہیں؟ ان باتوں کو طے کرنا مجتہدوں اور اصولیوں کی ذمہ داری ہے جس کے لئے اصولِ حدیث کے قواعد سے مکمل آگاہی ضروری ہے۔

سنتِ رسول ﷺ کیسے حجت ہے؟

قرآن کریم یقیناً سرچشمۂ احکام الٰہی ہے مگر قرآن میں تمام احکام تفصیل کے ساتھ موجود نہیں ہیں جیسے قرآن میں نماز کا حکم تو ہے مگر اس کی تفصیل موجود نہیں ہے، نماز کس طرح پڑھی جائے اور کونسی نماز کتنی رکعت پڑھی جائے گی ان چیزوں کو جاننے کے لئے سنت کی جانب رجوع کرنا پڑے گا، اسی لئے قرآن کریم نے بھی حکم دیا:

﴿وَمَا آتَاكُمْ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾[1]

---

[1] سورۂ حشر، آیت ۷.

”جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے رسول تمہیں روک دے اس سے رک جاؤ“

لہٰذا ہر مسلمان، شریعت اسلامی کے احکام کو سمجھنے کے لئے سنت رسول کا محتاج ہے۔

سنتِ معصومینؑ سنتِ رسولؐ ہے

زمانۂ رسالت مآبؐ میں رسول کی سنت حجتِ شرعی تھی لیکن اس کے بعد کے زمانے کے لئے کوئی فرد تو ہو جس کا وجود حجت اور دلیل ہو لہٰذا رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إِنّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ مَا إِنْ تَمَسَّكْتُم بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي كِتَابَ اللَّهِ وَ عِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي وَ إِنَّهُمَا لَنْ يَفْتَرِقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ".[1]

”اے لوگو! میں تمہارے درمیان دو گراں بہا چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت واہل بیتؑ اگر تم ان دونوں سے وابستہ رہوگے تو میرے بعد ہر گز گمراہ نہ ہوں گے اور بیشک یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوگے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے ملاقات کریں گے“

۱۔ ارشاد القلوب، ج۱، ص۱۳۱؛ احتجاج طبرسی، ج۲، ص۳۸۰؛ بحار الانوار، ج۲، ص۱۰۰۔

حدیث ثقلین فریقین کے درمیان متفق علیہ ہے اور اس حدیث کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی یہ واضح ہے کہ اہلبیتؑ کی سنت بھی رسولؐ کی سنت کی طرح حجت اور دلیل ہے لہٰذا جس نے اہلبیتؑ کی سنت سے روگردانی کی گویا اس نے رسولؐ کی سنت سے روگردانی کی ہے اور جس نے رسولؐ کی سنت سے روگردانی کی اس نے حکم خدا سے منہ موڑا۔

ہماری یہی دعا ہے خدایا ہمیں تادمِ زیست راہِ اہلبیت علیہم السلام پر گامزن رکھ۔

چھبیسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ سَعْیِی فِیهِ مَشْکُوراً، وَذَنْبِی فِیهِ مَغْفُوراً، وَعَمَلِی فِیهِ مَقْبُولاً، وَعَیْبِی فِیهِ مَسْتُوراً، یَا أَسْمَعَ السَّامِعِینَ».

”خدایا! آج کے دن میری کوشش کو قابلِ قبول قرار دے اور میرے گناہوں کو بخش دے اور میرے عمل کو سندِ قبولیت عطا فرما اور میرے عیب کو پوشیدہ کردے اے سب سے زیادہ سننے والے“

اہم مطالب:

آج کے دن کی دعا میں بندہ چار اہم اور بنیادی چیزوں کی خدا سے درخواست کرتا ہے:

۱۔ نیک کاموں کی زحمتوں کی جزا کی۔

۲۔ گناہوں کی مغفرت کی۔

۳۔ اعمال کی قبولیت کی۔

۴۔ عیوب کی پردہ پوشی کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ سَعْیِی فِیهِ مَشْکُوراً"

سعی و کوشش

''سعی'' کوشش و محنت کو کہتے ہیں؛ انسان اپنی کوشش کے ذریعہ کبھی مقصود تک پہونچتا اور کبھی نہیں پہونچتا ہے، دنیاوی امور میں جب تک انسان کی کوشش نتیجہ خیز نہ ہو وہ بے فائدہ ہے جیسے آپ نے سخت کوشش اور محنت کرکے کسی بھی رتبہ کا امتحان دیا مگر امتحان کے وقت حسبِ کوشش نہ لکھ سکے چاہے اس کی کوئی بھی وجہ رہی ہو ایسی صورت میں آپ کی محنت بے کار ہے، اس کے برخلاف ''قربۃً الی اللہ'' کی نیت سے صرف خدا کی خوشنودی کے لئے آپ نے کسی بھی کار خیر کے لئے کوشش و محنت کی ہو، چاہے اس کوشش کے نتیجے میں کسی بھی وجہ سے اس کارِ خیر کو انجام نہ دے پائے ایسی صورت میں آپ کی سعی اور کوشش خود ایک عمل کی صورت، اللہ کے نزدیک قابل قدر ہوگی، یہ خدائے کریم کا لطف اور اس کی عطا ہے کہ اس نے بندوں کی خالصانہ کوشش کو بھی اُجرت سے خالی نہ رکھا۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"اتَّقُوا اللَّهَ عِبَادَ اللَّهِ وَ جِدُّوا فِي الطَّلَبِ"[1]

''اے اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو اور مقصود تک پہونچنے کے لئے کوشش کرو''

[1] بحار الانوار، ج۱، ص۲۱۸.

سعی و کوشش قرآن کریم کی نگاہ میں

قرآن کریم میں ارشاد ربّ العزت ہو رہا ہے:

﴿وأَنْ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلاَّ مَا سَعَي، وأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَي﴾[1]

"اور انسان کے لئے اتنا ہی ہے جتنی اُس نے کوشش کی ہے اور عنقریب اس کی کوشش نظر آئے گی"

" لِلْإِنسَانِ" میں لام، ملکیت کے لئے ہے جس طرح انسان کے اعضاء انسان کی ملکیت ہیں اُسی طرح حاصلِ کوشش، صاحبِ کوشش کی ملکیت ہے یعنی انسان کے اعمال، اس کی ملکیت ہیں لہٰذا انسان کے اعمال مرنے کے بعد بھی اُس کے ہمراہ نظر آئیں گے چاہے وہ اعمال نیک ہوں یا بد، دوسری آیت میں "سعی" سے مراد کوشش کا نتیجہ ہے یعنی وہ اعمال جو کوشش سے حاصل ہوئے ہیں وہ قیامت کے دن نظر آئیں گے، سورۂ زلزلہ میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿يَوْمَئِذ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتاً لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ، فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّة خَيْراً يَرَه، وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّة شَرّاً يَرَه﴾[2]

"اُس دن (قیامت) لوگ گروہ در گروہ قبروں سے نکلیں گے تاکہ اپنے اعمال کو دیکھ سکیں پھر جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اسے دیکھے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر برائی کی ہے وہ اسے دیکھے گا"

---

[1] سورۂ نجم، آیت ۳۹ و ۴۰.

[2] سورۂ زلزلہ، آیت ۶ الی ۸.

شکر کا مفہوم یہ ہے کہ جب کبھی کوئی چیز یعنی نیکی کسی تک پہونچے تو اُس نیکی کرنے والے سے قدر دانی کا اظہار کرنا ہے۔

اقسام شکر

شکر کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ کبھی ایک انسان دوسرے انسان کا شکرادا کرتا ہے حدیث میں وارد ہے:

"مَنْ لَمْ يَشْكُرِ الْمُنْعِمَ مِنَ الْمَخْلُوقِينَ لَمْ يَشْكُرِ اللَّهَ عَزَّ وَ جَلّ"[1]

''جس نے مخلوق میں سے نعمت دینے والے کا شکریہ ادا نہیں کیا گویا اس نے خدا کا شکرادا نہیں کیا ہے''

۲۔ کبھی خود خداوند کریم اپنے نیک بندوں کا ان کے نیک اعمال بجالانے پر اُن کا شکریہ ادا کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

﴿إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُوراً﴾[2]

''یہ سب تمہاری جزا ہے اور تمہاری سعی قابل قدر ہے''

یہ آیہ کریمہ اہلبیت علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے بلکہ یہ پورا سورہ، سورۂ دہر (انسان) اہلبیت علیہم السلام ہی سے متعلق ہے اس کی کُتبِ تفاسیر میں تفصیل موجود ہے۔

۳۔ کبھی بندہ اپنے معبود کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

---

[1]۔ عیون اخبار الرضا، ج۲، ص ۲۴.

[2]۔ سورۂ دہر، آیہ ۲۲.

یہاں ہماری گفتگو دوسری قسم سے ہے جہاں خدا بندوں کے نیک اعمال کی بناپر قدردانی کرتا ہے۔ شکر کی تیسری قسم سے متعلق، شکر کی تعریف اور اس کے اقسام سے متعلق مکمل گفتگو چوتھی تاریخ کی دعا کے تیسرے فراز کے ذیل میں ہوچکی ہے۔

لغت میں ''شکور'' ''کثیر الشکر'' یعنی زیادہ قدردانی کرنے والے کو کہتے ہیں اور مذکورہ دعامیں ''مشکوراً'' اسم مفعول بمعنای امر ہے یعنی شکر کر، قبول کر گویا اس دعا میں ایک بندہ اپنے معبود سے یہ کہہ رہا ہے خدایا! اطاعت و عبادت کی راہ میں میری کوشش کو قابل قدر اور قابل قبول قرار دے۔ اسی مطلب کو حضرت امام حسین علیہ السلام نے دعائے عرفہ میں یوں فرمایا:

"وَإِنْ أَطَعْتُكَ شَكَرْتَنِي"[1]

''خدایا میں نے جب بھی تیری اطاعت کی تو نے میری قدردانی کی''

خدا اور بندہ کا شکر

یہ بات یادرہے، خدا کا شاکر ہونا بندہ کے شاکر ہونے کی طرح نہیں ہے اور اسی طرح خدا کا مومن ہونا بندہ کے مومن ہونے کی طرح نہیں ہے خدا کا اہلبیت علیہم السلام پر صلوات بھیجنا بندوں کے صلوات بھیجنے کی طرح نہیں ہے، بندہ کا شاکر ہونا یعنی نعمت کے مقابل نعمت عطا کرنے والے کی قدردانی کرنا اور اس نعمت کا صحیح اور جائز استعمال کرنا ہے مگر اللہ کے شاکر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اعمالِ خیر بجالانے والوں کی

---

[1] مفاتیح الجنان، دعائے عرفہ امام حسین علیہ السلام

قدردانی کرتا ہے اور اُن کے اعمال کو ضائع نہیں ہونے دے گا اور مطابقِ عمل انہیں جزا عطا کرتا ہے۔

دوسرا فقرہ: "وَذَنْبِی فِیهِ مَغْفُوراً"

دعا کے اس فقرہ میں بندہ اپنے رب سے درخواست کرتا ہے کہ خدایا تو میرے گناہ کو بخش دے۔ "ذنب" عربی میں گناہ کو کہتے ہیں جس کی جمع "ذنوب" ہے مگر یہاں پر "ذنب" سے مراد صرف ایک گناہ کو نہیں، بلکہ وہ سارے گناہ مراد ہیں جن کا بندہ دعا کے اس فقرہ کو زبان پر لانے تک مرتکب ہوا ہے اور "مغفور" اسمِ مفعول ہے مادۂ "غفر" سے جس کے معنی ہے "بخشیدہ شدہ" اور یہاں پر اسم مفعول امر کے معنی میں ہے گویا اس بات کی تاکید ہے خدایا یقینی طور پر میرے گناہ بخش دے۔

غافر، غفّار اور غفور صرف خدا کی ذات ہے

"غفر" سے غافر ہے یعنی گناہ بخشنے والا پھر اسی سے اسمِ مبالغہ "غفّار" ہے یعنی بہت زیادہ بخشنے والا اور اسی طرح غفور بھی ہے۔ خدا کے لئے یہ عناوین قرآن کریم کی متعدد آیات میں موجود ہیں یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ ماہِ مبارک رمضان جو کہ خصوصی طور پر ماہِ مغفرت ہے، خود "رمضان" کے معنی سے بھی یہ بات روشن ہے، گناہوں سے مغفرت صرف زبان سے "استغفر اللہ" سو یا ستر مرتبہ کہنے سے حاصل نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لئے اُن شرائط کا لحاظ کرنا ضروری ہے جن کا ذکر پانچویں تاریخ کے پہلے فقرہ "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِی فِیهِ مِنَ الْمُسْتَغْفِرِینَ" کے ضمن میں نہج

البلاغہ کی حکمت نمبر ۴۱۷ کی روشنی میں ہو چکا ہے، قرآن کریم میں بھی ارشاد رب العزت ہے:

﴿وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً ثُمَّ اهْتَدَي﴾[1]

"اور میں بہت زیادہ بخشنے والا ہوں اس شخص کے لئے جو توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے اور پھر راہِ ہدایت پر ثابت قدم رہے"۔

آیت کریمہ سے بھی یہ بات روشن ہے اگر کوئی بغیر توبہ اور گذشتہ کی تلافی کئے بغیر اور اسی طرح ایمان اور اعمالِ صالحہ کے بغیر خداوند کریم سے طلبِ مغفرت کرے تو بے فائدہ ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ بندہ مغفرت کے لئے اپنے آپ کو رحمت و مغفرت کے مقام پر قرار دے یعنی اپنے آپ کو اس پوزیشن میں قرار دے کہ خدا سے مغفرت کا طلبگار بن سکے اور اس پوزیشن کا حصول مذکورہ شرائط پر عمل کئے بغیر ناممکن ہے، یعنی بندہ گذشتہ گناہوں پر شرمندگی اور اُن گناہوں کی آئندہ تکرار نہ کرنے کے عزمِ مصمم کے ہمراہ خدا اور قیامت پر مکمل ایمان اور اس کی عبادت و اطاعت کے ہمراہ اس سے طلبِ مغفرت کرے اگر اس پوزیشن کے ساتھ بندہ خدا سے مغفرت طلب کرے گا تو بڑے سے بڑے گناہ بھی اپنی رحمت و کرم سے انشاء اللہ بخش دے گا۔

---

[1] سورۂ طٰہٰ، آیت ۸۲۔

تیسرا فقرہ: "وَعَمَلِي فِيهِ مَقْبُولاً"

دعاکے اس جملہ سے واضح ہے کہ صرف عمل کافی نہیں ہے، بلکہ عمل کا خدا کی بارگاہ میں قبول ہونا ضروری ہے، عمل تو ہابیل کے ساتھ ساتھ قابیل نے بھی پیش کیا تھا مگر صرف ہابیل کا عمل درگاہِ حق میں قبول ہوا؛ کیونکہ قابیل کے عمل کے ہمراہ وہ شرائط موجود نہیں تھے جو قبولیت عمل کے لئے ضروری ہیں۔

مولیٰ الموحدین حضرت امام علی بن ابی طالبؑ کا ارشاد گرامی ہے: وہ کثیر، کثیر نہیں ہے جسے خدارد کردے اور وہ قلیل قلیل نہیں ہے جسے اللہ سبحانہ قبول کرلے۔

اعمال قبول ہونے کے شرائط:

ا۔ عمل شریعت کے مطابق ہو

عمل کا حکمِ الٰہی اور مرضیٔ الٰہی کے مطابق ہونا ضروری ہے، مثلاً آپ صبح کی دو رکعت نماز کے بجائے فرطِ محبتِ خدا میں چار رکعت پڑھ لیں یا محمد وآل محمد علیہم السلام کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر اپنی جانب سے نماز میں کمی وزیادتی کریں تو وہ عمل قابلِ قبول نہیں ہے چنانچہ خداوند کریم قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْأِسْلاَمِ دِيناً فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْأخِرَةِ مِنْ الْخَاسِرِينَ﴾[1]

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۸۵۔

”جو بھی اسلام سے ہٹ کر کسی اور دین کی تلاش کرے اس سے اس کا دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا“

یقیناً جب خدا کو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین پسند اور قابل قبول نہیں ہے تو پھر اسلامی طریقے سے ہٹ کر کوئی اور عمل بھی قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

۲۔ عمل کا ولایت کی بنیاد پر ہونا

مصحفِ ناطق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ الصَّلَاةِ وَ الزَّكَاةِ وَ الْحَجِّ وَ الصَّوْمِ وَ الْوَلَايَةِ وَ لَمْ تُنَادَ بِشَيْءٍ مَا نُودِيَ بِالْوَلَايَةِ وَ زَادَ فِيهَا عَبَّاسُ بْنُ عَامِرٍ فَأَخَذَ النَّاسُ بِأَرْبَعٍ وَ تَرَكُوا هَذِهِ يَعْنِي الْوَلَايَةَ"[1]

”اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: نماز، زکوۃ، روزہ، حج اور ولایت کسی بھی چیز کی جانب ولایت کے بقدر بُلایا نہیں گیا مگر لوگوں نے (ابتدا کے) چار کو لے لیا اور ولایت کو چھوڑ دیا“

۳۔ عمل کے وقت اخلاص و تقویٰ کا ہونا

اگر عمل میں اخلاص نہ ہو تو وہ اللہ کے نزدیک نا قابل قبول ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلاَّ لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾[2]

---

[1] ۔کافی، ج۲، ص۱۸۔

[2] ۔سورۂ بیّنہ، آیت ۵۔

''انھیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا کہ خدا کی عبادت کریں اور اس عبادت کو خالص رکھیں''

اور اسی طرح عملِ صالح کے ساتھ ساتھ تقویٰ بھی ضروری ہے یعنی گناہوں سے پرہیز کریں حضرت امام رضاؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"لَا دِینَ لِمَنْ لَا وَرَعَ لَهُ"[1]

''جو شخص ورع و تقویٰ نہیں رکھتا وہ دین بھی نہیں رکھتا ہے''

۴۔آخری لحظۂ حیات تک ایمان پر باقی رہنا

اعمال کی قبولیت کے لئے بندہ کا خاتمہ بخیر ہونا ضروری ہے یعنی اس کی موت ایمان پر ہو اسی لئے ہمیشہ زندگی کے انجام بخیر کی دعا مانگتے رہنا چاہئے اگر انسان زندگی بھر ایمان اور اسلام پر رہے اور آخری وقت کفر و شرک پر مرجائے تو قرآن اور احادیث معصومینؑ کی روشنی میں اس کے تمام اعمال حبط اور برباد کر دیئے جائیں گے۔

چوتھا فقرہ: "وَعَيْبِی فِیهِ مَسْتُوراً"

بندہ، خالق کی بارگاہ میں دست بدُعا ہے کہ خدایا آج کے دن میرے عیوب کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپادے۔ظاہر سی بات ہے ہر انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ اس کے عُیوب لوگوں کی نگاہوں میں پوشیدہ رہیں۔

[1]۔ کمال الدین و تمام النعمۃ، ص ۳۷۱.

عیب، دو طرح کے ہوتے ہیں: ظاہری اور باطنی۔ پھر ظاہری عیب بھی دو قسم کے ہیں: ایک وہ جو خود انسان اپنے اندر پیدا کرلیتا ہے جیسے گندگی اور کثافت۔ دوسری قسم وہ ہے جو خدا کی جانب سے ہیں جیسے اندھا، لنگڑا یا لولا پیدا ہونا۔

مگر کچھ عیب باطنی ہوتے ہیں یہ تمام کے تمام انسان ہی کی جانب سے ہوتے ہیں جس کی تاثیر اس کی رفتار و گفتار میں بھی نظر آتی ہے جیسے حسد، کینہ، شرک وغیرہ۔ ان باطنی عیوب اور بیماریوں کی بناپر انسان بُرے اعمال کا مرتکب ہوتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ جو عیوب خود انسان کی طرف سے ہیں وہ ظاہری ہوں یا باطنی، انھیں سعی و کوشش کے ذریعہ اپنے سے دور کرلینا چاہئے اور توبہ کرلیں تو پھر بندہ کی مخلصانہ کوشش کو دیکھ کر خدا بھی اس کے گذشتہ عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔

غفاریت، ستاریت کا سرچشمہ

ظاہر سی بات ہے انسان کے بُرے اعمال اس کے لئے عیب ہیں لہٰذا انسان سوءِ حال سے حُسنِ حال کی طرف توبہ و استغفار کرکے پلٹ آئے تو خدا اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے؛ کیونکہ اللہ کی ذات ''غفار الذنوب'' ہے جب وہ بخش دے گا تو انھیں محو بھی کردے گا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

" إِذَا تَابَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ تَوْبَةً نَصُوحاً، أَحَبَّهُ اللَّهُ فَيَسْتُرُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ"[۱]

---

[۱]۔ کافی، ج۲، باب توبہ، ص ۴۳۰.

”جب بندۂ مومن اخلاص کے ساتھ توبہ کرتا ہے تو اللہ اس بندہ کو پسند کرتا ہے اور دنیا وآخرت میں اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے“

خالق کائنات کی بارگاہ میں آج کے دن یہی دعا ہے اے غفار الذنوب، اے ستار العیوب تجھے تیری رحمت کا واسطہ ہمارے گناہوں کو بخش دے اور دنیا وآخرت میں ان پر پردہ ڈال دے۔

ستائیسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنی فِیهِ فَضْلَ لَیْلَةِ الْقَدْرِ وَصَیِّرْ اُمُوری فِیهِ مِنَ الْعُسْرِ إلَی الْیُسْرِ وَاقْبَلْ مَعاذِیری، وَحُطَّ عَنِّی الذَّنْبَ وَالْوِزْرَ، یَا رَؤُوفاً بِعِبادِهِ الصَّالِحِینَ»

”خدایا! اس شب میں، میرے حصّہ میں شب قدر کی فضیلت قرار دے اور میرے مشکل امور کو آسان بنادے اور میرے عذر کو قبول فرما اور میرے گناہ اور بوجھ کو ختم کردے اے اپنے نیک بندوں پر مہربان“

اہم مطالب:

بندہ اس دعا میں چار اہم چیزوں کی درخواست کرتا ہے:

۱۔ شب قدر کی فضیلت کے ادراک کی۔

۲۔ رفعِ مشکلات کی۔

۳۔ عذر و گناہ کی معافی کی۔

۴۔ محوِ گناہ کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنی فِیهِ فَضْلَ لَیْلَةِ الْقَدْرِ"

دعاکے اس فقرہ میں بندہ خدا یہ سے درخواست کرتا ہے کہ خدایا آج کے دن شبِ قدر کی فضیلت کو میرا نصیب قرار دے۔

ستائیسویں تاریخ میں شبِ قدر کا تذکرہ کیوں؟

یہ اہم سوال ہے جو اس دعا کے ہر قاری کے ذہن پر اُبھرنا لازمی ہے جب شبہای قدر ختم ہو چکے ہیں تو یہ دعا آج کے دن کیوں مانگی جارہی ہے بالخصوص ستائیسویں کی شب جو اہل سنت کے لحاظ سے شبِ قدر ہے۔

میں نے اس سوال کو متعدد علماء سے دریافت کیا اور کافی کتابوں میں اس کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی مگر اکثر جوابات خود میرے لئے قابلِ ہضم نہیں تھے لہٰذا اُن جوابات کو یہاں ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھ رہا ہوں۔

حجۃالاسلام والمسلمین آقای روح بیدرام نے "زمزۂ روزہ داران" میں اس سوال کو اٹھاتے ہوئے جواب دیا کہ اس کی کئی وجہ یں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ شبِ قدر کے بعد شب عید تک ہر شب، مقدس شبِ ہے۔

۲۔ بعض روایتوں میں انیسویں کی شب، اکیسویں کی شب یا تیئسویں کی شب، ان تینوں شبوں میں سے ایک شب کو شبِ قدر ہونے کا احتمال دیا گیا مگر ضعیف السند حدیثوں میں ستائیسویں کی شب کو بھی شب قدر کہا گیا ہے،

لہٰذا ممکن ہے، آخری احتمال کے پیش نظر ستائیسویں کی تاریخ میں شب قدر کا ذکر کیا گیا ہے۔

حقیر کی رائے:

جیسا کہ مقدمہ کتاب میں بھی اس کی وضاحت کی جاچکی ہے کہ اس بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان دعاؤں کا ماثورہ ہونا (یعنی کسی بھی معصومؑ سے ان کا صادر ہونا) ثابت نہیں ہے؛ کیونکہ جہاں بھی ان دعاؤں کا ذکر ہے اُن کی استناد کسی معصومؑ کی جانب نہیں دی گئی ہے اگرچہ اس میں موجود مضامین یقیناً معصومین علیہم السلام کی دعاؤں سے ماخوذ ہیں لہٰذا ثواب کی امید میں رجائے مطلوب کی نیت سے ان دعاؤں کا پڑھنا یقیناً باعثِ ثواب ہے بس اسی بات کے پیش نظر ناچیز نے بھی دیگر شارحین کی طرح ان دعاؤں کی شرح کرنے کی ہمت کی ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ جب ان دعاؤں کا کسی معصومؑ سے صادر ہونا ثابت نہیں ہے تو پھر یہ بحث ہی بے فائدہ ہے کہ شبِ قدر کا ذکر، ستائیس کی دعا میں کیوں ہے؟

نوٹ: شب قدر کی فضیلت اور اس کی عظمت پر مستقل کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دعاؤں کی متعدد کتابوں میں بھی تفصیل کے ساتھ فضائلِ شب قدر اور اعمالِ شب قدر کا ذکر موجود ہے لہٰذا اس موضوع پر مزید معلومات کے خواہاں حضرات، ان کتابوں کی جانب رجوع فرمائیں ہم اختصار کے پیش نظر یہاں اس بحث کو ختم کر رہے ہیں۔

ا۔ شب قدر، شبِ مقدارت

﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾ سورۂ قدر کی فضیلت اس آیۂ کریمہ سے واضح اور ثابت ہے کہ یہ شب، قدر کی رات ہے یعنی ائمہ معصومینؑ نے اس آیۂ کریمہ کی شرح و تفسیر کے ذیل میں فرمایا کہ اس شب کو شبِ قدر اسی لئے کہا گیا؛ کیونکہ پروردگار عالم انسان کی تقدیر اور اس کا نصیب اسی شب میں لکھتا ہے یعنی انسان کے سال بھر کے امور کا تعیّن اُسی شب میں ہوتا ہے۔

۲۔ شب قدر، شب نزول قرآن

یہ شب، شبِ نزول قرآن ہے جیسا کہ خود خالق کائنات نے سورۂ قدر کی پہلی ہی آیت میں یہ واضح کردیا: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ”ہم نے اس کو (قرآنِ کریم) شبِ قدر میں نازل کیا“۔

مفسر قرآن آیۃ اللہ سید محمد حسین طباطبائیؒ اپنی تفسیر میں مذکورہ آیۂ کریمہ کے ذیل میں لکھتے ہیں: قرآنِ کریم کے دو نزول ہیں: ا۔ نزول دفعی ۲۔ نزول تدریجی

ا۔ **نزول دفعی:** یعنی قرآنِ کریم قلبِ مبارک رسول اکرم ﷺ پر یکبارگی نازل ہوا، ہوسکتا ہے دونوں نزول کی کیفیت اور جزئیات مختلف رہے ہوں، مگر پورا قرآن دفعتاً اور یکبارگی جس شب میں نازل ہوا وہ شب، شب قدر ہے۔

۲۔ **نزول تدریجی:** یعنی قرآن کریم قلبِ نازنینِ رسالتمآب ﷺ پر ۲۳؍سال کی مدت میں تدریجاً آیات اور سوروں کی شکل میں نازل ہوتا رہا جس کا آغاز ۲۸؍رجب اوّل بعثت سے سرزمین مکہ کے ایک غار سے سورۂ علق کی ابتدائی

پانچ آیتوں سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ رسول اسلام ﷺ کی آخری عمر شریف تک جاری رہا۔[1]

۳۔ شب قدر، شبِ دعا و مناجات اور شب بیداری

ظاہر سی بات ہے جب شب قدر، شبِ مقدراتِ انسان ہے تو بندۂ مومن کو چاہیئے کہ وہ رات بھر جاگ کر دعا و مناجات کرے؛ کیونکہ یہ شب ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس شب کا (خیر) بہتر ہونا بھی مقید نہیں ہے، بلکہ مطلق ہے یعنی خالقِ کائنات نے یہ نہیں کہا یہ شب فلاں لحاظ سے بہتر ہے، بلکہ یہ اعلان کیا ہے﴿خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾ یہ شب ہر لحاظ سے بغیر کسی قید کے ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اسی لئے اس رات میں پڑھنے کے لئے کافی طویل ماثورہ دعائیں، دعا و مناجات کی معتبر کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔

لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ ہم اس رات کی عظمت کو جانیں اور اس کو سمجھنے کی کوشش کریں اگرچہ کماحقہ ادراک ناممکن ہے مگر جس حد تک بھی ممکن ہو اُسے ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ پروردگار عالم سے یہی دعا ہے کہ مالک ہم کو شبِ قدر کی عظمت اور نورِ قرآن کی روشنی سے ہمارے قلوب کو منور فرما۔

---

[1] ۔ مزید تفصیل کے لئے علوم قرآن کی کتابوں کی جانب رجوع فرمائیں۔

دوسرا فقرہ: "وَصَيِّرْ أُمُورِی فِيهِ مِنَ الْعُسْرِ إِلَى الْيُسْرِ"

اس فقرہ میں بندہ کی معبود سے دعا ہے: خدایا! آج کے دن میری مشکلات کو آسان بنادے، یعنی ہماری مشکلوں کو حل کردے۔ عربی میں ''عُسر'' تنگی اور مشکل کو کہتے ہیں اور ''یُسر'' کشادگی اور راحت کو کہتے ہیں۔

مصیبتوں اور سختیوں کے اسباب:

ا۔ کبھی خود انسان مصیبتوں اور سختیوں کو دعوت دیتا ہے جیسے کہ کوئی تاجر اپنی پوری جمع پونجی کو لے کر کسی صلاح و مشورہ کے بغیر کسی غیر معتبر انسان کے ساتھ تجارت کرے تو وہ یقیناً تجارت میں گھاٹا دکھا کر مشکلات میں گرفتار کردے گا یہ مشکل خود اس کی دعوت دی ہوئی ہے یا جیسے کسی جنگل کے اندر جانے سے ممانعت کا بورڈ لگا ہو کہ خبردار اس میں نہ جاؤ، کیونکہ اس جنگل میں شیر اور چیتے آزاد گھوم رہے ہیں اگر کوئی جانتے ہوئے بھی اس جنگل میں چل پڑے اور اثنائے راہ شیر دوڑا لے تو یہ مشکل اور مصیبت خود اس کی دعوت دی ہوئی ہوگی۔

بالکل اسی طرح معصومین علیہم السلام نے ہمیں آگاہ کردیا ہے کہ اگر یہ کام کروگے تو گھر میں نحوست کے شکار ہو جاؤگے اگر ہم نے ان اقوالِ معصومین علیہم السلام کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جن امور سے منع کیا گیا ان کو کر بیٹھے تو یقیناً مکافاتِ عمل اور عکس العمل کے نتیجے میں پریشانیوں کے شکار ہوں گے۔

۲۔ بعض سختیاں اور پریشانیاں رضائے معبود کے لئے ہوتی ہیں، مگر جن کی جزا میں دنیا و آخرت میں عزت و سربلندی اور آخرت کے فوائد نصیب ہوتے ہیں جیسے راہِ خدا میں جہاد کرنا یقیناً یہ بہت سخت کام ہے مگر اس کی جزا ان سختیوں کے مقابل بہت زیادہ ہے۔

۳۔ کبھی کبھی ایک بہت بڑے ضرر کو دور کرنے میں سختیاں پیش آتی ہیں جیسے اگر کوئی راہِ حق کو چھوڑ دے اور باطل کا آلہ کار بن جائے تو اُسے مادی و دنیاوی منافع ہاتھ آسکتے ہیں ہاں خدا کا بندہ فقر و فاقہ کی سختیاں تو برداشت کرلیتا ہے مگر دین و ایمان کی بربادی اُسے منظور نہیں ہوتی۔

۴۔ کبھی مشکلیں اور مصیبتیں الٰہی سختیوں اور الٰہی فیصلوں کے ماتحت ہوتی ہیں جیسے، آندھیاں، زلزلے وغیرہ۔

بہر حال انسان کی زندگیوں میں تلخیاں، مشکلات اور مصائب نہ ہو تو وہ آسائش اور راحت کو سمجھ نہیں سکتا اسی لئے قرآن کریم میں خداوند کریم کا ارشاد گرامی ہے: ﴿إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْراً﴾[1] لحنِ قرآن ملاحظہ فرمائیں یہ نہیں کہا ہر سختی کے بعد راحت ہے، بلکہ یہ فرمایا: "ہر سختی اور تنگی کے ساتھ راحت اور سکون ہے"۔ راحت و سکون بھی اس سختی اور مصیبت میں ہے۔

---

[1] سورۂ انشراح، آیت ۵.

سختیوں سے نکلنے کا واحد راستہ

وہ مشکلات جنھیں خود انسان نے دعوت دی ہے یا بطور سزا، عکس العمل اور مکافاتِ عمل کے عنوان سے ظاہر ہوتے ہیں، اُن سے نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان قرآن کریم اور احادیث معصومین علیہم السلام میں غور و فکر کرے۔ قرآن و سنت میں ہر مشکل کا حل موجود ہے آج دنیا میں امت واحدہ کا جو شیرازہ بکھر چکا ہے اور بکھری ہوئی امت بن کر ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں صرف اور صرف راہِ قرآن اور راہ اہل بیت علیہم السلام گم کر دینے کا نتیجہ ہے:

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكاً﴾[1]

"جو میری یاد سے منھ موڑے گا اُسے یقیناً دشوار زندگی نصیب ہوگی"

تیسرا فقرہ: "وَاقْبَلْ مَعاذِيرِی، وَحُطَّ عَنِّی الذَّنْبَ وَالْوِزْرَ"

دعا کے اس فقرہ میں بندہ اپنے خالق کی بارگاہ میں یہ درخواست کر رہا ہے: خدایا میرے "معاذیر" یعنی عذروں کو قبول فرما، گناہ اور "وزر" (بوجھ) کو محو فرما۔

یقیناً خداوند کریم دانستہ یا نادانستہ کئے ہوئے خطاؤں کو معاف کرکے بندہ کے عذر کو قبول کرلیتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ بندہ اپنی خطاؤں کی جانب متوجہ ہونے کے بعد خدا کی بارگاہ میں لوٹے پھر اُن گناہوں کی آئندہ تکرار نہ کرنے کا عزمِ مصمم کرلے اور

[1] سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۲۴.

جب پروردگار بندہ کے عذر اور گناہ کو قبول کرلیتا ہے تو پھر یقیناً اس کی گناہ کو بھی محو کردیتا ہے۔ لہٰذا بندہ کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے:

﴿لاَ تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللهِ إِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعاً﴾[۱]

"اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندوں جنھوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں اللہ تمام گناہوں کا معاف کرنے والا ہے"

آج کے دن بندہ کی درخواست خالق کی بارگاہ میں یہی ہے کہ وہ عذروں کو قبول کرتے ہوئے گناہ اور آثارِ گناہ کو محو کردے؛ کیونکہ وہ رؤف و رحیم ہے۔ "رؤف" بروزن "فَعُول" اللہ کے اسمائے حُسنیٰ میں سے ہے اور قرآن کریم میں گیارہ بار آیا ہے اور اکثر صفتِ رحیم کے ہمراہ آیا ہے "رؤف" مادۂ "رأفت" سے ہے جس کے معنی بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے اسی لئے بندہ، خدا کو "يَا رَؤُوفاً بِعِبادِهِ الصَّالِحِينَ" کہہ کر خطاب کررہا ہے۔

۱۔ سورۂ زمر، آیت ۵۳.

اٹھائیسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ وَفِّرْ حَظّی فِیهِ مِنَ النَّوافِلِ وَأَكْرِمْنی فِیهِ بِإحْضارِ الْمَسائِلِ وَقَرِّبْ فِیهِ وَسِیلَتی إلَیْكَ مِنْ بَیْنِ الْوَسائِلِ، یَا مَنْ لاَ یَشْغَلُهُ إلْحاحُ الْمُلِحِّینَ»

''خدایا! اس دن میں میرے حصہ کو نوافل و مستحبات سے زیادہ قرار دے، مسائل کو میرے لئے آمادہ کرکے میرے حق میں کرم فرما، اپنے سے قریب ہونے کے وسیلہ کو قریب فرما اے وہ ذات جس کو لجاجت کرنے والوں کی لجاجت مشغول نہیں کرسکتی''

اہم مطالب:

خداوند کریم کی بارگاہ میں بندہ کی تین اہم درخواست:

۱۔ زیادہ سے زیادہ مستحبات بجالانے کی توفیق کی۔

۲۔ مسائل اور حالات کو اپنے حق میں آمادہ اور سازگار بنانے کی۔

۳۔ تمام وسائل میں سے خدا تک پہونچنے کے وسیلہ کو اپنے سے قریب کرنے کی۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ وَفِّرْحَظِّی فِیہِ مِنَ النَّوافِلِ"

نوافل سے مراد کیا ہے؟

نوافل، نافلہ کی جمع ہے اور نافلہ مادۂ "نَفَل" سے ہے، لغوی اعتبار سے جس کے معنی افزائش اور اضافہ کے ہیں اسی سے "اَنفَال" بھی ہے اور اسی نام سے قرآن کریم میں ایک سورہ بھی ہے جس میں جنگ بدر سے متعلق آیات ہیں۔ انفال سے مراد وہ مال و ثروت ہے جو اپنے ساز و سامان پر اضافہ ہو، یعنی وہ مال وثروت جو انسان کی اپنی ملکیت نہ ہو، بلکہ جنگ میں مالِ غنیمت کے طور پر ہاتھ آیا ہو یا وہ جنگل اور صحرا جس کا انسانوں میں کوئی بھی مالک نہ ہو، مختصر یہ ہے کہ نفل اضافہ اور زیادتی کو کہتے ہیں۔

اسی طرح عبادات میں اُن عبادتوں کو "نوافل" کہتے ہیں جو واجبات پر اضافہ اور زیادہ ہوں، لہٰذا تمام مستحبات، نوافل کے حکم میں ہیں؛ کیونکہ یہ سب واجبات پر اضافہ ہیں۔

نوافل اور واجبات میں امتیازی فرق یہ ہے کہ واجبات ان امور کو کہا جاتا ہے جن کا انجام دینا بندۂ مکلّف پر واجب ہے اور ترک کرنے کی صورت میں عذابِ الٰہی کا مستحق ہوگا مگر نوافل (مستحبات) وہ امور ہیں جن کے انجام دینے سے بندۂ مکلّف، اللہ کے پاس جزاو ثواب کا مستحق ہوگا، مگر ترک کرنے کی صورت میں اس کے لئے کوئی عذاب و عقاب نہیں ہے۔ لہٰذا اولویت واجبات کو ہے اسی لئے مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

"إِذَا أَضَرَّتِ النَّوَافِلُ بِالْفَرِيضَةِ فَارْفُضُوهَا"[1]

"جب بھی نوافل (مستحبات) واجبات کو نقصان پہونچائیں تو ایسی صورت میں نوافل کو چھوڑ دیں"

لیکن اس سے ہر گز یہ مراد نہیں ہے کہ آپ مستحبات کو ترک کرنے کے لئے واجبات کو بہانہ قرار دیں۔ نوافل و مستحبات کا ثواب واجبات سے زیادہ ہے؛ کیونکہ ان کا بجالانا اللہ سبحانہ کی جانب سے لازم اور فرض نہیں ہے، لہٰذا اجر بھی زیادہ ہے اور احادیثِ معصومین علیہم السلام میں مستحبات کو بجالانے کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

قرآن کریم میں نوافل کا ذکر

قرآن کریم میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

﴿وَمِنْ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ عَسَي أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاماً مَحْمُوداً﴾[2]

"(اے رسول) اور رات کا ایک حصّہ قرآن کے ساتھ بیدار رہیں یہ آپ کے لئے اضافۂ خیر ہے، عنقریب آپ کا پروردگار آپ کو مقامِ محمود تک پہونچا دے گا"

آیۂ کریمہ میں "تہجّد" سے مراد نیند کے بعد بیدار ہونا ہے اور نماز شب کو نماز تہجد اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بندۂ مومن رات کے ابتدائی حصّہ میں سو جاتا ہے پھر وہ نماز

۱۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار، ۲۷۱.

۲۔ سورۂ اسراء، آیت ۷۹.

صبح کے وقت سے پہلے نماز شب پڑھنے کے لئے بیدار ہوتا ہے، لہٰذا اس نماز کو نمازِ تہجّد کہتے ہیں اور مذکورہ آیۂ کریمہ میں ''نافلۂ تہجد'' سے مراد نمازِ شب ہے اور مقامِ محمود سے مراد وہ مقام و منزلت ہے جس کی حمد و ستائش کی گئی ہے، آیت میں ''محمود'' مطلق ذکر ہوا ہے یعنی ''مقامِ محمود'' اس مرتبہ و منزلت کا نام ہے جو خدا اور تمام بندوں کی جانب سے ستائش شدہ ہے۔

نماز شب کی فضیلت

جیسا کہ مذکورہ آیۂ کریمہ سے واضح ہے کہ رات کے ایک حصّہ کو نماز شب کے لئے قرار دینے کا حکم ہے، اگرچہ آیۂ کریمہ میں خطاب، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص ہے لیکن دوسروں کے لئے نماز شب، مستحب ہے اور نماز شب پڑھنے کا نتیجہ اللہ کی جانب سے مقامِ محمود عطا ہونا ہے اور یہ ہر ایک کے لئے اس کی عبادت و اطاعت کے مطابق عطا ہوتا ہے رسول کے لئے مقامِ محمود مقامِ شفاعت ہے؛ کیونکہ قیامت کے دن سبھی کی یہ خواہش ہوگی کہ رسولؐ اس کی شفاعت کریں۔ مقامِ محمود وہ مقام و منزلت ہے جس کی حمد و ستائش اور تعریف کی گئی ہے اسی لئے روایات میں بھی وارد ہے کہ جو بندہ نماز شب پڑھتا ہے وہ خدا سے قریب ہوتا ہے اور وہ لوگوں کی نگاہ میں بھی محترم اور معتبر ہو جاتا ہے شاید مومن کے لئے یہی مقام، مقام محمود[1] ہے جو نماز شب پڑھنے کے سبب حاصل ہوتا ہے۔

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۱۷۔

متعدد روایات میں نماز شب کی فضیلت کا ذکر ہے کچھ آیات بطور صریح نماز شب کی فضیلت کو بیان کرتی ہیں جن میں سے ایک مذکورہ آیۂ کریمہ ہے جس کی تفسیر کے بارے میں مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ خطاب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص ہے، لہٰذا نماز شب آپ پر واجب تھی، جبکہ باقی انسانوں پر مستحب ہے، جس کی دلیل میں ائمہ اطہار علیہم السلام سے منقول احادیث بھی ہیں۔

﴿.....وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالأَسْحَارِ﴾[1]

"اور سحر کے اوقات میں استغفار کرنے والے ہیں"

مفسرین نے اس آیۂ کریمہ کی تفسیر یوں کی ہے کہ اس آیت میں "المستغفرین بالاسحار" سے مراد وتر (نماز شب کی آخری رکعت) کے قنوت میں "استغفر اللہ" کا بکثرت ذکر کرنے والے افراد ہیں، چنانچہ ابو بصیر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے جب ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالأَسْحَارِ﴾ کے بارے میں سوال کیا کہ مولا اس سے مراد کون ہیں تو امامؑ نے فرمایا: "المصلين وقت السحر؛ جو سحر کے وقت نماز پڑھتے ہیں"۔[2]

ایک اور جگہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: آیت میں "المستغفرین بالاسحار" سے مراد "مَن اسْتَغْفَرَ اللّٰهَ سَبْعِينَ مَرَّةً فِي الْوَتْرِ بَعْدَ الرُّكُوعِ ؛وہ ہیں جو نماز وتر میں رکوع کے بعد ستر مرتبہ استغفر اللہ کا ذکر کرتے ہیں"۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، ج۲، ص ۷۱۳.

[2] البرہان، ج۱، ص ۶۰۳.

ان کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جن میں نماز شب کا ذکر صریحی یا غیر صریحی طور پر آیا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے وصیت فرمائی:

"يَا عَلِيُّ عَلَيْكَ بِصَلَاةِ اللَّيْلِ، بِصَلَاةِ اللَّيْلِ، بِصَلَاةِ اللَّيْلِ"[۱]

"اے علی میں آپ کو نماز شب کی تاکید کرتا ہوں"

اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ اس جملہ کو دُہرایا، حیرت کی بات ہے کہ مولی الموحدین حضرت علی علیہ السلام جیسی شخصیت مخاطب ہونے کے باوجود، تاکید اور اصرار، نماز شب کی بے انتہا اہمیت و فضیلت کی نشاندہی کر رہی ہے۔

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے "لیلۃ الہریر" (جنگ صفین کی رات) کو اور امام حسین علیہ السلام نے روز عاشور حضرت زینب کبری علیہا السلام سے نماز شب کی تاکید کی ہے، لہٰذا اہلبیت علیہم السلام کے ارشادات پر عمل کرتے ہوئے ہمیں نماز شب کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔

روایتوں میں آیا ہے حضرت ابراہیمؑ کو خلیل اللہ کا لقب اس لئے ملا کہ آپ لوگوں کو کھانا کھلاتے اور نماز پڑھتے تھے جب کہ اُس وقت دوسرے لوگ خوابِ غفلت میں پڑے رہتے تھے۔ ہمیں حضرت ابراہیمؑ کی سیرت کو اپنانا ہوگا یعنی ضرورت مند مسلمانوں کو کھانا کھلانا اور نماز شب کو پابندی کے ساتھ انجام دینا چاہیے۔

نماز شب اور عزت و شرافت

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

۱۔ من لایحضرہ الفقیہ، باب صلاۃ اللیل، ص ۳۲۵۔

"شَرَفُ الْمُؤْمِنِ صَلَاتُهُ بِاللَّيْلِ وَ عِزُّ الْمُؤْمِنِ كَفُّهُ عَنْ أَعْرَاضِ النَّاسِ".[۱]

"مومن کا شرف نماز شب پڑھنے میں ہے اور اس کی عزت لوگوں کی آبرو ریزی کرنے سے پرہیز میں ہے"

ہر انسان کی خواہش اور تمنا ہوتی ہے کہ اُسے شرافت و عزت حاصل ہو اور جو لوگ خود کو باعزت سمجھتے ہیں انھیں یہ فکر رہتی ہے کہ معاشرے میں ان کی عزت و شرافت میں روز بروز اضافہ ہو اور یہ لوگ اسی خواہش اور تمنا میں پوری زندگی میں انواع و اقسام کے مشکلات کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کما حقہ کامیاب نہیں ہوتے ہیں؛ کیونکہ اللہ نے حقیقی شرافت اور عزت لوگوں کو کھانا کھلانے اور نماز شب میں رکھی ہے۔

نماز شب زینتِ آخرت

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"﴿الْمالُ وَ الْبَنُونَ زِينَةُ الْحَياةِ الدُّنْيا﴾ إِنَّ الثَّمَانَ رَكَعَاتٍ يُصَلِّيهَا الْعَبْدُ آخِرَ اللَّيْلِ زِينَةُ الْآخِرَةِ"[۲]

"(اے لوگو) اولاد اور دنیاوی دولت زندگانیٔ دنیا کی زینت ہیں بجز آٹھ رکعت نماز کے جو رات کے آخری وقت میں پڑھی جاتی ہے وہ آخرت کی زینت ہے"

۱۔ کافی، ج۳، ص۴۸۸.

۲۔ بحار الانوار، ج۸۴، باب فضل صلاۃ اللیل، ص۱۵۲.

ان کے علاوہ متعدد احادیث ہیں جن میں معصومین علیہم السلام سے نماز شب کی فضیلت بیان ہوئی ہیں۔

بارگاہ رب العزت میں ہماری دعا ہے کہ خدایا ہمیں سحر خیزی اور نماز شب پڑھنے کی توفیق عطا فرما۔

دوسرا فقرہ"وَأَكْرِمْنِی فِيهِ بِإِحْضارِ الْمَسائِلِ"

دعا کے اس فراز میں بندہ اپنے معبود سے درخواست کرتا ہے کہ خدا ''احضارِ مسائل'' کے ذریعہ مجھ پر کرم فرما، اب سوال یہ ہے ''احضار مسائل'' سے مراد کیا ہے؟

احضارِ مسائل

ظاہراً احضار مسائل یعنی مسائل کو حاضر کرنا، مُہیّا کرنا اور آمادہ کرنا ہے اور اس کی شرح یوں ہے کہ ہر انسان اپنے کئے ہوئے ہر عمل کا ذمہ دار ہے اور قیامت کے دن اُس سے اس کے ہر عمل سے متعلق سوال کیا جائے گا، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

﴿وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللهُ﴾[1]

''تم اپنے دل کی باتوں کو ظاہر کرو یا چھپاؤ وہ سب کا محاسبہ کرے گا''

اور اسی طرح ہر آدمی قیامت کے دن اپنے عمل کے نتیجہ کو مجسّم دیکھے گا چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

---

[1] سورۂ بقرہ، ۲۸۴.

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ﴾[۱]

''پس جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اُسے دیکھے گا اور جس نے ذرّہ برابر بھی برائی کی ہو گی وہ اُسے بھی دیکھ لے گا''

مذکورہ آیاتِ کریمہ کی روشنی میں ''احضار المسائل'' سے مراد موت سے پہلے کی آمادگی ہے یعنی بندہ، خدا کی بارگاہ میں دعا گو ہے خدایا جو سوالات مرنے کے بعد کئے جانے والے ہیں اُن سب کو میرے لئے مہیّا کر دے تاکہ میں خود کو جواب دینے کے لئے آمادہ کر لوں اور یہ آمادگی اللہ کے لطف و کرم کے بغیر ناممکن ہے۔

تیسرا فقرہ: "وَقَرِّبْ فِيهِ وَسِيلَتِى إِلَيْكَ مِنْ بَيْنِ الْوَسَائِلِ"

خداوند کریم کی بارگاہ میں بندۂ مومن کی دعا یہ ہے: ''خدایا! تمام وسائل میں سے اُس وسیلہ کو میرے لئے مہیّا کر دے جو تیری بارگاہ سے قریب کرے''۔ اب سوال یہ ہے وہ کونسی چیز ہے جو خدا کی قربت کا وسیلہ بنے؟

وسیلہ کیا ہے؟

قرآن کریم میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ﴾[۲]

۱۔ سورۂ زلزلہ، آیت ۷ و ۸۔

۲۔ سورۂ مائدہ، آیت ۳۵۔

"اے ایمان لانے والو اللہ سے ڈرو اور اس تک پہونچنے کے لئے وسیلہ تلاش کرو"

وسیلہ یعنی ایسی چیز جو کسی مقصود کے حصول یا اس کے قرب کا ذریعہ بنے۔

وسیلہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر اچھا کام اور ہر اچھی صفت شامل ہے کیونکہ یہ سب چیزیں قرب پروردگار کی موجب ہیں، نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۱۰ میں اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کے انتہائی معنی خیز جملے ہیں:

"إِنَّ أَفْضَلَ مَا تَوَسَّلَ بِهِ الْمُتَوَسِّلُونَ إِلَى اللَّهِ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى الْإِيمَانُ بِهِ وَ بِ رَسُولِهِ وَ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِهِ فَإِنَّهُ ذِرْوَةُ الْإِسْلَامِ وَ كَلِمَةُ الْإِخْلَاصِ فَإِنَّهَا الْفِطْرَةُ وَ إِقَامُ الصَّلَاةِ فَإِنَّهَا الْمِلَّةُ وَ إِيتَاءُ الزَّكَاةِ فَإِنَّهَا فَرِيضَةٌ وَاجِبَةٌ وَ صَوْمُ شَهْرِ رَمَضَانَ فَإِنَّهُ جُنَّةٌ مِنَ الْعِقَابِ وَ حَجُّ الْبَيْتِ وَ اعْتِمَارُهُ فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَ يَرْحَضَانِ الذَّنْبَ وَ صِلَةُ الرَّحِمِ فَإِنَّهَا مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ وَ مَنْسَأَةٌ فِي الْأَجَلِ وَ صَدَقَةُ السِّرِّ فَإِنَّهَا تُكَفِّرُ الْخَطِيئَةَ وَ صَدَقَةُ الْعَلَانِيَةِ فَإِنَّهَا تَدْفَعُ مِيتَةَ السُّوءِ وَ صَنَائِعُ الْمَعْرُوفِ فَإِنَّهَا تَقِي مَصَارِعَ الْهَوَانِ أَفِيضُوا فِي ذِكْرِ اللَّهِ فَإِنَّهُ أَحْسَنُ الذِّكْرِ وَ ارْغَبُوا فِيمَا وَعَدَ الْمُتَّقِينَ فَإِنَّ وَعْدَهُ أَصْدَقُ الْوَعْدِ وَ اقْتَدُوا بِهَدْيِ نَبِيِّكُمْ فَإِنَّهُ أَفْضَلُ الْهَدْيِ وَ اسْتَنُّوا بِسُنَّتِهِ فَإِنَّهَا أَهْدَى السُّنَنِ"[۱]

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۰۔

"اللہ کی طرف وسیلہ ڈھونڈنے والوں کے لئے بہترین وسیلہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا ہے اور اس کی راہ میں جہاد کرنا کہ وہ اسلام کی سربلند چوٹی ہے اور کلمۂ توحید، وہ فطرت (کی آواز) ہے اور اِقامہ نماز عینِ دین ہے اور زکات ادا کرنا فرض و واجب ہے اور ماہِ رمضان کے روزے عذاب کے سپر ہیں اور خانۂ کعبہ کا حج و عمرہ یہ دونوں ہی فقر کو دور کرتے اور گناہوں کو دھودیتے ہیں اور صلۂ رحم مال کو فراوانی اور عمر کی درازی کا سبب ہے اور مخفی طور پر خیرات کرنا گناہوں کا کفّارہ ہے اور آشکارا خیرات کرنا ناگہانی موت سے بچاتا ہے اور لوگوں سے نیک سلوک ذلت ورسوائی سے بچاتا ہے اللہ کے ذکر میں بڑھے چلو اس لئے کہ وہ بہترین ذکر ہے اور اس چیز کے خواہش مند بنو جس کا اللہ نے پرہیزگاروں سے وعدہ کیا ہے اس لئے کہ اس کا وعدہ سب سے زیادہ سچا ہے تم اپنے نبی کی سیرت کی پیروی کرو کہ وہ بہترین سیرت ہے اور اُن کی سنّت پر چلو کہ وہ تمام سیرتوں سے بڑھ کر ہدایت کرنے والی ہے"۔

وسیلہ کے مصداق

اگر وسیلہ ہر اس چیز کا نام ہے جو بندۂ مومن کو خدا سے نزدیک کرتا ہے تو بندۂ مومن کو اس چیز کی تلاش کرنی چاہئے جو چیز خدا کی قربت کا ذریعہ ہے بطور مثال یہاں پر دو چند کا ذکر کیا جارہا ہے۔

۱۔ اطاعت خدا اور رسول

نہج البلاغہ کے مذکورہ خطبہ سے واضح ہے کہ خدا تک پہونچنے کا بہترین وسیلہ خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانا ہے۔

۲۔ قرآن کریم

امام سجاد علیہ السلام صحیفۂ سجادیہ کی بائیسویں دعا میں خدا کی بارگاہ میں ان الفاظ کے ذریعہ دست بدعا ہیں:

"وَ اجْعَلِ الْقُرْآنَ وَسِيلَةً لَنَا إِلَى أَشْرَفِ مَنَازِلِ الْكَرَامَةِ"

"خدایا! شریف ترین منزلِ کرامت تک پہونچنے کے لئے ہمارے لئے قرآن کو وسیلہ قرار دے"

شریف ترین منزل کرامت "قرب الٰہی" کے علاوہ کوئی اور شیٔ نہیں ہو سکتی اور اُس منزل تک پہونچنے کے لئے قرآن وسیلہ ہے۔

۳۔ اہلبیت علیہم السلام

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"الْأَئِمَّةُ مِنْ وُلْدِ الْحُسَيْنِ عليه السلام مَنْ أَطَاعَهُمْ فَقَدْ أَطاعَ اللَّهَ وَ مَنْ عَصَاهُمْ فَقَدْ عَصَى اللَّهَ عَزَّ وَ جَلَّ هُمُ الْعُرْوَةُ الْوُثْقَى وَ هُمُ الْوَسِيلَةُ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ"[1]

[1] عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج۲، ص۵۸.

”ائمہ (معصومین علیہم السلام) جو (امام) حسین علیہ السلام کی ذریّت سے ہیں جس نے ان کی اطاعت کی گویا اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے ان کی نافرمانی کی گویا اس نے خدا کی نافرمانی کی، یہ ہستیاں مضبوط رسی ہیں اور یہ حضرات خدا تک رسائی کا وسیلہ ہیں“

اہل بیت علیہم السلام کے وسیلہ کے بغیر خدا تک رسائی ناممکن ہے، لہٰذا خدا تک پہونچنے کے لئے یہی ذواتِ مقدسہ بہترین وسیلہ ہیں ان ہی کی اطاعت کے ذریعہ انسان خدا تک پہونچ سکتا ہے۔ مالک سے دعا ہے خدایا ہمیں دامانِ اہلبیت علیہم السلام سے ہمیشہ وابستہ رکھ۔

انتیسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ غَشِّنی فِیهِ بالرَّحْمَةِ، وَارْزُقْنی فِیهِ التَّوْفِیقَ وَالْعِصْمَةَ، وَطَهِّرْ قَلْبی مِنْ غَیاهِبِ التُّهَمَةِ، یَا رَحِیماً بِعِبادِهِ الْمُؤْمِنینَ».

"خدایا! اس دن میں مجھے (اپنی) رحمت سے ڈھانپ دے اور مجھے توفیق اور حفاظت کرنے کا راستہ دکھا اور میرے دل کو شکوک اور تہمت کی تاریکیوں سے پاک کردے اے مومن بندوں پر رحم کرنے والے"

اہم مطالب:

مذکورہ دعا میں تین اہم چیزوں کی التجا ہے:

۱۔ رحمتِ خدا میں غرق ہونے کی تمنا۔

۲۔ عصمت اور توفیق کی درخواست۔

۳۔ تہمت کی تاریکیوں سے دل پاک کرنے کی دعا۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰهُمَّ غَشِّنی فِیهِ بِالرَّحْمَةِ"

ماہ مبارک رمضان، برکت و رحمت سے لبریز مہینہ ہے، اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ دیگر مہینے رحمتِ الٰہی سے خالی ہیں، بلکہ ماہِ رحمت سے مراد یہ ہے کہ ماہِ رمضان میں رحمتِ حق کی وسعت دیگر مہینوں کی نسبت بہت زیادہ ہے اس لئے ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ رحمت کے حقدار بنیں اور دعاؤں میں خدا سے بکثرت طلبِ رحمت کریں، اسی لئے بندۂ مومن آج کی دعا میں اپنے رب سے درخواست کرتا ہے کہ خدایا اس دن میں اور اس ماہ میں مجھ پر اپنی رحمت کا سایہ کر اور اپنی رحمت سے میرے تمام وجود کو ڈھانپ دے، اگر خداوند کریم خدانخواستہ کسی بندہ پر اپنی رحمت کے دروازوں کو بند کردے تو دنیا کی کوئی طاقت اُس بندۂ مومن کو رحمت عطا نہیں کر سکتی۔

﴿مَا يَفْتَحْ اللهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَة فَلاَ مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلاَ مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾[1]

"انسانوں کے لئے اللہ جو رحمت کا دروازہ کھول دے اسے کوئی بند کرنے والا نہیں ہے اور جس کو وہ بند کردے اُسے اللہ کے سوا کوئی کھولنے والا نہیں وہ بڑا غالب آنے والا حکمت والا ہے"

خدا کے نمایاں ترین صفات میں سے ایک صفت، رحمت ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی مختلف آیات میں مشتقات کے ساتھ آیا ہے کہ کہیں رحیم تو کہیں ذوالرحمة

---

[1] سورہ فاطر، آیت ۲.

تو کہیں رحمٰن، حد یہ ہے "بسملہ" (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) میں خداوند رحیم و کریم نے خود کو دوبار اسی صفت سے تعارف کروایا ہے "الرحمٰن الرحیم" اللہ کی یہ دونوں صفت مادۂ رحمت سے مشتق ہے رحمٰن میں اللہ کی عمومی رحمت کی جانب اشارہ ہے یعنی اس کی رحمت دنیا میں ہر کسی کے لئے عام ہے چاہے مومن ہو یا کافر، مشرک ہو یا مسلمان، سب کے لئے دنیا میں اس کی رحمت عام ہے۔ زمین، آسمان، پانی، اکسیجن، سورج، چاند وغیرہ یہ سب دنیا میں ہر ایک کے لئے ہے، لیکن "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" میں صفتِ رحیم سے مراد خدا کی خصوصی رحمت ہے جو آخرت میں صرف اور صرف مومنین سے مخصوص ہے جیسے جنت، کوثر، سلسبیل، تسنیم، حور و غلمان و...۔

اللہ کی رحمت وسیع و عریض ہے لہٰذا رحمتِ حق سے مایوسی کُفر ہے۔ بندۂ مومن کو کبھی بھی اپنی گناہوں کی بناپر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے دعائے جوشن کبیر میں آیا ہے: "یَا مَنْ سَبَقَتْ رَحْمَتُهُ غَضَبَهُ؛اے وہ ذات جس کی رحمت، اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے"۔ بس اُن اسباب اور اُن راہوں کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے جن سے رحمتِ الٰہی کا نزول ہوتا ہے اور اُن شرائط کو مُہیّا کرنے کی ضرورت ہے جن کی بناپر بندہ، مشمول رحمتِ حق ہو سکتا ہے مثال کے طور پر ہم یہاں پر چند شرطوں کا ذکر کرتے ہیں:

حصول رحمت کے شرائط:

۱۔ایمان و عمل صالح

یقینی طور پر اگر کوئی چاہتا ہے کہ اللہ کی خصوصی رحمت اس کے شاملِ حال ہو تو اُسے ایمان کے ساتھ ساتھ اعمالِ صالحہ بجالانا چاہیے، چنانچہ خداوند کریم قرآن حکیم میں اعلان کر رہا ہے:

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ﴾[۱]

"پھر جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے انھیں پروردگار اپنی رحمت میں داخل کر لے گا"

۲۔ اطاعتِ خدا و اتباعِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وہی شخص خدا کی رحمتِ خاص کا مستحق ہو گا جو اطاعتِ خدا و اتباعِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اعمال کو بجالائے گا، قرآن کریم میں ارشاد ہو رہا ہے:

﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾[۲]

"اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"

۳۔ مولائے کائنات حضرت امام علی علیہ السلام سے محبت و مودّت

محبت اہل بیت علیہم السلام بالخصوص محبتِ امیر المومنین علیہ السلام نزول رحمت کا باعث ہے چنانچہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

۱۔ سورۂ جاثیہ، آیت ۳۰.

۲۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۲.

"أَلَا وَ مَنْ أَحبَ عَلِيّاً أَثْبَتَ اللَّهُ الْحِكْمَةَ فِي قَلْبِهِ وَ أَجْرَى عَلَى لِسَانِهِ الصَّوَابَ وَ فَتحَ اللَّهُ عَلَيْهِ أَبْوَابَ الرَّحْمَةِ"[1]

"آگاہ ہو جاؤ جو بھی علیؑ سے محبت کرے گا خدا اس کے دل میں حکمت قرار دے گا اور اس کے لئے رحمت کے دروازوں کو کھول دے گا"

۴۔ ترک گناہ، توبہ و استغفار

﴿قَالَ يَا قَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُونَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ لَوْلاَ تَسْتَغْفِرُونَ اللهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾[2]

"(صالح پیغمبر نے) کہا اے میری قوم والو آخر بھلائی سے پہلے برائی کی جلدی کیوں کر رہے ہو تم لوگ اللہ سے استغفار کیوں نہیں کرتے تاکہ تم پر رحم کیا جائے"

الٰہی رحمت اپنی طرف مبذول کرنے کی راہوں میں سے ایک راہ، ترکِ گناہ ہے۔ خداوند کریم مذکورہ آیۂ کریمہ میں حضرت صالح کے قول کو نقل کر رہا ہے کہ وہ نبیؑ خدا ہونے کے اعتبار سے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرما رہے ہیں تم لوگ نیکی سے پہلے برائی کی جانب کیوں عُجلت کر رہے ہو اللہ سے استغفار کی صورت میں امید ہے کہ تم سب رحم کے قابل بن جاؤگے۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۶۵، ص ۱۲۵۔
[2] سورۂ نمل، آیت ۴۶۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ترکِ گناہ کے بعد توبہ و استغفار سے بندہ، رحمتِ خدا کا مستحق بن سکتا ہے۔

۵۔ اقامۂ نماز اور زکات کی ادائیگی

نماز خالق و مخلوق کے درمیان بہترین وسیلہ ہے اور اسی طرح زکات کی ادائیگی نماز کے بعد قربِ پروردگار کا بہترین وسیلہ ہے چنانچہ قرآن کریم میں اکثر مقامات پر جہاں جہاں بھی اقامۂ نماز کا ذکر ہوا وہاں زکات کا بھی تذکرہ آیا ہے چنانچہ ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلاَةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾[1]

"اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"

ان کے علاوہ، صبر، عدل و انصاف، عفو و بخشش، صلۂ رحم، برادرانِ ایمان کے درمیان صلح و صفائی وغیرہ ان تمام موارد کے لئے آیات اور احادیث میں ہیں کہ یہ سب نزولِ رحمت کے اسباب ہیں لہٰذا خالقِ کائنات سے دست بدعا ہوں خدایا ہمارے لئے رحمت کے راستوں کو کھول دے۔

---

[1] سورۂ نور، آیت ۵۷.

دوسرا فقرہ: "وَارْزُقْنِی فِیهِ التَّوْفِیقَ وَالْعِصْمَةَ"

رحمتِ خدا کیا ہے؟ اور کونسی چیز باعث نزولِ رحمت ہے؟ بس اتنا جان لینا کافی نہیں ہے، بلکہ خدا کی رحمت شاملِ حال ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اُن چیزوں کو حاصل کرنے کی کوشش کریں جو باعثِ نزول رحمت ہیں، بس اسی بناپر طلبِ توفیق کی ضرورت ہے؛ کیونکہ جب تک اللہ کی توفیق نہ ہو اس وقت تنہا کوشش بے فائدہ ہے۔

توفیق سے مراد کیا ہے؟

بائیسویں اور چوبیسویں تاریخ کی دعاؤں کی شرح میں ''توفیق کیا ہے؟'' کے عنوان کے ذیل میں کسی حد تک گفتگو ہوچکی ہے، توفیق یعنی بندہ، اللہ کی اطاعت کرنے اور اس کی معصیت سے بچنے کے لئے کوشش کرے اور اللہ اس کی کوشش کو کامیاب کرے، جب تک خدا مدد نہیں کرے گا اس وقت بندہ کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی اور اللہ کی اس امداد کا نام ہی توفیق ہے اسی لئے حضرت امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: توفیق رحمتِ خدا، نعمت خدا اور عنایتِ خدا ہے۔

توفیق الٰہی کی کرشمہ سازی، استاد محسن قرائتی کی زبانی

استاد محترم حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی (حفظہ اللہ الشریف) توفیق الٰہی سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کی کوشش کے ساتھ ساتھ اللہ کی توفیق نہ ہو تو ہونی اَنہونی سے بدل جاتی ہے اور اگر توفیق الٰہی ہو تو اَنہونی، ہونی سے بدل جاتی ہے۔ ان دونوں سے متعلق دو الگ الگ واقعات کو یوں بیان کرتے ہیں:

ایک شخص حج کرنے کے لئے ایران سے جدہ ایئر پورٹ تک میرے ساتھ تھا پھر جدہ سے مکہ تک میرے ساتھ ہی قافلہ میں رہا پھر مکہ پہونچنے کے بعد وہ ذہنی طور پر بیمار پڑ گیا پھر اس کو وہیں سے ایران واپس لوٹا دیا گیا، حالانکہ اس شخص نے مناسکِ حج کی ادائیگی کے لئے مکمل کوشش کی تھی اور اس میں کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی تھی اور مکہ تک بھی گیا مگر اُسے حج بجالانے کی توفیق نہ ہو سکی۔ انسان کی لاکھ کوششوں کے باوجود خدا کی جانب سے توفیق کا ہونا ضروری ہے۔

ذکر شدہ واقعہ کے برخلاف، ایک شخص حج کے ارادے سے اپنے پاسپورٹ کے ہمراہ تمام ضروری کاغذوں کو حج کمیٹی کے دفتر میں جمع کرتا ہے (حج پر جانے والوں کے لئے ایران میں بہت سے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے) پھر حج کمیٹی کی جانب سے جواب کا منتظر بیٹھا رہا، آخری وقت جب اپنے موقف کی وضاحت جاننے کے لئے حج ہاؤس جا کر حج کمیٹی کے منیجر سے سوال کیا تو منیجر نے اس کے فائیل کو بغور پڑھ کر کسی کاغذ کے نہ ہونے کی بنا پر فائل کو ناقص قرار دیتے ہوئے فائل میں ''موافقت نمی شود'' یعنی (ان کے سفر حج کے لئے) موافقت نہیں کی جائے گی لکھ کر اسی کے نیچے دستخط کردی مگر جب خود حج کمیٹی کا منیجر حج کے لئے مکہ پہنچا تو مکہ میں اس شخص کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا جس شخص کے فائل پر اُس نے ''موافقت نمی شود'' لکھ کر رد کر دیا تھا اُسے قریب بُلا کر پوچھا بھائی میں نے آپ کی فائل کو ناقص ہونے کی بنا پر رد کر دیا تھا تو تم پھر کس طرح حج کرنے آگئے؟ اس شخص نے مینیجر سے بڑے اطمینان سے کہا نہیں حضور آپ نے ''موافقت می شود'' لکھا تھا یعنی آپ نے ہی میرے سفر کے لئے موافقت کی ہے، مینجیر پریشان ہو گیا اُس کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے موافقت نہیں کی تھی، حج کے

بعد ایران لوٹا تو آفس پہونچ کر دوبارہ اپنے روم میں اس کے فائل کو طلب کیا اور اب جو دیکھا تو اُس پر ''موافقت می شود'' لکھا ہوا ہے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اس نے ''موافقت نمی شود'' لکھ کر دستخط کی لکیر کھینچی تو ''نمی شود'' کے نون پر آ گئی ہے جس سے ''نمی شود'' ''می شود'' پڑھا جا رہا تھا۔ اِسے کہتے ہیں توفیق الٰہی یعنی اس کی فائل ناقص ہونے کے باوجود خدا کی مدد سے وہ حج جیسی عظیم عبادت سے مشرف ہو گیا، لہٰذا ہمیشہ اللہ سے توفیق کی دعا مانگتا رہے اگر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دے گا تو ہم ذلّت کی کھائی میں جا گریں گے۔

توفیقِ عصمت

عصمت، خداوند کریم کی توفیقات میں سے ایک ایسی توفیق ہے جو اللہ کی جانب سے اس کے برگزیدہ بندوں کو نصیب ہوتی ہے اور آج کی دعا میں بندہ اپنے رب کی بارگاہ میں توفیق اور عصمت کا درخواست کر رہا ہے دعا کے اس فقرہ میں عصمت سے مراد گناہ اور معصیت سے بچنے کی درخواست ہے "اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی التَّوْفِیقَ وَالْعِصْمَةَ" یہاں توفیق سے مراد توفیق اطاعت ہے اور عصمت سے مراد بُعد معصیت ہے چنانچہ اسی مبارک مہینہ کی دعا میں آیا ہے: "اَللَّھُمَّ ارْزُقْنَا تَوْفِیقَ الطَّاعَةِ وَبُعْدَ الْمَعْصِیَةِ"

عصمت صرف چودہ معصومین علیہم السلام سے مخصوص نہیں ہے گرچہ ہمیں بچپنے سے یہ بتایا گیا کہ معصوم چودہ ہیں، بات دراصل یہ ہے کہ عصمت کے مختلف درجات ہیں اور عصمت کے سب سے اعلیٰ ترین مرتبہ پر چودہ معصومین علیہم السلام فائز ہیں اور یہ ہستیاں نبوت و امامت جیسی الٰہی منصبوں پر فائز تھیں جن کا تقاضہ عصمت ہے یعنی عصمت

کے بغیر کسی کو نبوت اور امامت جیسا عظیم الٰہی منصب نہیں مل سکتا اور ان ذواتِ مقدسہ کا سب سے اعلیٰ ترین مرتبۂ عصمت پر فائز ہونے کی بناپر ان کی عصمت کو ”عصمت کبریٰ“ کہا جاتا ہے۔ اس مرتبۂ عصمت پر ان چودہ معصومین علیہم السلام کے علاوہ کوئی اور فائز نہیں ہوسکتا؛ کیونکہ یہ طیب و طاہر ہستیاں قدرت کے ارادۂ تکوین کے تحت ہر رجس و کثافت سے دور ہیں حتی ایک کم ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی عصمت بھی ان کے مرتبۂ عصمت کے ہم پلہ نہیں ہے اسی لئے امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا: ”لَا يُقَاسُ أَحَدٌ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ؛ کسی ایک کو بھی ہم اہلبیت علیہم السلام سے قیاس نہ کرنا“ چہ نسبت خاک را از عالم پاک۔ مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ کوئی ایک بھی مرتبۂ عصمت یعنی عصمت صغریٰ کو پا نہیں سکتا، بلکہ علامہ میرزا محمد علی اردوبادی (اعلی اللہ مقامہ) اور صاحب کتاب ”العباس و مقتل المقرم“ علامہ عبدالرزاق المقرم اور دیگر علماء کی طرح ناچیز بھی اس رائے سے متفق ہے کہ حضرت ابوالفضل العباسؑ، حضرت علی اکبرؑ، حضرت زینب کبریٰؑ علیا مقام جیسی شخصیتیں مرتبۂ عصمت پر فائز تھیں اگرچہ یہ ہستیاں کسی ایسے منصب الٰہی پر فائز نہیں تھیں جس کا تقاضہ عصمت ہو؛ کیونکہ عصمت صغریٰ (عصمت بمعنای عام) ایک مقام کَسبِی ہے یا یوں کہا جائے تو بہتر ہے مقام تقویٰ کا پہلا زینہ ترکِ محرمات اور انجام واجبات ہے اور مقام تقویٰ کا آخری زینہ، مقام عصمت ہے۔ ہمارے بعض بزرگ علماء جیسے سید علم الہدیٰ، سید رضی، سید مرتضٰی اور سید رضی الدین (نوّر اللہ مرقدھم) کے لئے حوزۂ علمیہ کے بعض اساتذہ کا کہنا ہے کہ یہ شخصیتیں مقام عصمت پر فائز تھیں۔

بہر کیف عصمتِ عمومی ایک مقامِ کسبی ہے جسے تقویٰ و ورع سے انسان توفیقِ الٰہی کے سہارے حاصل کر سکتا ہے جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے عصمت یعنی خود کو ہر و نقص اور ہر گناہ و معصیت سے محفوظ رکھنا ہے جو توفیق اور امدادِ الٰہی کے بغیر ناممکن ہے۔خداوند کریم سورۂ یوسف میں خود حضرت یوسفؑ کی زبانی بیان کر رہا ہے:

﴿وَمَا أُبَرِّءُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلاَّ مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾[1]

''اور میں اپنے نفس کو بھی بَری نہیں قرار دیتا کہ نفس (انسانی) بہرحال برائی کا حکم دیتا ہے مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے کہ وہ بڑا بخشنے والا ہے''

یا پھر اسی سورہ کی آیت نمبر ۲۴ میں فرتا ہے:

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلاَ أَنْ رَأَي بُرْهَانَ رَبِّهِ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ﴾[2]

''اور یقیناً اُس عورت (زلیخا) نے اُن (یوسف) سے بُرائی کا ارادہ کیا اور یوسف بھی ارادہ کر بیٹھتے اگر اپنے رب کی بُرہان نہ دیکھ لیتے یہ تو ہم نے اس طرح کا انتظام کیا کہ اُن سے بُرائی اور بدکاری کا رُخ موڑ دیا کیونکہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے''

۱۔ سورۂ یوسف، آیت ۵۳.

۲۔ سورۂ یوسف، آیت ۲۴.

حضرت یوسف علیہ السلام، زلیخا کے بنے ہوئے مکاری کے جال میں گرفتار و بے بس ہو جاتے وہ تو کہیے کہ انہوں نے "بُرہانِ رب" دیکھ لیا۔ یہاں برہان سے مراد وہی عصمت ہے جو توفیق الٰہی ہے۔

لہٰذا ہمیں یہی دعا کرنا چاہئے کہ خدایا ہمیں اطاعت کرنے اور گناہ و معصیت سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔

تیسرا فقرہ: "وَطَهِّرْ قَلْبِی مِنْ غَیَاهِبِ التُّهَمَةِ"

"غیاهب" غیهب کی جمع ہے جس کے معنیٰ ظلمت و تاریکی کے ہیں، تہمت یعنی کسی کی طرف ناروا اور جھوٹی نسبت دینا ہے اگر یہ جھوٹی نسبت روزہ کی حالت میں خدا و رسول کی طرف دی جائے تو روزہ باطل ہو جاتا ہے۔

دعا کے اس فقرہ میں بندہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں درخواست کرتا ہے کہ خدایا تو میرے دل کو تہمت کی تاریکیوں سے پاک فرما۔

غیبت اور تہمت، امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث کی روشنی میں

ابو بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جب جناب ابوذر غفّاری نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غیبت سے متعلق سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا: اے ابوذر! غیبت، اپنے دینی برادر کو اُس چیز سے یاد کرنا ہے جسے وہ پسند نہیں کرتا، پھر ابوذر نے سوال کیا: یارسول اللہ! جو کچھ اُس برادرِ دینی کے بارے میں کہا جارہا ہے اگر حقیقت میں اس کے اندر موجود ہو تو؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

فرمایا اگر ایسا ہے تو وہ غیبت ہے اگر حقیقت میں وہ برائی برادرِ دینی کے اندر نہیں ہے پھر بھی اُس برائی کی نسبت اُن کی طرف دی جارہی ہے تو وہ تہمت ہے۔[1]

اس حدیث سے تہمت اور غیبت کا فرق بھی واضح ہے۔

ایک اور حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب مومن بندہ، اپنے برادرِ ایمانی پر کوئی تہمت لگاتا ہے تو اُس کے دل سے اُسی وقت نورِ ایمان رُخصت ہو جاتا ہے۔[2]

ظاہر سی بات ہے کہ جب دل سے نور ختم ہو جائے تو تاریکیاں اُس کی جگہ ڈیرا ڈال دیتی ہیں اسی لئے بندہ، خداوند کریم کی بارگاہ میں دستِ بدعا ہے کہ خدایا! میرے دل کو تہمت کی تاریکیوں سے پاک کردے اور ایمان کے نور سے روشن و منور فرما۔

---

[1]۔ شہر رمضان، زمزمہ روزہ داران، ج ۲، ص ۸۶۲.

[2]۔ میزان الحکمۃ، ج ۱، ۵۳۸.

تیسویں تاریخ کی دعا

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صِيامِي فِيهِ بِالشُّكْرِ وَالْقَبُولِ عَلَى مَا تَرْضَاهُ وَيَرْضَاهُ الرَّسُولُ، مُحْكَمَةً فُرُوعُهُ بِالأُصُولِ، بِحَقِّ سَيِّدِنا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعالَمِينَ».

''خدایا! اس دن میرے روزوں کو جزائے خیر اور سندِ قبولیت کے ساتھ اپنے اور اپنے رسول کی پسند کے مطابق قرار دے اور اس کے فروع کو اصول کے ساتھ مستحکم فرما، ہمارے سید و سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہلبیت طاہرین علیہم السلام کے واسطے سے''

اہم مطالب:

آج کے دن کی دعا میں بندہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں دو اہم چیزوں کا درخواست کرتا ہے:

۱۔ اے خدا! روزوں کو اُن کی جزا اور مقبولیت کے ہمراہ اپنے اور اپنے رسول کے مورد پسند قرار دے۔

۲۔ اس کے فروع کو اصول کے ساتھ مستحکم فرما۔

پہلا فقرہ: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ صِیامِی فِیهِ بِالشُّکْرِ وَالْقَبُولِ عَلَی مَا تَرْضَاهُ وَیَرْضَاهُ الرَّسُولُ"

اگر انتیس کی شب رؤیت ہلال کا اعلان نہ ہو تو یہ ماہ مبارک رمضان کا آخری دن ہےاور اس کے ساتھ ماہِ رحمت و برکت کا اختتام ہے، حضرت امام سجاد علیہ السلام اس ماہ مبارک کو وداع کرتے ہوئے زار وقطار روتے تھے، ہمیں بھی چاہئے کہ ان آخری لمحات میں جس حد تک ممکن ہو اس دستر خوانِ رحمت سے جو کچھ گھنٹوں بعد سمٹ جانے والا ہے، نعمتوں کو بٹور لیں اور اپنی خطاؤں پر نادم، توبہ و استغفار کے ساتھ چشمِ پُرنم سے یہ ماہِ برکت کو الوداع کہیں، بندہ سلسلۂ صیام کے اختتام پر اپنے روزوں سے متعلق جزائے خیر اور سند قبولیت کے ساتھ ساتھ اپنے عمل سے خدا و رسول کی رضایت کا بھی درخواست کرتا ہے، دعا کے اس جملہ میں شکر، قبولیت اور خدا و رسول کی رضایت کا ذکر ہے۔ چھبیسویں تاریخ کی دعا کی شرح میں اس بات کی وضاحت ہو چکی ہے کہ اگر بندہ اپنے معبود کا شکریہ ادا کرے تو اس کے معنی کچھ اور ہیں اور اگر معبود بندہ کا شکریہ ادا کرے تو اس کے معنیٰ کچھ اور ہوگا یعنی خدا کا شاکر ہونا بندہ کے شاکر ہونے کی طرح نہیں ہے، بندہ کا شاکر ہونے سے مراد نعمت کے مقابل نعمت دینے والے کی زبان اور عمل سے قدردانی کا اظہار کرنا اور نعمت کا صحیح استعمال کرنا ہے مگر اللہ کے شاکر ہونے سے مراد بندوں کے اعمالِ صالحہ کی قدردانی کرتے ہوئے اور انھیں ضائع نہ کرتے ہوئے مطابقِ عمل جزائے خیر عطا کرنا ہے۔ آج کی دعا میں بندہ خدا سے

درخواستِ شکر کر رہا ہے اے میرے مالک تو میرے عمل کو ضائع ہونے سے بچالے اور اس عمل کے بدلے ہمیں جزائے خیر سے نواز دے۔

درخواستِ شکر کے بعد خدا سے قبولیت کی درخواست ہے دراصل ممکن ہے پروردگار عالم کسی کو اس کے عمل کی اسی دنیا میں جزا دے دے جس طرح ریاضتِ نفس کرنے والے غیر مسلم مرتاضوں کو خدا اُن کی محنت اور نفس کو قابو میں رکھنے کے عوض کچھ روحانی طاقتیں عطا کر دیتا ہے، زمانۂ امام جعفر صادق علیہ السلام کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص غیر مسلم تھا مگر لوگوں کو غیب کی چیزوں سے آگاہ کرتا تھا اور کچھ کمزور ایمان رکھنے والے لوگ اس کی کرشمہ سازی سے متأثر ہو رہے تھے اور جب بات امام تک پہونچی تو آپ نے ایک ہاتھ میں خاک شفا رکھ کر اس سے سوال کیا بتا میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو اس نے کہا آقا میں بتا سکتا ہوں مگر مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ یہ چیز آپ کے پاس کیسے آئی؟ جب امام نے اس سے اصرار کیا تو اس نے کہا آقا یہ جنّت کی خاک ہے، مولا نے فرمایا: تو نے سچ کہا یہ خاکِ کربلا، خاک شفا اور خاکِ جنّت ہے؛ کیونکہ کربلا "روضة من رياض الجنة" ہے "کربلا جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے"، پھر امام عالی مقام نے کربلا اور شہادت امام حسین علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے اسلام کے بارے میں عقلی دلیلوں کو پیش کیا تو وہ مسلمان ہو گیا۔ مگر جیسے ہی وہ مسلمان ہوا اس نے محسوس کیا کہ اس کی وہ روحانی طاقت جس کے ذریعہ وہ غیب کی باتیں بتایا کرتا تھا ختم ہو چکی تھی، اس نے حیرت زدہ ہو کر امامؑ سے اس کی وجہ دریافت کی تو آپؑ نے فرمایا: اب اس کی اجرت یعنی نفسانی خواہشات پر کنٹرول کرنے جیسے نیک عمل کی اُجرت خدا نے آخرت کے لئے محفوظ کر دیا۔

مذکورہ واقعہ سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ کبھی یہ ممکن ہے کہ خدا کسی عمل کی جزا اسی دنیا میں دے دے اگرچہ اس عمل کو قبول نہ کیا ہو مگر بندہ اپنے رب سے چاہتا ہے کہ پروردگار میں اپنے عمل کی صرف اجرت ہی نہیں، بلکہ تجھ سے قبولیت کی سند بھی چاہتا ہوں؛ کیونکہ جس عمل کو تیری قبولیت کی سند مل جائے وہ عمل بہترین عمل ہے۔

عمل کے قبول ہونے کی شرطیں:

کسی بھی عمل کی ارزش و قیمت اُسی وقت ہے جب وہ عمل قابلِ قبول ہوجائے ہماری نماز اسی وقت معراج بنے گی جب وہ قبول ہوجائے اور جب تک روزہ قبولِ درگاہِ حق نہ ہوجائے اس وقت تک اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، لہٰذا ہر عمل، قبول ہونے کی شرط کے ساتھ موثر ہے مگر شرطِ قبولیت سے پہلے اس عمل میں شرطِ صحت کا ہونا بھی ضروری ہے۔

۱۔ شرطِ صحت: یعنی عمل اور عبادت کے تمام اجزاء و شرائط کا بغیر کمی و زیادتی کے پایا جانا اور دستور کے مطابق اسے صحیح طریقہ سے انجام دینا ہے۔

۲۔ شرطِ قبولیت: یعنی عمل اور عبادت کو قبول کرنا اللہ کے اختیار میں ہے اور قبولیت کی ضمانت عبادت گذار کے ایمان، اخلاص، تقویٰ اور ولایت ائمہ کے اعتقاد سے وابستہ ہے لہٰذا بندہ پر ان شرائط کو فراہم کرنا ضروری ہے تاکہ عمل قبول ہوسکے۔

وہ روزہ جس سے خدا اور سول راضی ہوں

پہلی تاریخ کی دعا کی شرح میں یہ بات گذر چکی ہے کہ روزے کی تین قسمیں ہیں: روزۂ عام، روزۂ خاص اور روزۂ خاص الخاص۔ روزۂ عام وہ روزہ نہیں ہے جس سے خدا و رسول راضی ہوں؛ کیونکہ یہ حقیقی روزہ نہیں اس میں روزہ دار، نیتِ روزہ کے ساتھ صرف روزہ توڑنے والی چیزوں سے پرہیز کرتا ہے لیکن اعضا و جوراح کا روزہ نہیں رکھتا ہے آنکھ، کان، زبان.... سے گناہ کرنے سے باز نہیں رہتا ہے، ایسے ہی روزہ دار کے لئے مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جن کا روزہ سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ نہیں۔

مگر روزۂ خاص میں روزہ کے ظاہری شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے روزہ دار اعضاء و جوارح کا بھی روزہ رکھتا ہے یعنی آنکھ، کان، زبان وغیرہ سے اللہ کی معصیت و گناہ نہیں کرتا ہے اور روزہ خاص الخاص جس میں روزہ دار مذکورہ تمام شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے دل کا بھی روزہ رکھتا ہے یعنی قلب و دماغ کو صرف اور صرف خدا کے لئے خالص بنالیتا ہے بس اس خلاصہ کے بعد یہ بات واضح ہے کہ جس روزہ سے خدا اور سول راضی ہیں وہ روزۂ خاص اور روزۂ خاص الخاص ہے۔

دوسرا فقرہ: "مُحْكَمَةً فُرُوعُهُ بِالأُصُولِ"

بندہ آج کی دعا کے اس جملہ میں اپنے خالق سے التماس کر رہا ہے خدایا میرے روزے کے فروع کو اُس کے اصول کے ذریعہ مستحکم قرار دے۔ فروعِ روزہ سے مراد روزہ توڑنے والی چیزوں سے پرہیز حتّیٰ اعضاء و جوراح سے سرزد ہونے والی گناہوں

سے پرہیز بھی فروعِ روزہ سے ہیں۔ اصولِ روزہ یعنی روزہ کی اساسی اور بنیادی چیزیں یعنی وہ اسرار و رموز ہیں جو روزہ توڑنے والی چیزوں سے پرہیز میں پوشیدہ ہیں جن اسرار ورموز میں سے ایک تقویٰ بھی ہے چنانچہ قرآن مجید میں اعلان ہو رہا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَي الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾[1]

"صاحبانِ ایمان تمہارے اوپر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح تمہارے پہلے والوں پر فرض کئے گئے تھے شاید تم اسی طرح متقی بن جاؤ"

" كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ... لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ..." روزہ رکھنے کا ہدف و مقصد حصولِ تقویٰ ہے البتہ تقویٰ کے بھی درجات ہیں، تقویٰ کا پہلا زینہ محرمات سے پرہیز اور واجبات پر عمل کرنا ہے اور تقویٰ کا آخری درجہ، عصمت ہے پھر عصمت کے بھی مدارج ہیں جس کا آخری درجہ "عصمت کبریٰ" ہے جس پر صرف چہاردہ معصومین علیہم السلام فائز ہیں۔

فروعِ روزہ کو اس کے اصول کے ذریعہ مستحکم کرنے سے مراد روزہ کے ظاہری شرائط کا اس کے نہفتہ اسرار و رموز سے منسلک کرنا ہے یعنی روزہ دار کے روزہ کو اس روزہ کا مصداق قرار دینا ہے جسے "روزہ خاص" اور "روزۂ خاص الخاص" کہا جاتا ہے جس کی جزا سے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: خداوند کریم حدیث قدسی میں ارشاد

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۳.

فرماتا ہے: "الصَّوْمُ لِي وَ أَنَا أَجْزِي بِهِ"[۱] "روزہ میرے لئے اوراس کی جزامیں خود عطا کروں گا"۔

اسی طرح جب روزہ کے فروع اس کے اصول کے ساتھ مستحکم ہو جائیں تو پھر وہ روزہ آتشِ جہنم کے لئے سپر بن جاتا ہے۔

خدایا تجھے محمد وآل محمد علیہم السلام کا واسطہ ہمارے روزوں کو ایسے روزوں کا مصداق قرار دے۔

محمد وآل محمد علیہم السلام کا حق کیا ہے؟

ہم لوگ روز مرّہ اپنی دعاؤں میں اکثر و بیشتر محمد وآل محمد علیہم السلام کے حق کا واسطہ دے کر حاجات طلب کرتے ہیں کیا ہم نے کبھی یہ سوچنے کی بھی زحمت کی ہے کہ ہماری گردنوں پر اہل بیت علیہم السلام کا کیا حق ہے؟

اگر ہم شیعیانِ اہل بیت علیہم السلام ہیں تو ہم پر لازم ہے کہ ہم اہلبیت علیہم السلام کے حقوق کو ادا کریں مگر یہ امر اس وقت ممکن ہے جب ہمیں حقوقِ اہلبیت علیہم السلام کی صحیح شناخت ہو، ہم مندرجہ ذیل چند اہم حقوقِ اہل بیت علیہم السلام کی طرف اشارہ کر رہے ہیں تا کہ انھیں جان کر ادا کرنے کی کوشش کریں۔

۱۔ الاخلاق، سید عبداللہ شبر، باب اسرارِ روزہ؛ مصباح الشریعۃ، ۱۳۶۔

۱۔ بارہ اماموں کی ولایت کو قبول کرنا

ولایت سے متعلق جاننے کے لئے بے شمار کتابیں موجود ہیں مگر یہاں پر مختصراً عرض کردوں ولایت یعنی صرف زبانی طور پر محبت کا دعوا کرنا نہیں، بلکہ اہل بیت علیہم السلام کو اپنے دینی اور دنیوی امور میں سرپرست اور ''اولیٰ بالنفس'' مانتے ہوئے چون وچرا کے بغیر اُن کے تابع اور مطیع بن جانا ہے۔ اسلام کی پانچ بنیادی چیزوں میں سب سے اہم ولایت ہے جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ الصَّلَاةِ وَ الزَّكَاةِ وَ الْحَجِّ وَ الصَّوْمِ وَ الْوَلَايَةِ وَ لَمْ تُنَادَ بِشَيْءٍ مَا نُودِيَ بِالْوَلَايَةِ وَ زَادَ فِيهَا عَبَّاسُ بْنُ عَامِرٍ فَأَخَذَ النَّاسُ بِأَرْبَعٍ وَ تَرَكُوا هَذِهِ يَعْنِي الْوَلَايَةَ"[1]

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: نماز، زکوۃ، روزہ، حج اور ولایت لیکن ولایت کی طرح کسی بھی چیز کی جانب بُلایا نہیں گیا ہے مگر لوگوں نے (ابتدا کے) چار کو لے لیا اور ولایت کو چھوڑ دیا''

۲۔ اہلبیتؑ کی عزت وآبرو کی حفاظت اپنے اعمال کے ذریعہ

جب ہمیں اہلبیتؑ سے نسبت ہے اور دنیا، ہمیں اہلبیتؑ کے چاہنے والے کے عنوان سے پہچانتی ہے تو پھر ہماری ذمہ داری ہے کہ اس نسبت کا پاس و لحاظ رکھیں اور اپنے ناشائستہ اعمال اور بدکرداری کے ذریعہ اس بابرکت نسبت کا مذاق نہ اڑائیں، چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1]۔ کافی، ج ۲، ص ۱۸.

"مَعَاشِرَ الشِّيعَةِ كُونُوا لَنَا زَيْناً وَ لَا تَكُونُوا عَلَيْنَا"[۱]

"اے ہمارے شیعو! ہماری زینت کا سبب بنو ذلت وخواری کا نہ بنو"

۳۔ اہل بیت علیہم السلام سے حقیقی محبت اور اُن کے دشمنوں سے حقیقی نفرت و برائت

تولا اور تبرا کے بغیر اہل بیت علیہم السلام کا حق ادا نہیں ہو سکتا ہے، لہٰذا ان دونوں سے اپنے جان و دل کو آراستہ کرنا ضروری ہے لیکن تولا اور تبری کی صحیح شناخت ضروری ہے جس کی تفصیل اس سے متعلق کتابوں میں موجود ہے۔

ان کے علاوہ، مکتب اہلبیت علیہم السلام کی صحیح شناخت و معرفت، مزاراتِ اہلبیت علیہم السلام کی زیارت، اُن کے دستورات پر عمل درآمد، امر اہلبیت علیہم السلام کا احیاء، ان کی خوشی میں خوشی منانا اور ان کے غم میں غمگین و محزون رہنا، یہ سب اہلبیت علیہم السلام کے وہ حقوق ہیں جو آخری سانس تک ہماری گردنوں پر رہیں گے، خدایا ہمیں حقوق محمد و آل محمد علیہم السلام کی شناخت اور ان کی ادائیگی کی توفیق عطا فرما۔

۱۔ امالی صدوق، ص ۴۰۰.

فہرست منابع

۱۔ **قرآن مجید**

۲۔ **نہج البلاغہ**: الامام امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام، سید شریف الرضی، ہجرت قم ۱۴۱۴ق.

۳۔ **اربعین**: روح اللہ خمینی، موسسہ آثار امام خمینیؒ

۴۔ **ارشاد القلوب الی الصواب**: حسن بن محمد دیلمی، ترجمہ: عبدالحسین رضائی، اسلامیہ تہران ۱۳۵۵ھ ش

۵۔ **الاحتجاج علیٰ اہل اللّجاج**: احمد بن علی طبرسیؒ، نشر مرتضیٰ، مشہد ۱۴۰۳ھ ق.

۶۔ **احقاق الحق**: نور اللہ شستری، مکتبہ آیۃ اللہ مرعشی نجفیؒ

۷۔ **الاخلاق**: سید عبداللہ شبر، ترجمہ: محمد رضا جباران، موسسہ انتشارات ہجرت قم ۱۳۸۰ھ ش

۸۔ **اسفار اربعہ**: شیرازی، ملاصدرا، مترجم: محمد خواجوی، انتشارات مولی، ۱۳۸۹ھ ش

۹۔ **اعیان الشیعہ**: محسن امین، بیروت، دار التعارف ۱۴۱۸ھ ق

۱۰۔ **اقرب الموارد**: سعید خوری شرتونی، تہران: دار الاسوہ ۱۴۱۶ھ ق

۱۱۔ **امالی**: محمد بن علی (صدوقؒ)، بیروت: موسسہ اعلمی ۱۴۰۰ھ ق

۱۲۔ **اولین مقتل سالار شہیدان**: (ترجمہ مقتل ابی مخنف) لوح بن یحییٰ، مترجم: محمد علی جزائری، نشر الامام المنتظرعج، قم، ۱۳۸۸ھ ش

۱۳۔ **بحار الانوار**: مجلسی، محمد باقر، دار احیاء التراث العربی، موسسہ التاریخ العربی، بیروت، ۱۴۱۲ھ ق

۱۴۔ **بیست گفتار:** مرتضیٰ مطہریؒ، انتشارات صدرا، تہران۱۳۵۸ھ ش

۱۵۔ **تحف العقول:** حسن بن علی، ابن شعبہ حرانی، دارالکتب الاسلامیہ، تہران۱۳۷٦ھ ش.

۱٦۔ **تحفۃالاحباب فی نوادر آثار الاصحاب:** عباس قمیؒ، دارالکتب الاسلامیہ، تہران، ۱۳٦۹ھ ش

۱۷۔ **تحفۃالواعظین:** محمد حسن شہیدی، مکتبہ مہر، قم، ۱۳۹۴ھ ش

۱۸۔ **تہذیب الاحکام:** محمد بن حسن طوسیؒ، دارالکتب الاسلامیہ تہران۱۴۰۷ق.

۱۹۔ **تصنیف غرر الحکم و درر الکلم:** تمیمی آمدی، عبدالواحد بن محمد، مطبوعہ دفتر تبلیغات قم ایران۱۳٦٦ش.

۲۰۔ **البرہان فی تفسیر القرآن:** بحرانی، سید ہاشم، بنیاد بعثت، تہران ۱۴۱٦ ھ ق

۲۱۔ **تفسیر المیزان:** سید محمد حسن، علامہ طباطبائی، جامعہ مدرسین، قم، ۱۳٦۲ھ ش.

۲۲۔ **تفسیر صافی:** محمد بن مرتضیٰ محسن فیض کاشانی، مکتبۃ الصدر، تہران، ۱۳۷۹ھ ش

۲۳۔ **تفسیر عیاشی:** محمد بن مسعود عیاشی، مطبعہ: علمیہ تہران۱۳۸۰ق.

۲۴۔ **تفسیر قمی:** علی بن ابراہیم قمی، (تحقیق: سید طیب موسوی جزائریؒ)، مکتبہ: دارالکتاب قم۱۳٦۷ھ ش.

۲۵۔ **تفسیر جوامع الجامع:** طبرسی، فضل بن حسن، انتشارات دانشگاہ، تہران، ۱۳۷۷ ھ ش

۲٦۔ **تفسیر روشن:** حسن مصطفوی مرکز نشر کتاب، تہران ۱۳۸۰ھ ش

۲۸۔ **تفسیر نمونہ:** ناصر مکارم شیرازی، دارالکتب الاسلامیہ تہران ۱۳۷۳ھ ش.

۲۹۔ **تفسیر نور الثقلین:** عبد علی بن جمعہ عروسی، موسسہ اسماعیلیان قم۱۴۱۵ھ ق.

۳۰۔ **تفسیر مجمع البیان:** علی بن حسن طبرسی، کتابخانہ مرعشی نجفی قم۱۴۰۳ھ ق.

۳۱۔ **تفسیر ابن عربی:** محمد، ابو عبداللہ محیی الدین، بیروت، داراحیاء التراث العربی ۱۴۲۲ھ ق

۳۲۔ **تفسیر ام الکتاب:** سید حسن میر جہانی، انتشارات صدر، تہران
۳۳۔ **تفسیر فرات کوفی:** ابوالقاسم فرات کوفی، وزارت ارشاد اسلامی تہران ۱۴۱۰ھ ق.
۳۴۔ **التوحید:** ابن بابویہ (صدوقؒ)، محمد بن علی، مصحح: ہاشم حسینی، جامعہ مدرسین، قم، ۱۳۹۸ھ ش.
۳۵۔ **الحیاۃ:** احمد آرام اخوان حکیمی، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران ۱۳۸۰ھ ش
۳۶۔ **ثواب الاعمال:** ابن بابویہ، (شیخ صدوقؒ) محمد بن علی، نسیم کوثر، قم، ۱۳۸۲ق.
۳۷۔ **جامع الاخبار:** تاج الدین شعیری، انتشارات رضی قم ۱۴۰۵ھ ق
۳۸۔ **جامع السعادات:** محمد مہدی نراقی، مکتبہ لبنان، بیروت (بی تا)
۳۹۔ **الحدیث:** محمد تقی فلسفی، نشر فرہنگ اسلامی تہران ۱۳۶۸ھ ش
۴۰۔ **الخصال:** ابن بابویہ (شیخ صدوقؒ)، محمد بن علی، جامعہ مدرسین، قم، ۱۳۶۲ش.
۴۱۔ **دنیائے دختران:** کریمی نیا،
۴۲۔ **سفینۃ البحار:** عباس قمیؒ، مشہد: آستان قدس رضوی، ۱۴۱۶ھ ق ۱۴۱۴ق.
۴۳۔ **سیرۂ پیشوایان:** مہدی پیشوائی موسسہ تحقیقاتی و تعلیماتی امام صادقؑ، قم ۱۳۷۵ھ ش.
۴۴۔ **سیری در رسالہ حقوقی امام سجادؑ:** محمد یثربی کاشانی، قم ناشر انصاریان ۱۳۸۷ھ ش
۴۵۔ **زمزمہ روزہ داران:** بیدارم، روح اللہ، دفتر تبلیغات اسلامی، قم، ۱۳۹۱ھ ش
۴۶۔ **شرح منازل السائرین:** مؤلف: خواجہ عبد اللہ انصاری، شارح: علی شیروانی
۴۷۔ **شرح نہج البلاغہ:** محمد بن ابی الحدید معتزلی، بیروت: دار الجیل، ۱۴۰۷ھ ق
۴۸۔ **الشفا (الہیات):** ابو علی ابن سینا، مکتبہ آیۃ اللہ مرعشی نجفی، قم، ۱۴۰۵ھ ق
۴۹۔ **صبحِ رضوان:** ذبیح اللہ آخوندی، انتشارات ذکریٰ ۱۳۹۰ھ ش

۵۰۔ **صحیفۂ علویہ**: سید ہاشم رسولی محلاتی، انتشارات اسلامیہ تہران، ۱۳۹۶ھ ش

۵۱۔ **عدل الٰہی**: شہید مرتضٰی مطہری، انتشارات صدرا، تہران، ۱۳۶۷ھ ش

۵۲۔ **علل الشرائع**: محمد بن علی ابن بابویہ (صدوقؒ)، نشر داوری، قم ۱۳۸۵۔

۵۳۔ **عدۃ الداعی و نجاح الساعی**: ابن فہد حلی، دار الکتب الاسلامی ۱۴۰۷ھ ق

۵۴۔ **عرفان اسلامی (شرح مصباح الشریعۃ و مفتاح الحقیقۃ)**: حسین انصاریان، تہران، انتشارات پیام آزاد ۱۳۶۸ھ ش

۵۵۔ **حجاب و عفاف در سیما**: فریدہ پیشوائی و مرم رضائی، قم: مرکز پژوہش ہای اسلام، وَ، صداو سیما ۱۳۸۶ھ ش

۵۶۔ **عیون اخبار الرضاؑ**: محمد علی ابن بابویہ (صدوقؒ)، نشر صدوقؒ، تہران ۱۳۷۹ھ ش.

۵۷۔ **غرر الحکم و درر الکلم**: تمیمی آمدی، عبدالواحد بن محمد، دار الکتب الاسلامی قم ۱۴۱۰.

۵۸۔ **الغدیر**: علامہ امینی، عبدالحسین، مطبوعہ: سنابل قم، ۱۳۸۵ھ ش

۵۹۔ **فرہنگ ابجدی (لغات قرآن کریم)**: عبدالمحمد ایرانی، نشر ائمہ، قم ۱۳۸۴ھ ش

۶۰۔ **فلاح السائل**: سید علی بن موسی طاؤس، (بی جا) احمد فرہمند ۱۳۸۲ھ ش

۶۱۔ **فرہنگ صبا**: بہشتی، محمد، انتشارات صبا، تہران، ۱۳۶۵ھ ش

۶۲۔ **قاموس القرآن**: سید علی اکبر قرشی، دار الکتب الاسلامیہ، تہران ۱۳۷۱ھ ش

۶۳۔ **کافی**: کلینی، محمد بن یعقوب، ترجمہ محمد باقر کمرہ ای، تہران، انتشارات اُسوہ، ۱۳۷۰ھ ش

۶۴۔ **کتاب العین**: خلیل بن احمد فراہیدی، مسسہ دار الھجرۃ، قم ۱۴۰۶ھ ق

۶۵۔ **کمال الدین و تمام النعمۃ**: ابن بابویہ (صدوقؒ)، محمد بن علی، مصحح: علی اکبر غفاری، اسلامیہ، تہران، ۱۳۹۵ق

۶۶۔ **کنزالعمال**: ابن حنبل، احمد بن محمد بن تقی، بیروت، دار الفکر، (بی تا)
۶۷۔ **قصّۂ کربلا بضمیمہ قصّۂ انتقام**: علی نظری منفرد، مکتبہ سرور، تہران، ۱۳۸۶ھ ش.
۶۸۔ **گفتار رفیع**: دکتر ناصر محمدی رفیعی، نشر معروف قم، ۱۳۸۸ھ ش
۶۹۔ **لسان العرب**: ابن منظور، محمد بن مکرم، دار الصادر، بیروت، ۱۴۱۴ق
۷۰۔ **ماہِ وصال**: ماشاء اللہ صدیقی، قم، ناشر یاران مہدی عج ۱۳۹۲ھ ش
۷۱۔ **مجموعہ ورّام (تنبیہ الخواطر)**: ورّام بن ابی فارس، قم، مکتبہ (بی تا)
۷۲۔ **مجمع البحرین**: طریحی، فخر الدین، موسسۃ البعثت، قم، ۱۴۱۴ھ ق
۷۳۔ **مفاتیح الجنان**: شیخ عباس قمیؒ، مطبوعہ: وفائی، قم، ۱۳۸۲ھ ش.
۷۴۔ **مفردات الفاظ القرآن الکریم**: راغب اصفہانی، حسین بن احمد، تہران: مرتضوی، ۱۳۶۱ھ ش
۷۵۔ **مناقب، آل ابی طالب**: ابن شہر آشوب مازندرانی، محمد بن علی، انتشاراتِ علامہ، قم، ۱۳۷۹ق
۷۶۔ **منازل السائرین**: انصاری، خواجہ عبداللہ بن محمد، دار العلم قم، ایران ۱۳۷۶ش
۷۷۔ **من لایحضرہ الفقیہ**: ابن بابویہ، محمد بن علی، (شیخ صدوق)، ترجمہ علی اکبر غفاری، قم، جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ ۱۳۶۳ش
۷۸۔ **مجمع البحرین**: طریحی، فخر الدین، کتابفروشی مرتضوی، تہران ۱۳۷۵ش
۷۹۔ **مدینۃ المعاجز الائمۃ الاثنا عشر**: ہاشم بحرانی، (بی جا) ۱۴۲۶ھ ق
۸۰۔ **محاسن**: برقی، احمد بن محمد بن خالد، دار الکتب الاسلامیہ، قم ۱۳۷۱ھ ق
۸۱۔ **میزان الحکمہ**: محمدی ری شہری، محمد، ترجمہ: حمید رضا شیخی، دار الحدیث، قم، ۱۳۸۶ھ ش

۸۲۔ **مصباح المنیر فی غریب شرح الکبیر**: احمد فیومی، بیروت: مکتبہ لبنان۱۹۸۷عیسوی

۸۳۔ **مستدرک الوسائل**: شیخ محدث نوریؒ، حسین بن محمد تقی ، مطبوعہ: موسسہ اسماعیلیان، قم، ۱۳۸۲ھ ش.

۸۴۔ **وافی**: محمد بن مرتضیٰ محسن فیض کاشانی،کتابخانہ امام اِمیر المؤمنین علی علیہ السلام، اصفہان۱۴۰۶ھ ق

۸۵۔ **نہج الفصاحۃ**: (مجموعہ کلمات قصار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوالقاسم پاینده، تہرانم دنیای دانش، ۱۳۸۲ھ ش

۸۶۔ **المنجد**: لویس معطوف، انتشارات اسلامی، تہران ۱۳۸۷ش

۸۷۔ **وسائل الشیعہ**: شیخ حر عاملی، محمد بن حسن، مؤسسۂ آل البیت علیہم السلام لاحیاء التراث، قم، ۱۳۷۴ھ ش